

# پہر چلا مسافر

## بھارت کے چار سفر

حصہ سوم



ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

# پھر چلا مسافر

## بھارت کے چار سفر

ان جگہوں کو دیکھنے کے لیے جن سے میرا ماضی جڑا ہوا ہے!

(حصہ سوم)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ



**AASIM PUBLICATIONS**  
LAHORE - PAKISTAN

# پھر چلا مسافر:

## بھارت کے چار سفر (حصہ سوم)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

mushtaq.mangat@gmail.com

اہتمام اشاعت : وقار ندیم احمد

اشاعت اول : 2022ء

ایڈٹنگ : اولیس ضیاء

ٹائٹل : مسز سندس اولیس

پرنٹرز : تسکین ذوق پرنٹرز، لاہور

**PHIR CHALA MUSAFIR**

Bharat Ke Char Safar (Part-Three)

**Dr. Muhammad Mushtaq Ahmad Mangat**

**Copyright: 2022 - 1st Edition**



Published by:

**Aasim Publications**

296-B, Revenue Employees Cooperative  
Housing Society, Lahore - Pakistan.

**All rights reserved  
by the author**

یہ کتاب ای بک کی شکل میں انٹرنیٹ پر رکھی گئی ہے۔  
آپ اسے ڈاؤنلوڈ کر سکتے ہیں اور کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔  
اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام تر  
آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ میں تعلیم حاصل کرنے  
والے ضرورت مند طالب علموں کی تعلیمی ضروریات پوری  
کرنے کیلئے خرچ کی جاتی ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ویب  
سائٹ پر موجود ہے۔

[https://taawun.org.pk/  
downloads/, and  
www.scribd.com](https://taawun.org.pk/downloads/)

## انتساب

محمد یوسف مانگٹ بن عاصم الہی مانگٹ کے نام

جو ہم سب کی زندگی کا محور ہے

## ترتیب مضامین

- 11 ..... بھارت کا تیسرا سفر
- 13 ..... حرف آغاز
- 17 ..... نیو ممبئی: ایک نہایت ہی ترتیب سے بسا ہوا شہر
- 20 ..... ممبئی سے پونے: ایک یادگار سفر
- 22 ..... پونے ریلوے سٹیشن: ہندوستان کا ایک قدیم ریلوے سٹیشن
- 24 ..... پونے ایک قدیم علاقہ
- 29 ..... مراٹھا سلطنت: اٹھارویں صدی کی ایک طاقت ور ریاست
- 32 ..... راجارام اور مہارانی ترابی
- 34 ..... پیشوا باجی راؤ: جس کے ذکر کے بغیر پونے کی تاریخ نامکمل ہے
- 37 ..... باجی راؤ اول اور نظام
- 38 ..... بنڈیل کھنڈ (BUNDELKHAND) کی فتح
- 38 ..... گجرات: مراٹھوں کا اگلا نشانہ
- 40 ..... جنجیر اور شیدی حکمران
- 40 ..... راجپوتانہ کے راجہ اور باجی راؤ اول کی شرائط
- 41 ..... دہلی اور باجی راؤ اول
- 42 ..... بھوپال کی جنگ اور باجی راؤ اول کی فتح
- 43 ..... پرنگالیوں کی سرکشی اور باجی راؤ اول
- 43 ..... بالاجی باجی بھٹ: ایک نوجون پیشوا
- 44 ..... نظام کے خلاف مہم
- 44 ..... ہندوستان ایک ہندو ریاست کا خواب: جو پورا نہ ہو سکا

- 45 ..... مادھو راؤ بھٹ پیشوا: مراٹھوں کا آخری پیشوا
- 46 ..... مراٹھوں کا دلی پر آخری وار اس مرتبہ مغلیہ سلطنت کے بچاؤ کی خاطر
- 48 ..... مراٹھوں کو زوال صرف چند سالوں میں
- 50 ..... سنہاگاڈ قلعہ
- 53 ..... شنیاڑہ: ایک قدیم قلعہ اور محل
- 55 ..... آغا خان محل: ایک انتہائی خوبصورت عمارت
- 57 ..... لال محل اور شائستہ خان
- 58 ..... لوہاگڑھ قلعہ
- 59 ..... ایک ناقابلِ فراموش کھانا
- 65 ..... ہریانہ: ایک نئی ریاست جو مذہب اور زبان کی بنیاد پر بنائی گئی
- 65 ..... دہلی سے ریواڑی، راستہ گروگرام
- 66 ..... ہریانہ: ایک ترقی یافتہ ریاست
- 72 ..... گروگرام: بھارت کا ساہیو، جس کا پرانا نام گڑگاؤں تھا
- 79 ..... ریواڑی: صدیوں سے آباد ایک شہر
- 80 ..... ریواڑی: شہاب الدین غوری سے انگریزوں تک
- 82 ..... راؤ تلارام سنگھ (1825-1863) جنگ آزادی کا ایک نامور ہیرو
- 90 ..... کاریہ: جہاں سولہویں صدی میں شاہ صاحب کے بزرگ آکر آباد ہوئے
- 101 ..... رنبیر سنگھ مانگٹ اور ان کی شادی کی تیسویں سالگرہ
- 106 ..... پراگتی میدان: بھارت کی ایک اہم نمائش گاہ
- 108 ..... بیراجی کی بیٹی کی شادی
- 112 ..... دہلی میں موجود ایک اور میانوالی
- 121 ..... دہلی سے چند گڑھ: ایک یادگار سفر

138	چودھری چرن سنگھ
146	میرٹھ اور روہتک: تاریخی قصبے
147	میرٹھ: جہاں سے جنگِ آزادی ہند کا آغاز ہوا
151	روہتک: ایک قدیم مسجد اور ہندو شاہی دور کی نکسالی
155	ہندو شاہی یا کابل شاہی کا دورِ حکومت
159	حصار: ایک قدیم شہر
168	ہریانہ: ایک ہندو ریاست جہاں کبھی مسلمان بھی آباد تھے
173	مظفرنگر: جسے بھارت کا کرائم کیسیٹل بھی کہا جاتا تھا
175	پانی پت: جہاں ہندوستان کے تاج و تخت کے وارثان کا فیصلہ ہوتا تھا
178	مزار شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی
180	کابلی باغ مسجد: جسے بابر نے اپنی فتح کی یاد میں بنوایا
181	ابراہیم لودھی کا مقبرہ
184	سفیدون: جہاں پانچ صدیاں قبل سلاطین دلی نے نہر بنائی تھی
191	کرناٹ: نادر شاہ اور مغلوں کی ایک اہم جنگ کا مقام
197	انگریز جند کور مہارانی اور مہاراجہ رنبیر سنگھ
200	بابر کی 1528ء میں تعمیر کردہ بابری مسجد کرناٹ
200	گوردوارہ منجی صاحب: جہاں گورونانک جی نے ایک رات گزاری
201	سید محمد الیاس میراں: ایک عظیم صوفی بزرگ
203	کلپنا چاولہ: بھارت کی پہلی خلا باز خاتون
203	دیوبند: ایک علمی دسگاہ اور تحریکِ آزادی ہند کا مرکز
205	تحریکِ آزادی ہند اور دیوبند
206	روڑکی: جہاں پہلاریل کا انجن چلایا گیا

- 211 ..... تھانہ بھون: مولانا شرف علی تھانوی کا شہر
- 213 ..... گنگوہ: مولانا رشید احمد گنگوہی کا شہر
- تقسیم ہند، لاکھوں لوگوں کا قتل، ہجرت اور نقل مکانی ذمہ دار کون: بھارت ایک مسلمان
- 214 ..... کی نگاہ میں
- کیقتل: جہاں ہندوستان کی پہلی مسلمان حکمران خاتون رضیہ سلطانہ کا مقبرہ بھی ہے
- 228
- 231 ..... شاہ کمال قادری اور شاہ سکندر قادری کیقتل کا مزار
- کیقتل میں بارہ سو سال پرانا مندر اور جاٹ حکمرانوں کا بنایا ہوا قلعہ
- 232
- 233 ..... سہارن پور: مدرسہ مظاہر العلوم عظیم دینی درس گاہ اور تحریک آزادی ہند کے مجاہد
- کورو شیترا: جہاں مہا بھارت کی جنگ ہوئی اور یہاں سے ہی ہندو مت نے جنم لیا...
- 238
- 242 ..... تھانیسیر: ایک تاریخی قصبہ
- مولانا محمد جعفر تھانیسیری: ایک عظیم عالم، جنگ آزادی کا مجاہد، کالے پانی کا قیدی ..
- 244
- 245 ..... جزائر انڈمان عرف کالا پانی
- شیخ صوفی عبدالرزاق عرف شیخ چلی
- 247
- 249 ..... شاہ آباد: ایک شہر جس میں ایک مسجد کو گردوارے میں تبدیل کیا گیا
- 254 ..... انبالہ: ایک راجپوت کا بسایا ہوا شہر اور انگریزوں کی ایک بڑی چھاؤنی
- 257 ..... انبالہ چھاؤنی اور افریقہ کے قیدی
- چندی گڑھ: بھارت کا ایک نیا اور امیر شہر
- 260
- 265 ..... ذاکر حسین روزگار ڈن: گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا اور شاندار باغ
- 267 ..... ذاکر حسین خان: بھارت کے تیسرے اور پہلے مسلمان صدر
- مدن لال: ایک پڑھا لکھا ہندو جو مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا
- 271
- 287 ..... راک ڈن چندی گڑھ: ایک ایسا باغ جس کی تاریخ بہت ہی انوکھی ہے
- تندوری مچھلی اور بے فکرے پنجابی سکھ نوجوان
- 295



299	پنجاب کی تاریخ: ایک اجمالی جائزہ
301	پنجاب قبل مسیح کے دور میں
304	موریہ سلطنت
304	پنجاب: پہلی صدی عیسوی سے دسویں صدی عیسوی تک
308	تیسرا دور: غزنوی سے بہادر شاہ ظفر تک
312	پنجاب کے چوتھے حکمران: انگریز
321	پنجاب کی پہلی صوبائی کونسل اور اسمبلی
322	تقسیم پنجاب: ایک سانحہ
328	موہالی، جس کا سرکاری نام صاحبزادہ اجیت سنگھ نگر ہے
334	موہالی سے اپنے دیس تک: ایک سفر جس کا تصور بھی حسین تھا
335	موریندا: جو مانا گوجری کی وجہ سے ایک عالمگیر شہرت رکھتا ہے
336	بسی پٹھانا اور تملانا میرے بزرگ جس کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے
338	شیخ احمد سرہندی عرف مجدد الف ثانی
344	گردوارہ فتح گڑھ صاحب: ایک تاریخی واقعہ کی یادگار عمارت
346	استاد شاگرد کا مقبرہ
347	عام خاص باغ
347	میر میراں کا مقبرہ
348	حویلی دیوان ٹوڈر مل، المعروف جہاز حویلی
349	برگد (بوہڑ) کے قدیم درخت
350	سرہند: ایک تابناک ماضی لیے ہوئے
352	احمد شاہ ابدالی اور سکھ
354	منصوری ٹبہ: میرے والد کی جائے پیدائش

- 363 ..... سدھنا قصائی مسجد کی تعمیر نو
- 365 ..... علی بخش مانگٹ : میرے دادا کے ولاد ایک صاحب فراست اور باکردار شخص
- 368 ..... سدھنا قصائی کی مسجد
- 373 ..... والو ماجرہ: میرے والد کا ننھیال اور سسرال
- 375 ..... میری ماں کا گاؤں: میری زندگی کا یادگار سفر
- 384 ..... ننھال ایک سکھ سردار کی پناہ میں

## بھارت کا تیسرا سفر



## حرفِ آغاز

میں نے بھارت کا پہلا دورہ جولائی 1996ء میں کیا، اس دورے میں میں اکیلا ہی تھا۔ دوسرا دورہ فروری 1999ء میں کیا، اس وقت سید وقاص انجم جعفری صاحب اور شیخ عمر فاروق صاحب میرے ہمراہی تھے۔ میں نے تیسرا دورہ اگست 2000ء میں کیا، جس میں سید رفیق انجم جعفری صاحب (وقاص جعفری صاحب کے والد صاحب) اور ساجد منظور میرے ساتھ تھے۔ چوتھی مرتبہ جون 2005ء میں، میں اور ڈاکٹر عرفان شیخ صاحب یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کے طلبہ کا ایک وفد لے کر بھارت گئے۔ پہلے اور دوسرے دورے کی روداد میں بھارت کے چار سفر کے حصہ اول اور حصہ دوم کے نام سے لکھ چکا ہوں۔ اس کتاب میں تیسرے دورے کی روداد بیان کی جا رہی ہے۔

تیسرے دورے کا مقصد دہلی میں منعقد ہونے والی ایک صنعتی نمائش میں شرکت تھی۔ ہم لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچے، تین دن دہلی میں گزارنے کے بعد تین دن کے لیے ممبئی بھی گئے۔ اس کے علاوہ ایک دن کے لیے ممبئی سے پونے بھی جانا ہوا۔ میں اور جعفری صاحب دہلی کے قریب ریواڑی بھی گئے اور اس دوران ہمیں سید رفیق نجم صاحب کے گاؤں کا موقع بھی ملا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے چند گز کے ساتھ ساتھ اپنے آبائی شہر سرہند کو دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اس کے علاوہ میں نے پانی پت اور انبالہ کو بھی قریب سے دیکھا۔ اسی دورے میں میانوالی سے جانے والے ایک ہندو، جنہوں نے دہلی میں میانوالی کے نام سے ایک تنظیم بھی بنائی ہوئی ہے، سے ملاقات بھی ہوئی۔ وہاں ہمیں اپنے ایک دیرینہ دوست، رنیر سنگھ مانگٹ صاحب کی شادی کی تیسویں سالگرہ میں شریک ہونے کا موقع بھی ملا۔ اس سفر کی ایک مختصر روداد پیش خدمت ہے جو یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہو گی۔

ہمارا پہلا پڑاؤ دہلی تھا جہاں ہم نے دو دن گزارے۔ وہ دن دہلی کی سیر کرتے ہوئے گزرے اس وقت مجھے اُن سب تاریخی مقامات پر جانے کا موقع ملا جن کا تفصیلی ذکر میں حصہ اول میں کر چکا ہوں۔ تیسرے دن ہماری ممبئی کے لیے روانگی تھی۔ حسب معمول ہم ٹرین کے ذریعے ممبئی پہنچ گئے۔ اس راستے میں آنے والے تمام اہم مقامات کا ذکر آپ حصہ دوم میں پڑھ چکے ہوں گے۔ ممبئی میں کسٹور گپتا صاحب سے دوبارہ ملاقات بھی ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے کچھ نئی جگہوں پر جانے کا موقع بھی ملا۔ جن میں سب سے اہم نیو ممبئی اور پونے ہے۔ نیو ممبئی میں واقع ایک کیمیکل کمپنی سے مجھے کچھ کاروباری معاملات طے کرنا تھے۔ ممبئی کے بارے میں ایک مختصر تحریر آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں اس لیے ان کا دوبارہ ذکر مناسب نہیں البتہ میں یہ چاہوں گا کہ اس وقت آپ کے سامنے اُن مقامات کا ذکر کروں جہاں اس دورے میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔

یہ کتاب اس نقطہ نظر سے لکھی گئی کہ جہاں بھی سفر کیا گیا وہاں کی تاریخی، معاشرتی، معاشی، مذہبی، سیاسی، تمدنی اور جدید معلومات کے علاوہ دیگر اہم واقعات کا بھی ایک ہی جگہ احاطہ کیا جاسکے۔

اس کام کے لیے مجھے تقریباً تین سال سے زائد کا عرصہ لگا۔ میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں اپنی ذاتی رائے سے زیادہ حقیقی کرداروں اور مستند کتب کا حوالہ آپ کے سامنے پیش کروں تاکہ جانبداری کا عنصر حذف ہو سکے اور میں اس میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں، یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

اس کتاب کو مزید بہتر کرنے کے لئے میں آپ کی آراء کا منتظر ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری اس کوشش کو صدقہ جاریہ بنائے۔

آمین ثم آمین

بصد ادب، احترام اور محبت کے ساتھ

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ



From Right to Left Dr. Muhammad Mushtaq Mangat,  
Sajid ManzoorAnjum, Sayed Rafique Anjum Jafafry sb

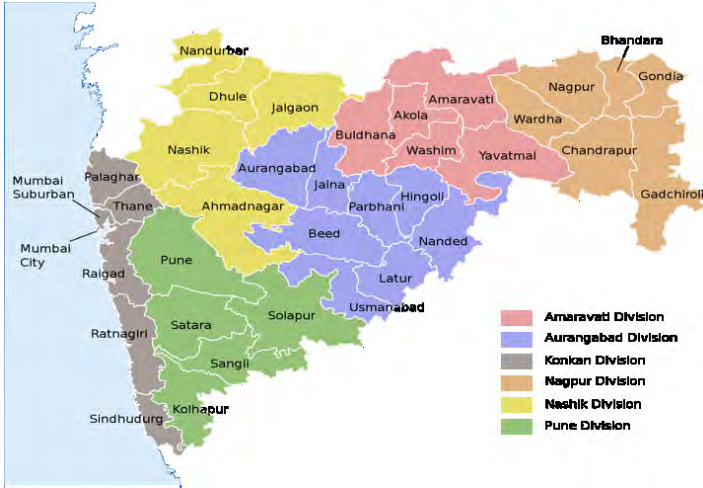




## نیو ممبئی: ایک نہایت ہی ترتیب سے بسا ہوا شہر

دہلی میں تین دن گزارنے کے بعد ہم ممبئی بذریعہ ٹرین پہنچ گئے۔ دہلی میں جن تاریخ مقامات کی سیر کی ان کا ذکر میں حصہ اول میں کر چکا ہوں۔ اس لیے میں اس کتاب کا آغاز ہی ممبئی میں جو دیکھا، سنا اور سمجھا سے کر رہا ہوں۔

ممبئی ایک نہایت ہی مصروف شہر ہے۔ (میں حصہ دوم میں بتا چکا ہوں کہ اس شہر میں سفر کرنا کتنا مشکل ہے)۔ اس مرتبہ بھی ہمارا قیام مصطفیٰ ہوٹل میں ہی تھا۔ ساجد اور شاہ صاحب نے شہر کی سیر کا پروگرام بنایا بلکہ مجھے نئی ممبئی جانا تھا۔ ہوٹل والوں سے راہ نمائی لی، اس طرح میں نئی ممبئی کے علاقے میں پہنچ گیا۔ نئی ممبئی کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک بڑے کھلے علاقے میں آ گیا ہوں۔ میں جس کمپنی کے دفتر گیا، وہ بھی کافی وسیع تھا۔ ایک گنجان آباد علاقے کے بالکل ساتھ ایک وسیع اور کھلا شہر کیسے وجود میں آیا؟ یہ سب بے حد دلچسپ تھا۔ جس کی ایک مختصر کہانی پیش خدمت ہے۔



Maharashtra Geography Photo Credit: Wikipedia

نئی ممبئی اس وقت بھارت کا وہ سب سے بڑا شہر ہے جو باقاعدہ ایک خاص منصوبے کے تحت بسایا گیا ہے۔ اس شہر کے دو حصے ہیں، ایک شمالی نئی ممبئی جبکہ دوسرا جنوبی نئی ممبئی کہلاتا ہے۔ اس نئے شہر کی آبادی دس لاکھ سے زائد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ستر کی دہائی میں ایک سول انجینئر، اڈی کانگانے اپنے دوستوں کے ساتھ ملکر اس شہر کا خواب دیکھا تھا۔ ان کے خیال میں ممبئی کی بڑھتی ہوئی آبادی کئی طرح کے مسائل کو جنم دے رہی تھی اور ان کا ایک ہی حل تھا کہ بہترین منصوبہ بندی کے ساتھ ایک نیا شہر بسایا جائے۔ طویل غور و خوض کے بعد مہاراشٹر حکومت نے اس علاقے میں ایک نیا شہر بنانے کا فیصلہ کیا۔ بھارت میں ہر سال باقاعدگی سے صفائی، ستھرائی اور حفظانِ صحت کو بنیاد بنا کر شہروں کے درمیان مقابلہ کروایا جاتا ہے۔ بھارت بھر میں مختلف شہروں میں کیے گئے سروے میں اس شہر کا بار ہوا نمبر ہے، جو ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔

اس شہر کی آبادکاری میں ہم سب کے لیے سیکھنے کو بہت کچھ ہے اور یہ تمام تر تفصیلات اسی نقطہ نظر سے دی جا رہی ہیں۔

نئی ممبئی کی منصوبہ بندی کا آغاز 1971ء میں ہوا اور اس کام میں کئی معروف لوگوں نے بھی حصہ لیا۔ یہ کتنا بڑا علاقہ ہے، اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اس کا ساحل 720 کلومیٹر طویل ہے۔ اس کام کے لیے پچاس ہزار ایکڑ اراضی حاصل کی گئی اور اس مقصد کے لیے تقریباً نوے دیہات کو ختم کیا گیا۔



A View of New Mumbai Photo Credit: Lakhani Builders

ممبئی، بھارت کا تفریح، فیشن اور تجارت کا مرکز ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس شہر کا جی ڈی پی تقریباً 160 بلین ڈالر ہے۔ اس شہر میں تیس سے زائد ارب پتی (ڈالرز میں) لوگ رہتے ہیں۔ کئی لحاظ سے یہ بھارت کا امیر ترین شہر بھی ہے۔ بھارت کی معیشت میں اس کا حصہ چھ فیصد سے زائد ہے۔ اس شہر کی ترقی میں نئی ممبئی نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

ممبئی کی تاریخ کے ساتھ ٹاٹا گروپ کی کہانی بھی جڑی ہوئی ہے۔ ٹاٹا گروپ کی بنیاد 29 سال کی عمر میں جمشید جی ٹاٹا، جو اپنے والد کی کمپنی میں ملازمت کرتے تھے نے رکھی تھی۔ انھوں نے 1870ء میں اکیس ہزار روپوں سے ایک تجارتی کمپنی کی بنیاد رکھی۔ اب اس گروپ کی دولت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اس گروپ میں آٹھ لاکھ لوگ کام کرتے ہیں اور ان کا سالانہ آمدن 110 بلین ڈالر ہے۔ (پاکستان کی کل ایکسپورٹ 25 بلین ڈالر ہے)۔ ان کے کاموں کی تفصیل بیان کرنے کے لیے کئی صفحات درکار ہیں۔ اس گروپ نے بھی ممبئی کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ جس روز میں نئی ممبئی میں تھا وہ جمعہ کا دن تھا۔ نیا صنعتی علاقہ ہونے کی وجہ سے میں مسجد جانے سے

محروم رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک صنعتی شہر بسانے کے لیے نئی ممبئی کا ماڈل مناسب راہ نمائی فراہم کر سکتا ہے۔



India in 1858 Photo Credit: <https://www.pinterest.com>

## ممبئی سے پونے: ایک یادگار سفر

میں پونے میں بوانلر بنانے والی ایک کمپنی سے رابطے میں تھا اور انھی کی دعوت پر پونے جا رہا تھا۔ میں اور شاہ صاحب صبح آٹھ بجے کے قریب ایک ٹرین پکڑ کر تقریباً تین گھنٹے میں پونے پہنچ گئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس دفعہ ہم تینوں کو نان رپورٹنگ ویزہ ملا تھا جس کے لیے کسی بھی پولیس سٹیشن جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ ساجد منظور صاحب اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہ جاسکے اور انھوں نے ہوٹل میں ہی قیام کیا۔



Mumbai Pune Highway Photo Credit:DNA India

ممبئی سے پونے ڈیڑھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سفر بہت یادگار تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ اس سفر کے دوران بہت ہی مختلف محل وقوع دیکھنے کو ملے تھے۔ شمالی بھارت کی نسبت جنوبی بھارت اور خاص طور پر اس کے ساحلی علاقے بہت زرخیز ہیں۔ میں آپ کے سامنے اس راستے میں آنے والے چند اہم مقامات کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔ یاد رہے پونے وہی جگہ ہے جہاں سے مراٹھوں نے اپنی ریاست کا آغاز کیا تھا۔ میں یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں مراٹھا کا لفظ، جسے انگلش اور ہندی میں مراٹھا ہی لکھا جاتا ہے۔ اردو کی کتابوں میں اسے مرہٹہ لکھا گیا ہے جس کی وجہ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ جبکہ اس کا صحیح تلفظ مراٹھا ہے۔ اس لیے میں نے مراٹھے لکھنے کو ہی ترجیح دی ہے۔ میں نے حصہ دوم میں لکھا تھا کہ میں اگلے سفر میں پونے سے متعلق کچھ باتیں بتاؤں گا، وعدہ کے مطابق اس تاریخی علاقے کے بارے میں جو کچھ دیکھا، سنا، سمجھا سب پیش خدمت ہے۔

ممبئی سے پونے تک کے راستے میں کوئی خاص بڑا شہر نظر نہیں آیا۔ پونے سے میری دلچسپی اس کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے تھی۔ میں وہ علاقہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں کے

لوگوں نے پہلی مرتبہ جنوب سے جا کر شمالی ہندوستان پر حملہ کیا اور پشاور تک پہنچے۔ اس علاقے میں کئی تاریخی مقامات موجود ہیں جن میں سے میں کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس شہر میں ہمارا قیام بہت ہی مختصر مدت کے لیے تھا۔ میں نے پونے سے متعلق ایک کتاب حاصل کی جس سے مجھے اس علاقے کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ اس کتاب سے مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کئی تاریخی مقامات ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر آپ کو اگلے صفحات میں ملے۔

### پونے ریلوے سٹیشن: ہندوستان کا ایک قدیم ریلوے سٹیشن

تقریباً گیارہ بجے کے قریب ہم پونے پہنچ گئے۔ جس کمپنی سے ہمارا رابطہ تھا، ان کا ایک نمائندہ ہمیں لینے کے لیے ریلوے سٹیشن پر موجود تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان کے ہاتھ میں کسی بھی طرح کا کوئی کارڈ نہیں تھا جس پر مہمان کا نام لکھا ہوتا ہے۔ میں نے بعد میں اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ یہاں پر شاید ہی کبھی کوئی پاکستانی آیا ہو۔ آپ کے پاسپورٹ پر لگی تصاویر سے ہی میں نے کچھ اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ کس شکل و صورت کے لوگ ہیں، اس لیے مجھے پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ شمال کے لوگوں کی شکل و صورت ہمارے ہاں کے لوگوں سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے آپ کو پہچاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ ہم ان کے ساتھ ان کے دفتر میں چلے گئے۔

اس شہر کا نام پونے ہے یا پونا؟ ہمیں جو تاریخ پڑھائی گئی، اس میں اس شہر کا نام پونا بتایا گیا تھا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ اس کا نام پونے ہے۔ میں اسے پونے ہی لکھ رہا ہوں۔ انگریزی میں اس کے آخر میں ”اے“ کی بجائے ”ای“ لکھا جاتا ہے، جس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ یہ پونا نہیں بلکہ پونے ہے۔ یہ مہاراشٹر کا دوسرا بڑا شہر ہے، آبادی کے لحاظ سے یہ بھارت کا آٹھواں بڑا شہر بھی مانا جاتا ہے۔

ہندوستان کی پہلی ٹرین 16 اپریل 1853ء کو ممبئی میں چلائی گئی اور بعد میں اسے پونے تک مکمل کیا گیا۔ پونے کاریلوے سٹیشن 1858ء میں بنایا گیا تھا۔ بعد ازاں سٹیشن میں کافی توسیع بھی کی گئی۔ ایک طرح سے یہ ڈیڑھ سو سال پرانا ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ رقبے کے اعتبار سے یہ ایک بڑا سٹیشن ہے لیکن یہاں آمد و رفت قدر کم ہے۔ میرا تاثر یہ بھی ہے کہ پونے کا علاقہ آبادی کے لحاظ سے بہت زیادہ گنجان نہیں ہے، پھر بھی یہاں ہر روز ڈیڑھ لاکھ کے قریب مسافر ریلوے کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یاد رہے پونے سطح سمندر سے دو ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ اس لیے یہاں گرمی بھی کم ہوتی ہے۔



Pune Culture 200 KM pilgrimage. Photo Credit:  
<https://sandeepachetan.com>

## پونے ایک قدیم علاقہ

پونے کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ اس علاقے سے ساتویں اور آٹھویں صدی کی لکھی ہوئی تحریریں بھی ملی ہیں۔ بعد ازاں نویں صدی میں یہ علاقے دیوگیری کی یادو سلطنت کا حصہ بن گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دو سو سال قبل مسیح بھی یہاں آبادی موجود تھی۔ خلجی خاندان کے حکمران وہ پہلے مسلمان حکمران تھے جنہوں نے 1317ء میں یادو ریاست کا خاتمہ کیا اور تقریباً پونے تین سو سال اس علاقے پر حکمرانی کی۔ خلجی خاندان کے بعد تغلق بھی اس علاقے پر قابض رہے۔ بعد ازاں یہ علاقے بہمنی حکمرانوں کے قبضے میں چلے گئے۔ اس وقت اس شہر کو ”قصبہ پونے“ کہا جاتا تھا۔ اس دور میں شہر کے ارد گرد ایک دفاعی دیوار بھی بنائی گئی جو ایک عرب جرنیل نے بنوائی تھی۔ سلاطین دہلی کا ایک ماتحت اور اس علاقے کا گورنر بھی تھا۔ یہ علاقے مغلیہ سلطنت کا حصہ بھی رہے ہیں۔ مغل حکمرانوں کی کمزوری کی وجہ سے نظام نے اس علاقے کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ مقامی مراٹھوں نے سترہویں صدی کے آغاز میں ہی اس علاقے کا کھٹرول حاصل کر لیا اور یوں مراٹھا ریاست کا آغاز ہوا۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے مراٹھوں کو کئی مسلمان حکمرانوں سے جنگیں لڑنا پڑیں، آخر کار فتح مراٹھوں کی ہوئی۔





Pune Café Paashh Photo Credit  
<https://www.thrillophilia.com>

سولہویں صدی کے آخر میں شیواجی کے دادا، مولوجی بھوسلے کو احمد نگر سلطنت کے حکمران بہادر نظام شاہ دوم نے راجا کا خطاب دیا۔ یہ بات اس بات کی دلالت ہے کہ اس علاقے کے اصل حکمران مسلمان ہی تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ بیجاپور کے ایک عادل شاہی جرنیل، مرگ جگدیو پنڈت نے پونے پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ حملہ آور بھی ایک ہندو تھا اور جن پر حملہ کیا گیا وہ بھی ہندو ہی تھے۔ یاد رہے شیواجی اور پیشوا دوالگ الگ نام ہیں۔ میں ان دونوں کا مختصر تعارف آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا کیونکہ ان دونوں کے ذکر کے بغیر اس علاقے کی تاریخ ادھوری ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ بھارت میں شہروں کے درمیان میں مختلف شہری سہولتوں کے لحاظ سے مختلف شہروں کے درمیان مقابلے ہوتے رہتے ہیں، اس شہر نے وہ مقابلہ کئی مرتبہ جیتا ہے۔ اس وجہ سے اس شہر کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اس شہر کے دائیں کنارے پر ایک دریا بہتا ہے۔ تاریخ سے چلتا ہے کہ اس شہر کا مراٹھا حکمرانوں اور اس کے بعد تحریک آزادی ہند میں بھی ایک اہم کردار رہا ہے۔



World Trade Center Pune Photo Credit:  
<https://in.worldorgs.com>

پونے کو بھارت کا آئی ٹی حب بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے بھارت کی آٹو موبائل اور مینوفیکچرنگ کا گڑھ بھی مانا جاتا ہے۔ یہاں موجود تعلیمی اداروں کی تعداد کی وجہ سے اسے مشرق کا آکسفورڈ بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں پہلا لڑکیوں کا سکول، جو مقامی لوگوں نے شروع کیا تھا، کا آغاز بھی پونے میں ساویتر بائی پھول نے اپنی ساتھی فاطمہ شیخ کے ساتھ مل کر کیا تھا۔



*International Studemyts innm Pune*

Photo Credit: <https://symbiosis.ac.in>

ساویتربائی پھول کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ان کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ انھیں ہندوستانی سماجی مصلح، تعلیمی ماہر اور شاعر کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ انھیں ہندوستان کی پہلی خاتون ٹیچر بھی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے 1848ء میں اپنے شوہر، جیوتیر و پھول کے ساتھ مل کر پونے میں مقامی لڑکیوں کے پہلے سکول کی بنیاد رکھی۔ اس کے نام کی ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر تعلیمی میدان میں بھی اپنی ایک خاص تاریخ رکھتا ہے۔ اس وقت پورے بھارت میں پڑھنے والے غیر ملکی لوگوں میں سے نصف صرف پونے میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یوں یہ ایک بین الاقوامی شہرت کا حامل شہر مانا جاتا ہے۔



Savitribai Phule Founder of Girls School Indian Stamp

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل اس قبضے کو پنپا۔ وشیہا کہا جاتا تھا، جس کا مطلب ”مقدس خبر“ تھا۔ کسی زمانے میں اسے پنواڑی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں صدیوں تک مختلف ہندو حکمرانوں نے حکومت کی۔ پھر ایک وقت آیا جب اسے مغل حکمرانوں نے فتح کر لیا۔ حسب معمول انھوں نے اس علاقے کا نام بھی بدل دیا۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب نے 1701ء سے 1705ء کے

درمیان اپنے ایک پوتے یا نواسے، محی الملان کی یاد میں اس شہر کا نام آباد رکھ دیا۔ جیسے ہی اس کا انتقال ہوا تو لوگوں نے پھر اس شہر کا پرانا نام بحال کر دیا۔



Ivory palanquin of emperor Aurangzeb's daughter Princess Zebunissa.(Hazarduari Palace museum)  
Source: Sahapedia Via Twitter

مغلوں نے چند ہزار فوج اور کئی مقامی راجاؤں کو اپنے ساتھ ملا کر دیر تک اس علاقے پر حکمرانی کی بعد ازاں مراٹھوں نے ان پر قابو پا لیا اور پھر ایک دن وہ بھی انگریزوں کے ہاتھوں غلام بن گئے!



Savitribai Pune University

Photo Credit: The Times of India

## مراٹھا سلطنت: اٹھارویں صدی کی ایک طاقت ور ریاست

مراٹھا سلطنت کو مراٹھا یونین بھی کہا جاسکتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مراٹھوں کے ساتھ کئی دیگر ریاستیں بھی تھیں جو ان کی اتحادی تو ضرور تھیں لیکن ان کے ماتحت نہیں تھیں۔ بہر حال یہ ایک ایسی طاقت تھی جس نے اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کی۔ اس کا آغاز 1674ء میں شیواجی کی تاجپوشی کے ساتھ ہوا اور خاتمہ 1818ء میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں ہوا۔

اپنے عروج کے زمانے میں مراٹھوں کی حکومت ہندوستان کے پچیس لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی تھی، موجودہ پاکستان سے تین گنا رقبہ پر۔ اسے مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ بھی سمجھا جاتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابدالی کے ہاتھوں مراٹھوں کی شکست ہی انگریزوں کے ہندوستان پر مکمل قبضے کی وجہ بنی۔ مراٹھوں کی شکست کے بعد کوئی بھی ایسا نہ تھا جو انگریزوں کا مقابلہ کر سکتا۔ مغلیہ سلطنت کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو مراٹھوں نے پورا کیا لیکن ان کا دور صرف 144 سال رہا، جس میں ابتدائی سال بھی شامل ہیں۔ اتنی مختصر مدت میں چھوٹے سے علاقے کی حکمرانی سے شروع ہونے والی ایک ریاست، وسیع و عریض علاقے تک پھیل گئی اور انگریزوں، جو کبھی ان کے اتحادی تھے کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ اس کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے جس کا مختصر احوال پیش خدمت ہے۔



Chhatrapati Shivaji Photo Credit:

British Museum

لفظ مراٹھا جنگجوؤں اور کسانوں کی ایک خاص ذات کے لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو زیادہ تر مہاراشٹر میں آباد ہیں، جن کے ایک سردار نے مراٹھا سلطنت کا آغاز کیا۔ ان کی زبان مراٹھی کہلاتی ہے۔ سلطنت کے سربراہ کو چھتری کہا جاتا ہے اور پیشوا، فارسی کا ایک لفظ سپہ سالار یا وزیر اعظم کے لیے بولا جاتا تھا۔ مراٹھا سلطنت کی طاقت کا مرکز پیشوا ہی ہوتا تھا۔ راؤ کا لفظ ہمارے ہاں عام طور پر راجپوتوں کے بولا جاتا ہے۔ اس وجہ سے میرا بھی یہی خیال تھا کہ مراٹھے بھی راجپوت ہی ہوتے ہیں۔ برادر مراد محمد ظفر اور طاہر مشتاق صاحب سے بات کرنے کے بعد پتہ چلا کہ ایسا نہیں ہے۔ مراٹھے ایک الگ قوم ہیں۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید راؤ کا لفظ بھی ایک لقب کے طور پر بولا جاتا ہے جیسا کہ رانا، مرزا، ملک، راجہ وغیرہ۔

شیواجی کا تعلق مراٹھا قبیلہ سے تھا۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ ہندوستان پر ہندوستانی لوگوں کی ہی حکومت ہونی چاہیے۔ ان کے دور میں مہاراشٹر کے بیشتر حصوں پر مسلمان حکمرانوں کی حکومت تھی، جنہیں سلاطین دلی اور مغلیہ سلطنت کی حمایت حاصل تھی۔ انھوں نے 1645ء میں اپنی ایک مختصر فوج کے ساتھ بیجاپور کی سلطنت کے خلاف جنگ شروع کی اور ہندوی سوراجیا (ہندو لوگوں کی حکمرانی) کے خیال کو عملی جامی پہناتے ہوئے ایک آزاد مراٹھا سلطنت کی بنیاد رکھی اور 1674ء میں وہ اس نئی سلطنت کا چھترپتی، خود مختار بنا۔ وفات کے وقت وہ تین سو قلعوں کا مالک تھا اور اس کی فوج میں چالیس ہزار گھڑ سواروں کا دستہ شامل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پچاس ہزار پیدل فوج اور اپنا ایک بحری بیڑا بھی موجود تھا۔ جب اس کا پوتا حکمران بنا تو مراٹھا ریاست بنگال اور پنجاب تک پھیل چکی تھی۔

شیواجی مہاراج کو مہاراشٹر کا سب سے بڑا جنگجو بادشاہ مانا جاتا ہے۔ ان کی عمدہ فوجی اور گوریلا جنگی حکمت عملی کی وجہ سے انھیں مہاراشٹر کے فخر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جنگجو ہونے کے ساتھ معاشرتی اصلاحات کی وجہ سے بھی وہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بھارت خاص طور پر مہاراشٹر میں بے شمار تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ دیگر عمارتیں بھی ان کے نام سے منسوب ہیں۔ ممبئی کے سب سے بڑا ریلوے سٹیشن کا نام بھی انھی کے نام پر ہے۔ کئی مقامات پر ان کے مجسمے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے مہاراشٹر کے ساحل کی حفاظت کے لیے ہندوستان کا پہلا بحری بیڑا بھی تیار کیا۔ فوجی نظم و ضبط، خواتین کے لیے اعلیٰ تعلیم، ذات پات کی نفی اور اس طرح کے کئی اقدامات کی وجہ سے انھیں اس علاقے میں ایک بھگوان کی حیثیت حاصل ہے۔ انھیں شیواجی بجائے مہاراج شیواجی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

شمبھاجی اور راجارام، شیواجی کے دو بیٹے تھے، وہ سوتیلے بھائی تھے۔ شیواجی کی وفات کے بعد شنبھاجی تخت پر بیٹھا۔ اس نے بھی والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی سلطنت میں اضافہ کرنا شروع کیا اور پر تگالیوں اور میسور کے چٹ دیوار ایا کو بھی شکست دی۔ 1681ء میں مغل بادشاہ اورنگ زیب نے جنوبی ہندوستان پر حملے شروع کر دیے۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب اور شنبھاجی کی قیادت میں مراٹھوں اور مغلوں کی آپس میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ ان جنگوں میں مراٹھوں نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا اور کبھی بھی کوئی لڑائی یا قلعہ نہیں ہارے۔ ایک مرتبہ جب شنبھاجی اپنے چند ساتھیوں سمیت کہیں موجود تھا تو اورنگزیب کے کمانڈر، مقارب خان نے اس پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ اسے بہادر گڑھ لے جایا گیا اور اورنگزیب کے حکم پر 21 مارچ 1689ء کو پھانسی دی گئی۔

## راجارام اور مہارانی ترابی

شمبھاجی کی موت کے بعد، اس کے سوتیلے بھائی راجارام کو پیشوا بنایا گیا۔ اس دوران رائے گڑھ مغل محاصرے میں تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی جگہوں پر مراٹھوں اور مغلوں کے درمیان جنگ جاری تھی۔ کہتے ہیں کہ 1697ء میں راجارام نے اورنگزیب کو جنگ بندی کی پیش کش کی جسے اورنگزیب نے مسترد کر دیا۔ اس دوران راجارام کی وفات ہو گئی ہے۔ اس کا بیٹا راما راجا (شیواجی دوئم) ابھی چھوٹا تھا۔ اس کی ماں ترابی نے اپنے بیٹے راما راجا کے نام پر ریاست کا انتظام سنبھال لیا۔ اس خاتون نے مغلوں کے خلاف مراٹھوں کی قیادت کی۔ اس کی قیادت میں مراٹھوں کی سلطنت میں بے حد اضافہ ہوا۔ (یہ اورنگزیب کی زندگی کے آخری دور کی بات ہے)۔ ترابی بائی کی بہادری کی داستان بھی ایک متاثر کرنے والی کہانی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں



ہندو مسلم ایسی کئی خواتین تھیں جنہوں نے میدان جنگ میں سپہ سالاری کے فرائض سر انجام دیے۔

شاہو بھوسلے اول، مراٹھوں کا پانچواں چھترپتی تھا۔ شاہو کو بچپن میں ہی والدہ کے ہمراہ 1689ء میں مغل سردار، ذوالفقار خان نصرت جنگ نے گرفتار کر لیا تھا۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد اسے رہائی ملی تو لیکن اس کی والدہ کو قید ہی رکھا گیا۔ اب مغل سوچتے تھے کہ مراٹھوں کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات ان کے لیے مفید ہوں گے لیکن ایسا نہ ہوا۔ شاہو کے دور حکومت میں مراٹھوں کی طاقت اور اثر و رسوخ برصغیر پاک و ہند کے بیشتر حصوں تک پہنچ گیا۔ اسی کے دور میں باجی راؤ اول کو پیشوا مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد طاقت کا مرکز پیشوا کی ذات ہوتی تھی۔ چھترپتی برائے نام ہی بادشاہ ہوا کرتا تھا۔

شاہو کے دور حکومت میں مراٹھوں کی سلطنت، ایک طرف موجودہ بنگال، دوسری طرف گجرات اور تیسری طرف انڈیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔



## Tarabai Bhosale

جب مغلیہ سلطنت کمزور پڑ گئی تو اس وقت انگریزوں کے سامنے کوئی بڑی قوت موجود نہ تھی۔ انگریزوں اور مراٹھوں کے درمیان تین بڑی لڑائیاں لڑی گئیں۔ تیسری اینگلو مراٹھا جنگ آخری جنگ ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں ایک طرف انگریز اور اس کے مقامی اتحادی تھے تو دوسری طرف مراٹھے، تین مختلف گروہوں کی شکل میں کھڑے تھے۔ ان میں کوئی اتحاد نہ ہونے کا نتیجہ انگریزوں کی فتح کی صورت میں سامنے آیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ 5 نومبر 1817ء کو انگریزوں کے ہاتھوں مراٹھوں کی قائم کردہ سلطنت ختم ہو گئی۔

برطانوی مؤرخ پرسیوال اسپیر نے لکھا کہ اس سال سے قبل ہندوستان میں برطانوی راج تھا اور اس فتح کے بعد ہندوستان پر برطانوی راج مسلط ہو گیا۔

یہ سب آپس کی نا اتفاقی کا نتیجہ تھا، اہل ہند نہ تعداد میں کم تھے، نہ علم و ہنر میں پیچھے تھے، نہ بہادری میں کمتر تھے۔۔۔ نہیں تھا تو اتحاد و اتفاق نہیں تھا، کوئی مرکزی قیادت نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ افریقی، یورپی، افغانی، ایرانی، ترک، یونانی، مغل کوئی بھی نہیں بچا جس سے اس سونے کی چڑیا کو ذبح کرنے میں کسر چھوڑی ہو!

## پیشوا باجی راؤ: جس کے ذکر کے بغیر پونے کی تاریخ نامکمل ہے

پیشوا فارسی کا ایک لفظ ہے جس کا مطلب قیادت کرنے والا قائد ہے۔ مراٹھوں کے ہاں اس سے مراد شاہی نمائندہ ہے۔ آپ اسے وزیر اعظم بھی کہہ سکتے ہیں۔ مراٹھا حکمران شاہو نے بالاجی و شونا تھ، جو ذات کا برہمن تھا کو اپنا پیشوا مقرر کیا۔ 1720ء میں شاہو نے باجی راؤ اول کو اپنے والد کا جانشین پیشوا مقرر کیا۔ اسی دوران باجی راؤ پونے منتقل ہو گیا اور اس نے لال محل کی بنیاد رکھی۔ پیشوا خاندان کا سب سے

مشہور شخص باجی راؤ اول، 1700ء میں پیدا ہوا۔ وہ مراٹھا سلطنت کے ساتویں پیشوا (وزیر اعظم) تھے۔ انھوں نے بے شمار جنگیں لڑیں اور اپنے بیس سالہ فوجی کیریئر میں کسی جنگ میں بھی شکست سے دوچار نہ ہوئے۔ اسی بناء پر انھیں ایک عظیم جرنیل مانا جاتا ہے۔ ان کی ایک بیوی مستانی، نصف مسلمان کہلاتی تھی۔ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔



Peshwa Baji Rao Photo Credit: Gyan Villa

کہا جاتا ہے کہ مستانی کا والد مہاراجہ چھتر سال ایک راجپوت تھا اور اس کی ماں ایک مسلمان لونڈی تھی۔ میں نے اس واقعہ کے علاوہ کہیں نہیں پڑھا کہ کوئی مسلمان عورت کسی ہندو راجہ کی بیوی یا لونڈی ہو۔ اس لیے اسے نصف مسلمان کہا جاتا ہے۔

اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ 1728ء میں نواب محمد خان بنگش نے چھتر سال پر حملہ کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ چھتر سال نے باجی راؤ سے مدد طلب کی اور ایک جنگ میں باجی راؤ نے بنگش کو شکست دے دی۔ اس مدد پر خوش ہو کر چھتر سال نے باجی راؤ کو اپنی بیٹی مستانی کا ہاتھ دے دیا اور ساتھ ہی اپنی ریاست کے ایک تہائی حصے کا حاکم بھی بنا دیا۔ اس کے علاوہ اس نے باجی راؤ کو 33 لاکھ سونے کے سکے بھی دیے۔ دقت یہ تھی کہ اس وقت باجی راؤ پہلے سے شادی شدہ تھے اور خاندانی روایت کے

مطابق وہ دوسری شادی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مستانی کو الگ مکان میں رکھا۔ محل کے شمال مشرقی کونے میں مستانی محل بنا گیا جس کا بیرونی دروازہ بھی تھا جو مستانی دروازہ کہلاتا تھا۔ بھارت میں باجی راؤ مستانی کے نام سے اس پر فلم بھی بنائی گئی اور اس موضوع پر کئی ناؤل بھی لکھے گئے۔

مستانی نے ایک بیٹا پیدا کیا جس کا نام شمشیر بہادر راؤ رکھا گیا۔ اس کا دوسرا نام کرشنا راؤ بھی تھا۔ اسکی ماں آدھی مسلمان تھی، اس لیے ہندوؤں کے پرہیت نے اسے ہندو دھرم میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔

1740ء میں باجی راؤ اور مستانی دونوں ہی وفات پا گئے۔ ان کی اموات کے بعد کاشی بائی نے 6 سالہ شمشیر بہادر کو اپنی نگہداشت میں لے لیا اور اسے اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ جب شمشیر بہادر جوان ہوا تو اس نے اپنی فوج کے ساتھ مراٹھوں اور افغانوں کے درمیان ہونے والی پانی پت کی تیسری جنگ میں حصہ بھی لیا اور اسی جنگ میں مارا گیا۔ مستانی کی وفات پر اسے مسلمانوں کے طریقے سے دفنایا گیا۔ اس کی قبر کو مستانی کی سمدھی اور مستانی کا مزار، دونوں کہا جاتا ہے۔

مراٹھوں نے شمشیر بہادر کے بیٹے علی بہادر راؤ کو راجپوتانہ صوبے کے اُس حصے کا گورنر بنادیا جو مستانی کے جہیز میں آیا تھا۔ علی بہادر کے بیٹے نواب علی بہادر دوم نے جہانسی کی رانی لکشمی بائی سے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی۔ ان کی اولاد بوندہ کے نواب کے نام سے مشہور تھی۔ علی بہادر کی شکست کے بعد انگریزوں نے بانڈاریاست کو ختم کر دیا۔ (اس سے متعلق مزید جاننے کے لیے آپ کو تاریخ کے اوراق پلٹنے پڑیں گے)۔

باجی راؤ راؤ نے شاہو کو اس بات پر آمادہ کیا کہ مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہے لہذا ہمیں اسی وقت شمالی ہندوستان پر حملہ کرنا چاہیے۔ باجی راؤ کا کہنا تھا کہ اگر درخت کی شاخیں کاٹ دی جائیں تو تناخود سے گر پڑے گا۔ اس لیے ہمیں دلی پر حملہ کرنا چاہیے اور

س طرح ہم انکے پر اپنا جھنڈا لہرا سکیں گے۔ اس بات سے آپ باجی راؤ اوّل کی سوچ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ باجی راؤ اوّل کی چند جنگوں کا مختصر ذکر پیش خدمت ہے۔

## باجی راؤ اوّل اور نظام

جب شہنشاہ محمد شاہ نے مغل سلطنت کی حکمرانی سنبھالی تو نظام نے اس حکم کے خلاف بغاوت کر دی۔ مغل شہنشاہ نے اس کے خلاف ایک لشکر بھیجا، جسے نظام نے شکست دے دی۔ نظام کی اس فتح میں باجی راؤ نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بدلے نظام نے کئی انعامات سے نوازا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ باجی راؤ اوّل، مغلیہ سلطنت کے خاتمے کی خاطر اس کے دشمنوں کے ساتھ مل کر بھی جنگ کرتا رہا۔

تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ جب نظام نے مراٹھوں کے خلاف ایک فوج بھیجی۔ اس موقع پر باجی راؤ اوّل نے مراٹھوں کا ساتھ دیا اور 1728ء میں ایک بڑی جنگ میں نظام کو شکست فاش دی۔ اس جنگ کی کامیابی نے نظام کو شاہی بادشاہی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔

## مالوا کی فتح

1723ء میں، باجی راؤ نے جنوبی مالوا میں ایک مہم کا آغاز کیا۔ جس میں اس نے کئی مقامی راجاؤں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ سب نے موقع غنیمت جانا اور مغلیہ سلطنت کے زوال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اگلے پچھلے تمام حساب پیٹاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مراٹھوں کی اس فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے، مغل بادشاہ نے گردھار بہادر کو مالوا کا گورنر مقرر کیا۔ نومبر 1728ء میں مالوا کے علاقے میں ایک زبردست جنگ ہوئی۔ دونوں طرف ہندو ہی قیادت کر رہے تھے۔ گردھار بہادر اور دیا بہادر اس خونریز جنگ میں مارے گئے اور مغل فوج میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ اس طرح مراٹھوں کی افواج موجودہ راجستھان تک پہنچ گئیں۔

## بنڈیل کھنڈ (Bundelkhand) کی فتح

چھتر سال کے راجہ نے بھی مغل سلطنت کے خلاف بغاوت کی اور اپنی ایک آزاد ریاست قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ 1728ء میں محمد خان بنگش کی سربراہی میں ایک مغل فوج نے اس پر حملہ کر کے اس کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ ایک طرح سے اسے مقامی لوگوں کی شکست سمجھی جاتی ہے۔ چھتر سال بار بار باجی راؤ کی مدد طلب کرتا رہا لیکن وہ مالوا میں مصروف ہونے کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکا۔ بعد ازاں باجی راؤ اول اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ باجی راؤ کی افواج نے بنگش کو گھیر لیا اور اس کی رسد اور مواصلات کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔ بنگش نے باجی راؤ کے خلاف جوابی کارروائی کی اور خوب مقابلہ کیا۔ یہ سب دیکھ کر بنگش کے بیٹے نے اپنے والد کی مدد کے لیے تازہ دم افواج کے ساتھ حملہ کیا۔ اس کی فوج پر باجی راؤ کی افواج نے حملہ کر دیا اور وہ بھی شکست کھا گیا۔ شکست کے بعد بنگش ایک معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے رخصت ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس معاہدے کے مطابق طے پایا کہ وہ کبھی بھی بنڈیل کھنڈ پر حملہ نہیں کریں گے۔ یہ وہی واقعہ ہے جس کے بعد چھتر سال نے باجی راؤ کو ایک بڑی جاگیر اور اپنی بیٹی مستانی بھی عطا کی۔

دسمبر 1731ء میں چھتر سال نے اپنی موت سے پہلے اپنے ایک تہائی علاقوں کو مراٹھوں کے حوالے کر دیا۔ اس طرح مراٹھوں کی طاقت میں بے حد اضافہ ہوا۔

## گجرات: مراٹھوں کا اگلا نشانہ

وسطی ہندوستان میں اثر و رسوخ مستحکم کرنے کے بعد مراٹھوں نے صوبہ گجرات سے ٹیکس وصول کرنے کا فیصلہ کیا اور 1730ء میں اس علاقے پر حملہ کر دیا۔ صوبے کے مغل گورنر، سر بلند خان نے جنگ کرنے کی بجائے چوتھا حصہ ٹیکس وصول

کرنے کے مراٹھا حق کو تسلیم کر لیا۔ شاہو کے ایک جرنیل تریمبک راؤ دہاڑے نے اس کا بُرا منایا اور انھوں نے پیشوا سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ کچھ اور راجپوت سردار بھی اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس دوران انھوں نے مراٹھوں کو شکست دینے کے لیے مغل بادشاہ نے جے سنگھ دوم کو مقرر کیا۔ یہ 1728ء کا واقعہ ہے۔ جے سنگھ نے بھی لڑائی کی بجائے پرامن معاہدے کی سفارش کی جسے مغلوں نے تسلیم نہ کیا۔



Maratha Empire Photo Credit:  
<https://learn.culturalindia.net>

اب کی بار محمد خان بنگش کو مراٹھوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے سیاسی سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے نظام، تریمبک راؤ اور شمشہاجی دوم کے ساتھ اتحاد قائم کیا اور اس طرح چالیس ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک بڑی فوج تیار کر لی۔ اس وقت باجی راؤ کے فوجیوں کی تعداد صرف پچیس ہزار تھی۔ باجی راؤ نے صلح کی کوشش کی، جو

ناکام رہی۔ آخر کار میدان جنگ سجا اور باجی راؤ اوّل کو فتح حاصل ہوئی۔ تمام فریقین کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کی اصل روح، اس تقسیم مال پر سمجھوتہ تھا جو ٹیکس کی مد میں اکٹھا ہوتا تھا۔ یہ جنگ بھی کوئی نظریاتی نہیں بلکہ صرف اور صرف مالی مفادات کے لیے تھی۔ اب مراٹھے وسطی ہندوستان سے نکل کر شمالی ہندوستان کی طرف رواں دواں تھے۔ دلی جو باجی راؤ اوّل کی اصل منزل تھی، ابھی بھی دور تھی۔

## جنجیر اور شیدی حکمران

جنجیرا، ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ایک علاقہ ہے۔ جہاں مدت سے شیدی لوگ حکمران تھے۔ میں نے بھارت کے چار سفر حصہ دوم میں شیدی لوگوں سے متعلق کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ لوگ افریقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ملک امنبر ایک بہادر جرنیل تھے جو مسلمان حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ملازمت بھی کرتے رہے تھے۔ بعد ازاں انھوں نے اپنی ایک ریاست بنالی جو انگریزوں کی اتحادی بنی۔ تقسیم ہند کے بعد یہ ریاست بھارت میں شامل ہو گئی۔ 1733ء میں ان کے ایک نواب سردار یعقوت خان کی موت کے بعد ان کے بیٹوں کے درمیان جانشینی کی جنگ شروع ہو گئی۔ ان میں سے ایک دعوی دار، عبدالرحمن نے باجی راؤ سے مدد طلب کی۔ باجی راؤ نے اس کی مدد بھی کی اور معاوضہ بھی وصول کیا۔ اس مدد کے نتیجے میں عبدالرحمن کو اس ریاست کا حاکم بنادیا گیا۔ بعد ازاں مراٹھوں نے ان لوگوں پر حملہ کیا اور ان کی ریاست کو بہت حد تک محدود کر دیا۔ اس سے باجی راؤ اوّل کی فتوحات کی فہرست میں اضافہ ہوا۔

## راجپوتانہ کے راجہ اور باجی راؤ اوّل کی شرائط

باجی راؤ اوّل کی دہشت کا عالم سن کر راجپوت سرداروں نے لڑائی سے پرہیز کیا اور باجی راؤ اوّل کی تمام تر شرائط کو قبول کر لیا، جس میں سب سے اہم ٹیکس کا چوتھا حصہ



مراٹھوں کو ملنا تھا۔ باجی راؤ نے 1735ء میں شمالی ہندوستان کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا۔ میواڑ کے جنوبی سرحدی علاقے میں پہنچے۔ ہر رانا جگت سنگھ نے اس کا استقبال کیا اور لڑائی کی بجائے صلح کو ترجیح دی۔

صلح کسی بھی کمزور شخص کا کسی بھی طاقتور کے سامنے بہترین ہتھیار ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مقامی سردار ٹیکس کا چوتھا حصہ دینے کو تیار تھے لیکن مغلیہ سلطنت کا شہنشاہ ان کے مطالبات پر راضی نہیں تھا۔ باجی راؤ اول نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مقامی سرداروں کو رام کرنے کے بعد دہلی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مقامی راجپوت لوگوں نے بھی مغلوں سے بدلہ لینے کا سوچ کر باجی راؤ اول کا ساتھ دیا اور یوں مراٹھے دہلی کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

## دہلی اور باجی راؤ اول

تربیک راؤ کی موت کے بعد مراٹھوں کے خلاف بنا ہوا مغل اتحاد ٹوٹ گیا۔ مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے مغل بادشاہ نے جے سنگھ دوم کو دوبارہ مالوا کا گورنر مقرر کیا لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ مراٹھوں کے چیف ہو لکر نے جے سنگھ کو شکست دے دی۔ اس کے بعد دو مزید لڑائیاں بھی ہوئیں جن میں باجی راؤ اول کا پلڑا بھاری رہا۔ اس کے نتیجے میں باجی راؤ اور جے سنگھ نے 1736ء کو کش آباد میں ایک معاہدہ کیا۔ جے سنگھ نے شہنشاہ کو اس منصوبے سے اتفاق کرنے پر راضی کر لیا کیونکہ بادشاہ کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ پھر تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ مغلیہ سلطنت کے وارثوں کو باجی راؤ کو اس خطے کا نائب گورنر مقرر کرنا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جے سنگھ نے ایک طاقتور کو اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کمزور کو مزید کمزور کرنے کا فیصلہ کیا اور

خود کو ایک ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ جوڑنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اب مراٹھے باجی راؤ اوّل کی قیادت میں دلی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

لیکن باجی راؤ اوّل کا ہدف دلی تھا۔ اس نے پچاس ہزار گھڑ سوار دستے کی فوج کے ساتھ دلی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مغل بادشاہ نے بھی ڈیڑھ لاکھ فوج سے اس کا مقابلہ کیا۔ باجی راؤ اوّل نے بہترین حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے دلی پر ایک کامیاب حملہ کیا۔ مغل شہنشاہ نے باجی راؤ کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے میر حسن خان کی سربراہی میں ایک فوج روانہ کی۔ جیسے ہی باجی راؤ اوّل کو معلوم ہوا کہ ایک بڑی مغل فوج دلی کی طرف آرہی ہے تو اس نے دلی سے دور جانے کا فیصلہ کیا۔

## بھوپال کی جنگ اور باجی راؤ اوّل کی فتح

باجی راؤ کے دہلی پر حملے کے بعد مغل بادشاہ محمد شاہ نے نظام کے ساتھ ساتھ دیگر ریاستوں سے بھی مدد مانگی۔ نظام نے سب سے زیادہ مدد کی اور 30,000 افراد پر مشتمل مغل فوج بمع توپ خانہ، باجی راؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہوئی۔ باجی راؤ اوّل نے بھی 80,000 افراد پر مشتمل ایک فوج کو جمع کر لیا۔

باجی راؤ نے لڑائی کی بجائے سپلائی کاٹنے پر توجہ دی، جس میں وہ کامیاب رہا۔ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر نظام نے ایک امن معاہدے پر دستخط کر دیئے اور یوں مالوا مراٹھوں کے قبضے میں چلا گیا۔ مغلوں نے ایک بڑی رقم دینے پر اتفاق کیا۔ نظام سے اس معاہدے کی پاسداری کی خاطر باجی راؤ اوّل نے قرآن مجید پر حلف بھی لیا۔ دلی اب باجی راؤ اوّل کے سامنے تھا۔۔۔ اور درمیان میں کوئی طاقت بھی نہ تھی۔

## پر تگالیوں کی سرکشی اور باجی راؤاؤل

ایک طویل مدت سے ہندوستان کے مغربی ساحل کے متعدد علاقے پر تگالیوں کے قبضے میں تھے۔ انھوں نے ایک معاہدے کی خلاف ورزی کی، جس پر باجی راؤاؤل نے اپنی ایک فوج بھیج کر پر تگالیوں کو سبق سکھایا اور ان کے کئی چرچہ قبضے میں کر لیے۔ اس دوران نادر شاہ کے ہندوستان پر حملے کی خبریں بھی ملنے لگیں اور یوں مراٹھوں کی توجہ اس طرف سے ہٹ گئی۔ البتہ چرچہ سے اٹھائی گئیں کئی گھنٹیاں ہندوؤں کے مشہور مندروں میں رکھی گئیں۔

اس واقع کے ایک سال بعد 1740ء میں باجی راؤاؤل (جس کی عمر صرف چالیس برس تھی) کی موت واقع ہو گئی اور یوں ایک ایسے مراٹھا جرنیل کا عہد ختم ہوا جس نے طاقت پر کم اور جنگی حکمت عملی و سیاسی سمجھ بوجھ پر زیادہ بھروسہ کر کے یہ ثابت کیا کہ جنگ یوں بھی جیتی جاسکتی ہے۔ جیسے کہ ڈیڑھ لاکھ مغل فوج آگرہ میں اس کی منتظر تھی اور وہ کسی اور راستے سے دلی پر حملہ کر چکا تھا۔

## بالاجی باجی بھٹ: ایک نوجون پیشوا

بالاجی باجی بھٹ 1720ء کو پیدا ہوا اور 1761ء میں (چالیس سال کی عمر میں) وفات پائی۔ اسے نانا صاحب بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان میں مراٹھوں کا آٹھواں پیشوا تھا۔ والد کی وفات کے بعد اسے پیشوا بنایا گیا۔

اپنے والد کے برعکس، بالاجی باجی راؤ کی ایک فوجی ذہنیت کے مالک نہیں تھے بلکہ ان کی زیادہ تر توجہ ریاست کے اصلاحی کاموں کی طرف تھی۔ اس کمزوری کی وجہ سے

وہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی شدت کا اندازہ کرنے میں ناکام رہے۔ بالآخر اس کا نتیجہ پانی پت کی تیسری جنگ میں مراٹھوں کی تباہ کن شکست کی صورت میں سامنے آیا۔

## نظام کے خلاف مہم

آغاز میں کئی سال بالاجی باجی بھٹ خاندانی لڑائیوں میں مصروف رہے۔ بعد ازاں 1751ء میں انھوں نے نظام حیدر آباد کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں فرانسیسی گورنر جنرل بھی نظام کا حمایتی تھا۔ یاد رہے کسی وقت نظام بھی انگریزوں کے حلیف تھے۔ فرانسیسی تربیت یافتہ فوج کی وجہ سے مراٹھوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ ایک سال بعد ہی بالاجی راؤ نے نظام کے خلاف دوبارہ جنگ شروع کر دی۔ اس مرتبہ بالاجی باجی بھٹ نے انگریزوں کی مدد کے ساتھ اس جنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا لیکن انگریزوں نے انکار کر دیا۔ یہ جنگ بھی ایک معاہدے پر ختم ہوئی نہ کسی کی جیت ہوئی، نہ کسی کی ہار۔ البتہ راگھوجی بھونسلے کو نظام کی جاگیر سے کچھ حصہ ضرور ملا۔

## ہندوستان ایک ہندو ریاست کا خواب: جو پورا نہ ہو سکا

بالاجی کا والد باجی راؤ چاہتا تھا کہ وہ ہندوستان میں ایک ہندو بادشاہت قائم کرے۔ اسی وجہ سے اس نے ہندو راجپوتوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کیے، لیکن باجی راؤ اوّل کے وفات اور چند اہم راجپوت سرداروں کی وجہ سے یہ اتحاد جلد ہی ختم ہو گیا اور یوں وہ خواب ایک خواب ہی رہ گیا۔ بالاجی راؤ کے دور حکومت میں مراٹھوں اور راجپوتوں کے درمیان گہرے اختلافات نے جنم لیا۔ ان کی وجہ سے مراٹھوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی بے حد نقصان پہنچا۔ اس میں زیادہ قصور وار کون تھے؟ وثوق سے کہنا مشکل ہے۔

سورج مل جاٹ، راجپوت سرداروں اور مراٹھوں کی تاریخ پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مراٹھوں کی ہٹ دھرمی ہی انھیں لے ڈوبی۔ اسکی ایک مثال 1750ء میں، مراٹھوں کا بقایا جات ادا نہ کر سکنے کی سزا کے طور پر ایشوری سنگھ کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ ایشوری سنگھ کے پاس مراٹھوں کو ان کے بقایا جات دینے کے لیے رقم نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے شہریوں پر مزید ٹیکس بھی عائد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس صورت حال میں اس نے زہر کھا کر خود کشی کر لی۔ مراٹھوں کے ایسے ہی برتاؤ کی وجہ سے کوئی بھی مقامی راجپوت اور جاٹ ان کے ساتھ پانی پت کی جنگ میں شامل نہیں ہوا۔ انھوں نے اکیلے ہی احمد شاہ ابدالی کا مقابلہ کیا اور بدترین شکست سے دو چار ہوئے۔

### مادھو راؤ بھٹ پیشوا: مراٹھوں کا آخری پیشوا

مادھو راؤ بھٹ پیشوا نانا صاحب کے دوسرے بیٹے تھے۔ وہ 1745ء میں ساونور میں پیدا ہوئے۔ نانا صاحب نے مراٹھا سلطنت کو وسعت دے کر بہتر حکمرانی کی ایک مثال قائم کی۔ اس سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے جنگوں کے ساتھ ساتھ فلاح و بہبود کے کبھی کئی کام کیے۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں شکست کا کسی حد تک جزوی طور پر ذمہ دار بھی ہے۔ اپنے والد کی موت کے بعد سولہ سالہ مادھو راؤ کو مراٹھا سلطنت کا اگلا پیشوا بنادیا گیا۔ یہ مراٹھوں کا نواں پیشوا تھا۔

مادھو راؤ کی وفات 1772ء میں 27 سال کی عمر میں ہوئی۔ ان کی موت مراٹھوں کے لیے نہایت ہی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مادھو راؤ بھٹ کی موت ہی مراٹھوں کے زوال کا نقطہ آغاز تھی۔ انھوں نے جن غیر ملکی انگریزوں کے ساتھ مل کر مقامی مسلمان ریاستوں کو تباہ کیا، انھوں نے ہی مراٹھوں کی طاقت کا خاتمہ کیا۔ (جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں درج ہے)۔

## مراٹھوں کا دلی پر آخری وار اس مرتبہ مغلیہ سلطنت کے بچاؤ کی خاطر

احمد شاہ درانی 1757ء کے اوائل میں چوتھی بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس کے سامنے کوئی طاقت نہ تھی۔ اس نے پہلے سے موجود مغل بادشاہ کو نظر بند کیا اور جاتے ہوئے عالمگیر دوم کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا، جو برائے نام بادشاہ تھا۔ واپس جانے سے پہلے ابدالی نے اپنے ایک قابل اعتماد افغان جرنیل، نجیب الدولہ کو دلی کا اصل حکمران بنایا۔ جس کے بدلے اس نے ابدالی کو سالانہ بیس لاکھ روپے خراج دینے کا وعدہ کیا۔ درحقیقت وہ نجیب ہی تھا جس نے ابدالی کے چوتھے حملے میں اس کی مدد کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سارے قصے میں مغلوں اور افغانوں کے درمیان پرانی دشمنی کا بے حد اہم کردار ہے۔ ابدالی بھی ایک افغان تھا، اس نے مغل بادشاہ کو ایک کٹھ پتلی حکمران بنادیا اور اصل اقتدار ایک افغان کے سپرد کر دیا۔ اس طرح ایک افغان (نجیب اب دہلی کا اصل حکمران تھا۔

یہ ساری صورت حال دیکھ کر مغل شہنشاہ اور اس کے وزیر عماد الملک گھبرا گئے۔ ایسی حالت میں انھوں نے مراٹھوں سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ مراٹھے ہی تھے جنہوں نے اس سے پہلے دلی کو لوٹا تھا۔ مراٹھوں کے لیے یہ ایک سنہرا موقع تھا جب انھیں مغلیہ سلطنت کا وارث ہی آواز دے رہا ہو۔ ایسی صورت میں انکار کیسا؟ مراٹھوں نے مغلوں کی مدد سے نجیب کے خلاف جنگ میں فتح حاصل کی۔ اس طرح مراٹھے اب دلی کے حکمران بھی بن چکے تھے۔ انھوں نے بھی عالمگیر دوم کو ہی بادشاہ رہنے دیا۔ دلی کی فتح کے بعد مراٹھوں نے مئی 1758ء میں اپنی سلطنت کو خیبر پاس تک پھیلایا۔ یہ کیسے ہوا؟ اس کی پیچھے بھی مغلوں اور افغانوں کی پرانی دشمنیاں ہی تھیں۔

جب مراٹھوں نے دلی پر قبضہ کر لیا تو پنجاب میں موجود مغل گورنر اور سکھوں نے بھی انھیں اپنی مدد کے لیے بلوایا۔ اب ایک طرف ابدالی کے حمایتی تھے اور دوسری

طرف مغل، مراٹھے، راجپوت اور سکھ تھے۔ سب ہی ابدالی کے حملوں سے تنگ تھے۔ ان سب نے ملکر 1758ء میں ابدالی کے طرف داروں کے خلاف ایک زبردست مہم شروع کی اور خیبر تک ان کا پیچھا کیا اور اس طرح مراٹھوں کے قدم خیبر تک پہنچ گئے۔ یاد رہے یہ ان کی انفرادی فتح نہیں تھی بلکہ اس کے اور بھی بہت سے حصہ دار تھے۔ البتہ سب سے زیادہ کردار مراٹھوں کا ہی تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ خواجہ مرزا کو مراٹھوں نے پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ ابدالی یہ سب کچھ دیر تک برداشت نہ کر سکا۔ مراٹھوں کے لیے بھی اس علاقے میں دیر تک رہنا اور اپنا اقتدار برقرار رکھنا مشکل تھا۔ پھر وہی ہوا جو ہر اس سلطنت کے ساتھ ہوتا ہے جو ہمہ وقت اپنی سرحدوں کو پھیلانے کے ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہے یعنی زوال۔۔۔

ابدالی نے پانچویں بار ہندوستان پر حملہ کر کے مراٹھوں کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ مراٹھوں کا بے حد جانی نقصان ہوا۔ اس طرح شمالی ہندوستان میں مراٹھوں کا اقتدار ختم ہو گیا۔ دوسری طرف انگریزوں نے بھی مراٹھوں پر حملے شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ساتھ جنوبی ہندوستان کی کئی ریاستوں نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ طوفان جو ہندوستان کو ایک ہندو ریاست بنانے کے لیے جنوبی ہندوستان کے مغربی ساحلوں سے اٹھا تھا، پنجاب اور موجودہ کے پی کے کے علاقوں میں دم توڑ گیا۔ اس سب کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے جنوبی ہندوستان پر بھی چڑھائی کر دی۔

یہ سب دیکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو اس وقت کی دو بڑی طاقتیں، انگریز یا مراٹھے، جن کے ساتھ بہت سی مقامی ریاستیں بھی تھیں، پر کر سکتی تھیں۔ ابدالی نے مراٹھوں اور ان کے ساتھیوں کی طاقت کو نیست و نابود کر دیا اور اب صرف ایک ہی طاقت بچی تھی جس کا نام ایسٹ انڈیا

کمپنی تھا۔ یاد رہے اس وقت تک برطانیہ کی حکومت ہندوستان کے معاملات کی براہ راست ذمہ دار نہ تھی۔ ایسی صورت میں انگریزوں کی جیت یقینی تھی۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابدالی کے حملوں نے انگریزوں کی راہ ہموار کی۔

اس سے ایک یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ابدالی کی وجہ سے مراٹھوں کی طاقت ختم نہ ہوتی تو ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت کا مراٹھا خواب پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہتی۔ ایسی صورت حال میں مسلمان کس حالت میں تھے؟

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مراٹھوں اور ان کے اتحادیوں نے کسی بھی مسلمان ریاست کو نہیں بخشا۔ وہ ایک ایک کر کے انھیں ختم کر رہے تھے۔ مراٹھوں اور ان کے اتحادیوں کو ہندو اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ ہندو رعایا کو مسلمان حکمرانوں کے طرز حکمرانی سے بھی بہت سی شکایتیں تھیں۔ اگر ابدالی نہ آتا تو کیا مسلمان سکھ کا سانس لے سکتے تھے؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

اس بارے میں میں نے امجد نواز وڑائچ صاحب سے بات کی تو ان کو کہنا تھا کہ ابدالی کا مراٹھوں کو ختم کرنا اور انگریزوں کا حکومت کرنا، درحقیقت مسلمانوں کی بقاء کا سبب بنا۔ میں بھی ایسا ہی سوچتا ہوں، ممکن ہے کہ یہ بات درست نہ ہو۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

## مراٹھوں کا زوال صرف چند سالوں میں

مراٹھوں کا زوال اس وقت شروع ہوا جب وہ پنجاب میں داخل ہوئے اور افغانوں کو سرحد پار پہنچانے کے لیے پشاور تک گئے۔ اس مرحلے پر مغل اور سکھ ان کے ساتھ تھے۔ مراٹھے سکھوں سے دوستی کرنے میں ناکام رہے اور سکھوں کے ساتھ کوئی باضابطہ معاہدہ بھی نہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ ادینہ بیگ کے ساتھ بھی ان کے



معاملات طے نہ ہو سکے۔ اس کے مقابلے میں ابدالی نے ہندوستان پر حملے کو مسلمانوں کی بقاء کا مسئلہ بنا کر اسے اسلام اور کفر کی جنگ میں تبدیل کر دیا۔ اس وجہ سے مقامی مسلمان، جو مراٹھوں کے ظلم و ستم سے بے حد تنگ تھے، ابدالی کی فتح کی کوشش میں شریک ہو گئے۔ ابدالی کے پانچویں حملے اور مراٹھوں کی شکست کی صورت میں ان کے واپس پونے جانے کے خوف نے بھی سکھوں، مغلوں اور راجپوتوں مراٹھوں سے دور رہنے پر مجبور کیا۔

ایک اور بات جس کی وجہ سے مراٹھوں کی طاقت کا خاتمہ ہوا۔ وہ ان کا طرزِ حکمرانی تھا۔ ان کی گرم مزاجی، گھمنڈ، غرور اور دولت کا لالچ بھی ان کے زوال کا سبب بنا۔ ان کا مقامی لوگوں پر بھاری ٹیکس عائد کرنا بھی اسی ظلم کی ایک مثال ہے۔

ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ راجپوت کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ مراٹھے شمالی ہندوستان میں حکومت کریں۔ اسی وجہ سے کئی راجپوت ریاستوں نے، جن میں بے پور بھی شامل تھی، مراٹھوں کے خلاف ابدالی کا ساتھ دیا۔ انھیں معلوم تھا کہ اگر ابدالی مراٹھوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور حسب معمول افغانستان واپس چلا گیا تو وہ اپنی ریاست کی حکمرانی بچا پائیں گے۔ ایسا ہی ہوا ابدالی نے جانے سے پہلے اپنے اتحادیوں، راجپوتوں اور سکھوں، کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔

میں نے مراٹھوں کے بارے میں کافی تفصیل سے اس لیے لکھا ہے کہ ہمارے ہاں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے اس میں ان کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ مراٹھوں کے عروج و زوال کی کہانی بڑی دلچسپ ہے اور پڑھنے کے لائق ہے۔ پونے میں واقع چند اہم مقامات کا مختصر تعارف بھی آپ کی دلچسپی کا باعث بنے گا۔



Photo Credit: Guru Ghantal

## سنہاگاڈ قلعہ

سنہاگاڈ قلعہ پونے شہر سے تقریباً پینتیس کلومیٹر جنوب مغرب میں ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قلعہ دو ہزار سال قبل تعمیر کیا گیا۔ اس طرح اس قلعے کا شمار ہندوستان کے چند قدیم قلعوں میں ہوتا ہے۔ اس کے نام کا ایک مطلب شیروں کا قلعہ بھی ہے۔ اس قلعے پر قبضے کے لیے بہت سی لڑائیاں بھی لڑی گئیں۔ سترہویں صدی میں اس مقام پر لڑی جانے والی ایک لڑائی بے حد مشہور ہے۔ یہ قلعہ چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس وجہ سے اسے فتح کرنا ہمیشہ سے ہی مشکل کام رہا ہے۔ ڈھلوانوں کی وجہ سے یہ ایک محفوظ قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس میں داخل ہونے کے لیے دو دروازے ہیں، کلیان دروازہ اور پونے دروازہ۔ اس قلعے کے ارد گرد کئی دوسرے قلعے بھی موجود ہیں۔



Chatrapati Shivaji Maharaj statue on horse near shaniwar wada in Pune

یہ قلعہ صدیوں تک ہندو راجاؤں کے قبضے میں رہا۔ پہلی مرتبہ 1328ء میں محمد بن تغلق نے اس قلعہ کو فتح کیا۔ یاد رہے تغلق خاندان دہلی سلاطین کا حصہ تھا۔ یہ قلعہ دہلی سے پندرہ سو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مسلمان فوج اتنی طاقتور تھی کہ اس نے اس علاقے میں قائم ایک قدیم ریاست کو شکست دے کر اس علاقے کا کنٹرول ایک مقامی ہندو سردار کے سپرد کیا۔ کئی لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور اس قلعے پر قبضے کے لیے جنگیں بھی لڑیں۔ یہ ایک دلچسپ تاریخ ہے جس میں ملک عنبر (جس کا تفصیلی ذکر میں پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں) نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

سترہویں صدی کے آخر میں مغلیہ سلطنت نے اس علاقے پر اپنا کنٹرول حاصل کر لیا۔ مغلوں نے 1662، 1663 اور 1665ء میں اس قلعے پر حملے کیے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک معاہدے کے تحت یہ قلعہ مغل آرمی کے کمانڈر مرزا راجہ جے سنگھ اول نے 1665ء میں حاصل کر لیا۔ (میرے لیے یہ بات عجیب تھی کہ ایک ہندو راجپوت سردار کے نام کے ساتھ مرزا کا لقب لگا ہوا تھا۔ میں نے کئی جگہ اس نام کو دیکھا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مرزا کا لفظ بھی بطور لقب استعمال ہوتا رہا ہے جیسے لفظ رانا)۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جیسے ہی مغلیہ سلطنت کمزور ہوئی تو شیواجی نے تیسری مرتبہ اپنے صوبیدار تاناजी مالسارے کے ذریعہ اس قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

تاریخ سے یہ بھی ملتا ہے کہ 1703ء میں اورنگ زیب نے یہ قلعہ فتح کیا لیکن جیسے ہی اورنگزیب کی وفات ہوئی تو 1706ء میں مراٹھے پھر سے قابض ہو گئے۔ یوں یہ قلعہ ہمیشہ اپنے مالک بدلتا رہا۔ پھر ایک وقت آیا جب انگریزوں نے اس علاقے اور قلعے پر اپنا کٹرول مضبوط کر لیا۔ اس کام کے لیے انگریزوں کو تین ماہ کا عرصہ لگا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قلعہ کا حفاظتی نظام نہایت ہی مضبوط تھا۔

اس قلعے کے حصول کے لیے ایک لڑائی لڑی گئی جو سنہاگرھ کی مشہور لڑائیوں میں سے ایک ہے۔ یہ لڑائی 1670ء میں ہوئی۔ اُس وقت اس قلعے پر مغلوں کا قبضہ تھا اور قلعے کا کماندار ایک راجپوت سردار، ادبھن سنگھ راٹھور تھا۔ شیواجی کے ایک جرنیل تاناजी مالسارے نے اس قلعے پر حملہ کیا۔ کہتے ہیں کہ سیدھی دیواروں پر بڑھائی کے لیے ایک بڑی چھپکلی کو تربیت دی گئی اور اس کی مدد سے قلعے کی دیوار کو پھلانگا گیا۔ اُس جنگ میں تاناजी مالسارے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کی موت کے بعد ان کے بھائی سوریاजी نے قیادت سنبھال کر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

تاریخی کتب میں یہ لکھا ہے کہ تاناजी کی موت کی خبر سن کر شیواجی نے ان الفاظ سے افسوس کا اظہار کیا،

قلعہ فتح ہو چکا ہے لیکن ہمارا شیر کھو گیا۔

اس قلعے میں تاناजी مالسارے کے نام سے ایک عمارت بھی بنائی گئی ہے۔ انھیں علاقے میں ایک ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔ افریقہ سے واپسی پر مہاتما گاندھی بھی اس قلعے میں آئے تھے۔

## شنوارہ: ایک قدیم قلعہ اور محل

پونے میں موجود مراٹھوں کا تعمیر کردہ اٹھارہویں صدی کا ایک قلعہ اس شہر کا ایک مشہور سیاحتی مقام ہے۔ یہ قلعہ 1732ء میں تعمیر کیا گیا اور 1818ء تک مراٹھا حکمرانوں کا مرکز مانا جاتا تھا۔ تیسری اینگلو مراٹھا جنگ کے بعد اس قلعہ پر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ اس قلعے میں آگ لگ گئی جس کی وجہ سے کئی اہم عمارتیں جل کر تباہ ہو گئیں۔

اس عمارت سے متعلق ایک عجیب و غریب روایت کا ذکر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس شنوار واڑہ کو پتھروں سے تعمیر کرنے کا کام شروع ہوا، (اسے سات منزلہ عمارت بنانے کا منصوبہ تھا) لیکن ابھی پہلی منزل ہی بنی تھی کہ لوگوں نے شاہو (شاہ) سے شکایت کر دی کہ پتھر سے اس طرح کی عمارت کی تعمیر صرف بادشاہ کا حق ہے، پیشوا کا نہیں ہے۔ اس وجہ سے باقی عمارت پتھر کی بجائے اینٹوں سے بنائی گئی۔ جب انگریزوں نے اس پر حملہ کیا تو اوپر والی چھ منزلیں گر گئیں اور صرف پتھر سے بنی ہوئی منزل باقی بچی۔

روایت تو زندہ رہی لیکن عمارت تباہ ہو گئی۔

تاریخ نے وہ دن بھی دیکھا جب جون 1818ء میں پونے کے اس وقت کے پیشوا باجی راؤ اول نے اپنا تخت برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سر جان میکلم کے حوالے کیا اور خود موجودہ اتر پردیش میں کان پور کے قریب بیتھور کے علاقے میں سیاسی جلا وطنی اختیار کی اور یوں ایک قدیم ہندو ریاست انگریزوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔



Surrender of the Peishwa

Photo Credit: <https://www.alamy.com>



Surrender of Maratha Photo Credit: Alamay

یاد رہے کہ اس ریاست کو کسی مسلمان حکمران نے نہیں بلکہ انگریزوں نے ختم کیا۔ یہ وہی انگریز تھے جن کے ساتھ مل کر مراٹھوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دی تھی۔ پھر ایک دن آیا کہ وہ اپنے دوست کے ہاتھوں ہی تباہ ہوئے۔

یہ سب دیکھ کر میرا یہ یقین مزید پختہ ہو گیا کہ ہندوستان کی غلامی کی وجہ صرف باہمی اختلافات تھے۔

## آغا خان محل: ایک انتہائی خوبصورت عمارت

سلطان محمد شاہ آغا خان سوئم نے 1882ء میں اس محل کو تعمیر کیا۔ یہ محل ہندوستان کی تحریک آزادی کے بہت سے واقعات کا امین بھی ہے۔ انگریزوں نے مہاتما گاندھی، ان کی اہلیہ کنتور باگاندھی، ان کے سکریٹری مہادیو دیسائی اور سروجنی ٹائیڈو کو اسی محل میں قید کیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں کنتور یہ گاندھی اور مہادیو دیسائی کی موت بھی ہوئی۔ ان کی باقیات کو اسی عمارت میں محفوظ کر کے رکھا گیا ہے۔

یہ محل ایئر پورٹ سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

آغا خان محل کا کل رقبہ انیس ایکڑ جبکہ اس میں واقع عمارت تین لاکھ مربع فٹ پر مشتمل ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ اس علاقے میں قحط پڑ گیا۔ تو اس وقت کے آغانے اس محل کی تعمیر شروع کروادی۔ ایک ہزار لوگوں نے پانچ سال تک اسے تعمیر کیا۔ یوں آغانے غریب لوگوں کے لیے روزگار کا بندوبست کیا۔ آغا خان چہارم نے اسے بھارتی حکومت کے حوالے کر دیا اور اب یہ قلعہ گاندھی نیشنل میموریل سوسائٹی کا صدر مقام ہے جہاں گاندھی سے متعلق بہت سی اشیاء رکھی گئیں ہیں۔ اس محل کی تصاویر اسکی شان و شوکت بتانے کے لیے ناکافی ہیں۔۔۔

اسے دیکھنا ہی بنتا ہے، جو بد قسمتی سے میں نہ دیکھ سکا۔



Agha Khan Palace Pune Photo Credit:  
<https://www.tourmyindia.com>



Shaniwar Wada Pune Photo Credit:  
<https://www.tourmyindia.com>



## لال محل اور شائستہ خان

پونے جانے سے پہلے میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ مغل بھی کسی دور میں اس علاقے پر حکمرانی کرتے تھے۔ یہاں پر لال محل کے نام سے عمارت بھی موجود ہے جو شیواجی کے والد نے اپنی رہائش کے لیے بنوائی تھی۔ یہ زیادہ بڑی عمارت تو نہیں ہے لیکن اس سے ایک تاریخی بات ضرور جڑی ہوئی ہے۔ اورنگ زیب کے ایک چچا شائستہ خان (جو دکن کے گورنر تھے) کی یہاں پر شیواجی سے ایک لڑائی بھی ہوئی تھی۔



Lal Mahal Photo Credit:

<https://alchetron.com/Lal-Mahal>

کہتے ہیں کہ شائستہ خان (جو ایک بہت قابل گورنر تھا) کو شیواجی سے شکست ہوئی۔ شیواجی نے سزا کے طور پر اس کی انگلیوں کو خود اپنی تلوار سے کاٹ ڈالا۔ یہ کہانی کئی جگہوں پر لکھی ہوئی ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہونے کے باوجود ہم لال محل نہ دیکھ سکے۔

شائستہ خان کی تاریخ پڑھتے ہوئے معلوم ہوا کہ اس شکست کی وجہ سے اورنگزیب نے اسے بطور سزا بنگال کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ بنگال ان دنوں کافی مسائل کا شکار

تھا۔ اس کا اصل نام مرزا ابوطالب تھا۔ شائستہ خان کو بنگال میں بہت زیادہ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس نے بنگال کو ترقی کے اوج کمال تک پہنچایا۔ وہاں بھی اس کی بنائی ہوئی سات گنبدوں والی مسجد بے حد مشہور ہے۔ اس نے بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی لڑائی لڑی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مغل بادشاہ انگریزوں سے لڑنے کے حق میں نہیں تھے لیکن پھر بھی ان لڑائیوں کا آغاز شائستہ خان نے کیا۔ بنگال میں شائستہ خان کے دور کو بنگال کا سنہری دور کہا جاتا ہے اور انھیں بنگال میں بہت قدر کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔

یاد رہے یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب اورنگزیب حیات تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مراٹھوں نے اسی دور میں سر اٹھانا شروع کر دیا تھا اور پھر وہ یہاں سے چلتے ہوئے شمالی ہندوستان تک پہنچ گئے۔ شیواجی کی ذاتی رہائش گاہ کی وجہ سے پونے میں یہ محل بے حد مشہور ہے۔

## لوہا گڑھ قلعہ

اس علاقے میں ایک لوہا گڑھ نامی قلعہ بھی ہے جو پونے سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر سطح سمندر سے چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس قلعہ کو بھی ناقابلِ تخیل سمجھا جاتا رہا ہے تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قلعہ دو ہزار سال پرانا ہے۔ سترہویں صدی میں مغلوں نے اسے فتح کیا مغلیہ سلطنت کی کمزوری کے بعد حیدر آباد کے نظام بھی اس پر قابض رہے اور بعد میں مقامی مراٹھوں نے اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔ مراٹھوں کی ریاست میں اس قلعے کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔

اس کے علاوہ بھی اس علاقے میں کئی قابلِ ذکر اور تاریخی عمارتیں موجود ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے چند قابلِ ذکر عمارت کے نام یہ ہیں۔ پراواٹی محل، پٹالا شوار مندر، شیواجی پل، شنڈی چھتری، نیشنل وار میوزیم اور قبا کلی میوزیم وغیرہ۔



Lohagarh Fort Pune Photo Credit:  
<https://www.tourmyindia.com>

اب تک میں نے بھارت کے جو علاقے بھی دیکھے، ان میں سب سے زیادہ تاریخی مقامات پونے میں ہیں۔ جنگ و جدل اور علمی تاریخ رکھنے میں پونے کسی سے کم نہیں ہے۔

## ایک ناقابلِ فراموش کھانا

میں اور شاہ صاحب، بوائٹلر بنانے والی کمپنی کے دفتر میں چلے گئے۔ وہ ایک بہت بڑی کمپنی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس کے مالک کی کسی حادثے میں موت واقع ہو گئی تھی اور اب اُس کمپنی کو اُن کی بیٹی اور بیوی چلاتی ہیں۔ وہ کمپنی ایک سال میں ایک ہزار سے زائد بوائٹلر بناتی تھی۔ (یاد رہے یہ 2000ء کا واقعہ ہے اور اب یقیناً اس کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہوگا)۔ میں نے بوائٹلر بننے ہوئے بھی دیکھا جو کہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ وہاں سب کچھ بہت ہی متاثر کن تھا۔ (اس کی تفصیل شاید آپ کے لیے بہت زیادہ دلچسپی کا باعث نہ ہو)۔ دوپہر کا وقت ہوا تو مینجر صاحب کھانے کے لیے ہمیں ایک ریستوران پر لے گئے۔ وہ گوشت سے پرہیز کرتے تھے اور ہم نے بھی گوشت سے پرہیز پر ہی عافیت جانی۔

پونے کے اُس ریسٹوران کا کھانا مجھے اب تک یاد ہے جو سبز یوں اور دالوں پر مشتمل تھا۔ ابھی بھی میری یہ خواہش ہے کہ اگر کبھی مجھے دوبارہ بھارت جانے کا موقع ملے تو میں پونے کے اس ریسٹوران میں کھانا کھانے ضرور جاؤں۔ ایسا تجربہ نہ کبھی پہلے ہوا نہ اس کے بعد۔

مختصر یہ کہ جیسے ہی ہم بیٹھے تو ایک صاحب، جن کے پاس ایک ٹوکری میں بہت سی چھوٹی چھوٹی پیالیاں تھیں اور ان پیالیوں میں کئی قسم کی سبزیاں اور دالیں تھیں، ہمارے پاس آئے اور بتانے لگے کہ ان کے پاس کیا کچھ ہے۔ ہم اپنی مرضی کی چیزیں ان سے لے لیتے تھے۔ اسی طرح ایک صاحب کے پاس کئی قسم کی روٹیاں تھیں۔ روٹی بہت ہی چھوٹی تھی، اتنی چھوٹی کہ جس کے ایک یا دو لقمے بن سکتے تھے۔ انھوں نے کئی قسم کے اجناس سے روٹی بنائی ہوئی تھی۔ آپ اپنی مرضی کی روٹی لے سکتے تھے۔ ایک صاحب کے پاس درجنوں اقسام کی چٹی اور اچار تھے، وہ بھی آپ لے سکتے تھے۔ اسی طرح جو بھی صاحب آتے ان کے پاس بے شمار ورائٹی ہوتی۔ آپ یقین کریں کہ وہ سب کچھ اتنا خوبصورت اور ہمارے مزاج کے مطابق بنا ہوا تھا کہ ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔



Pune Restaurant 'Bullet Thali' Photo Credit:  
<https://www.news18.com>

میں نے دیکھا کہ عام طور پر بھارت میں ایسی جگہوں پر کھانے کے بعد میٹھا نہیں ہوتا جیسا کہ ہمارے ہاں اکثر ہوتا ہے۔ آخر میں ایک صاحب آئے تو مجھے لگا کہ یہ کوئی میٹھی چیز ہے (اس وقت مجھے شوگر کی بیماری لاحق نہیں ہوئی تھی)۔ میں نے اسے میٹھا سمجھ کر لے لیا۔ کھانے سے پتہ چلا کہ وہ تو کچھ اور ہی چیز تھی جو کھجڑی سے ملتی جلتی تھی لیکن اتنی مزیدار تھی کہ میں نے شاہ صاحب سے کہا کہ اگر آپ نے اسے نہ کھایا تو آپ کو بہت افسوس ہوگا۔ میرے کہنے پر انھوں نے کھایا اور خوب کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم ایک قریبی دکان پر چلے گئے تاکہ کوئی تحفہ وغیرہ خرید سکیں۔ دکان کے شروع میں ایک بڑا کتا بیٹھا ہوا ہے وہ پالتو کتا تھا جس نے سر ہلا کر ہمارا استقبال کیا (مجھے یوں ہی لگا)۔ دکان کی مالکن ایک گوری خاتون تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے جو خریدا تھا وہ خرید کر ان سے پوچھا کہ آپ یہاں پر کسی سلسلے میں ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ میں نے پونے کے رہنے والے ایک بھارتی سے شادی کی ہے اور اب یہیں رہتی ہوں۔

ہماری ٹرین کا ٹائم ہو رہا تھا لہذا ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔۔۔ کسی وجہ سے  
پونے کو بہت کم دیکھنے کا موقع ملا۔۔۔ اگر زندگی نے وفا کی تو پونے کو تفصیل سے دیکھنے  
ضرور جاؤں گا۔ انشاء اللہ!



Osho Ashram Pune Photo Credit:  
<https://www.tourmyindia.com>



Mulshi Dam Pune Photo Credit:  
<https://www.tourmyindia.com>



Mumbai to Pune Rail Track Photo Credit:  
<https://operfdoc.weebly.com>



A Muslim Peer Dargah in Pune



## ہریانہ: ایک نئی ریاست جو مذہب اور زبان کی بنیاد پر بنائی گئی

### دہلی سے ریواڑی براستہ گردو گرام

ممبئی سے واپس آ کر ہمیں ریواڑی کے پاس ایک گاؤں میں جانا تھا۔ (ریواڑی، ہریانہ اسٹیٹ کا ایک ضلع ہے)۔ دہلی سے ریواڑی اور ریواڑی سے بھی آگے ایک چھوٹے سے قصبے ”کاریہ“ تک کا ہمارا وہ سفر محترم شاہ صاحب کے آبائی گاؤں کو دیکھنے کے لیے تھا۔ شاہ صاحب کی دلچسپی اسی وجہ سے سب سے زیادہ تھی۔

سید انجم رفیق جعفری صاحب (شاہ صاحب) کا گاؤں ”کاریہ“ ریواڑی سے آگے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ ہم راستوں سے واقف نہیں تھے اس لیے میرے دوست آرائیس مانگٹ صاحب نے راہ نمائی کے لیے اپنے بیٹے کو ہمارے ساتھ بھیج دیا۔ ہم نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اس کے ذریعے دہلی سے ریواڑی اور ریواڑی سے کاریہ تک پہنچے۔ ریواڑی، دہلی سے اسی کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ تقسیم ہند کے وقت شاہ صاحب کی عمر دس سال تھی۔ انھیں بہت ساری باتیں تو یاد تھیں لیکن کچھ باتیں جو بعد میں انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنیں وہ بھی انھیں یاد تھیں۔

آج کا دن ان کی زندگی کا ایک یادگار دن تھا وہ اس جگہ جا رہے تھے جہاں ان کی پیدائش ہوئی اور انھوں نے زندگی کے پہلے دس سال گزارے تھے۔ اب اس واقعے کو 53 سال ہو چکے تھے۔ اتنے طویل عرصے کے بعد ان کے خاندان کا کوئی فرد ان کے آبائی گاؤں جا رہا تھا۔ میں ان کی جذباتی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس دوران انھوں نے بہت سارے شعر بھی کہے جو مکمل طور پر ان کے جذبات کی عکاسی تو نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں نمی کے ساتھ ضرور انصاف کر رہے تھے۔ دہلی کے بعد گردو گرام سے گزرتے ہوئے ہمارا سفر جاری تھا۔ ارد گرد کھیت اور بہت ساری ویرانی بھی دیکھنے کو ملی۔ ریواڑی،

راجستھان اور ہریانہ کی سرحد پر واقع ہے اس لیے یہاں پر بھی راجستھان جیسی زمین ہی ملتی ہے لوگوں کا رہن سہن راجستھانی تو نہیں تھا لیکن اس کے اثرات ضرورت محسوس کیے جاسکتے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو شاہ صاحب کے گاؤں کے متعلق بتاؤں میں چاہوں گا کہ ہریانہ، گروگرام اور ریواڑی کے بارے میں بھی کچھ باتیں آپکی خدمت میں پیش کروں۔ بہت سے اہم واقعات اور علاقوں کی وجہ سے یہ شہر تاریخ میں ایک اہم مقام بھی رکھتے ہیں۔

### ہریانہ: ایک ترقی یافتہ ریاست

ہریانہ بھارت کی 28 ریاستوں میں سے ایک اہم ریاست ہے جو ملک کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے۔ یہ پہلے پنجاب کا حصہ تھی۔ میں یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پاکستان میں جسے صوبہ کہا جاتا ہے، بھارت میں اسے سٹیٹ کہتے ہیں، جبکہ سٹیٹ کا ترجمہ ریاست کیا جاتا ہے۔ ریاست سے مراد ایک آزاد اور خود مختار علاقہ ہوتا ہے جیسے ماضی میں ہندوستان بھر میں ریاستیں تھیں۔ میں اس کتاب میں بھارت میں عمومی طور پر استعمال ہونے والی اصطلاح کو ہی ترجیح دے رہا ہوں اور صوبے کی بجائے سٹیٹ کا لفظ ہی استعمال کر رہا ہوں تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ یہ بھی یاد رہے کہ آئین اکبری میں مختلف علاقوں کے لیے صوبہ کا لفظ ہی استعمال کیا گیا ہے۔ امریکہ میں سٹیٹ کی اصطلاح ہی استعمال کی جا رہی ہے۔



Haryana Map Photo Credit:wikipedia

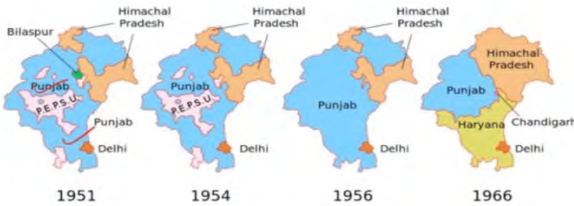
ہریانہ وہ سٹیٹ ہے جسے 1966ء میں پنجاب سے لسانی بنیادوں پر الگ کر کے ایک الگ سٹیٹ کا درجہ دیا گیا۔ بھارت کی آبادی کے اعداد و شمار کے مطابق ہریانہ میں توے فیصد سے زائد ہندو آباد ہیں جبکہ سکھ صرف پانچ فیصد کے قریب ہیں، اور ان کی اکثریت بھی صرف انہی اضلاع میں رہائش پذیر ہے جو پنجاب کی سرحد سے ملتے ہیں۔ پنجاب میں سکھوں کی آبادی ساٹھ فیصد کے قریب ہے اور ہندو تقریباً پینتیس فیصد ہیں اور مسلمان دو فیصد سے بھی کم ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ پنجاب میں توے فیصد لوگ پنجابی بولتے ہیں جب کہ ہریانہ میں ہندی بولی جاتی ہے۔ ہندی اور پنجابی زبان کی بنیاد پر پنجاب کا تقسیم ہونا بھی درست لگتا ہے لیکن سکھ اور ہندو مذہب نے بھی اس میں اپنا کردار ادا کیا۔

اپنی بات کے ثبوت کے طور پر میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ ساٹھ کی دہائی میں اکالی دل کے قائدین نے پنجابی صوبہ کی تحریک کا آغاز کیا (سکھوں نے اپنی تحریک کا

نام پنجابی صوبہ تحریک رکھا تھا)۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوؤں کے لیے ہندوستان، مسلمانوں کے لیے پاکستان تو پھر سکھوں کے لیے بھی ایک ملک ہونا چاہیے۔ اس سب کے پیچھے ان کی یہ خواہش موجود تھی کہ جب پنجاب میں سکھ اکثریت میں ہوں گے تو سکھوں کو اپنا سکھ لیڈر چننے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی۔ دوسری صورت میں ہندو اکثریت کی بنا پر ہمیشہ ہی اقتدار کے مزے لیں گے۔ پورے بھارت میں پنجاب اور کشمیر دو ایسی ریاستیں ہیں جہاں ہندوؤں کی اکثریت نہیں ہے۔

پنجابی صوبہ تحریک کے دوران اکالی دل کے کئی ہزار سکھوں کو احتجاج کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ کیا اس تحریک کو عوامی حمایت حاصل تھی یا صرف کچھ مخصوص لوگ ہی یہ تحریک چلا رہے تھے؟ یہ بھی ایک سوال ہے۔ 1957ء میں پنجاب میں انتخابات ہوئے جن میں اکالی دل نے حصہ نہیں لیا، اس کی کیا وجہ تھی؟ وہی بتا سکتے ہیں۔ اس الیکشن میں کانگریس کو 120 نشستیں ملیں اور انھوں نے پرتاپ سنگھ کیریون (ایک سکھ) کو وزیر اعلیٰ منتخب کیا۔ اس سے بھی پنجاب صوبے کی تحریک ختم نہ ہوئی۔

## PUNJAB 1951 TO 1966



Changes in Punjab from 1951 to 1966 Photo Credit:

<https://www.sikhteens.com>

یاد رہے جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں لکھا ہے کہ تقسیم ہند کے فوری بعد بھارت کے کئی علاقوں میں زبان کی بنیاد پر نئے صوبوں کی بات شروع ہو گئی جسے

نہرو سمیت کئی لوگوں نے ناپسند کیا تھا۔ وہ انتظامی بنیادوں پر تو نئے صوبوں کے حامی تھے لیکن زبان اور مذہب کی بنیاد پر نہیں۔ اکالی دل کی تحریک بھی دو قومی نظریہ کی طرح کی ہی ایک تحریک تھی، یعنی سکھوں کے لیے ایک الگ وطن ہو نا کیونکہ سکھ، ہندوؤں سے الگ قوم ہیں۔

ان کا یہ کہنا تھا کہ اگر دو قومی نظریہ کی بناء پر پاکستان اور بھارت دو الگ ملک بن سکتے ہیں تو سکھ اپنا ایک الگ ملک کیوں نہیں بنا سکتے؟ سکھ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے اور پنجاب ایک الگ صوبہ لے کر رہے۔ اس وقت کوئی نقل مکانی نہیں ہوئی لیکن جب اندار گاندھی کا قتل ہوا تو ہندوؤں کو سکھ اکثریتی صوبے (پنجاب) سے نقل مکانی ضرور کرنا پڑی۔ میں نے دہلی میں بیراجی سے متعلق لکھتے ہوئے آپ کو بتایا تھا کہ اندار گاندھی کے قتل کے بعد ہندوؤں نے کثیر تعداد میں پنجاب سے نقل مکانی کی۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ ہندو پنجاب میں اقلیت میں تھے۔

ہریانہ کا رقبہ چوالیس ہزار مربع کلومیٹر جبکہ اس کی آبادی تین کروڑ ہے۔ فی کس آمدنی کے لحاظ سے ہریانہ بھارت میں پانچویں نمبر پر ہے۔ اس کا جی ڈی پی بھارت میں بارویں نمبر پر ہے۔ ہریانہ نے دہلی کو تین اطراف سے گھیر رکھا ہے۔ اس کی تیز ترین ترقی میں اس کے محل وقوع کا بے حد عمل دخل ہے۔

ہریانہ ایک قدیم نام ہے جو ہزار سال پرانی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ اس نام کی دو وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ہریانہ سنسکرت کے ایک الفاظ ہری (ہندو دیوتا وشنو) اور آیانہ (گھر) سے مل کر بنا ہے، یعنی خدا کا گھر۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نام ہری، یعنی ہر اور ارنیا، معنی جنگل، یعنی ہر جنگل سے اخذ کیا گیا ہے۔ بہر حال اب اسے سب ہریانہ ہی کہتے ہیں۔ شاید کم ہی لوگوں کو ہی اس کے نام کی اصل وجہ معلوم ہو۔

آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے پتہ چلا کہ اس علاقے میں واقع ضلع حصار کے گاؤں راکی گڑھی اور ضلع فتح آباد کے بھیرانا میں وادی سندھ کی تہذیب سے متعلق چند ایسی چیزیں ملیں ہیں جو نو ہزار سال پرانی ہیں۔ اس علاقے میں کچی سڑکیں، نکاسی آب کا نظام، بارش کے پانی کو بڑے پیمانے پر جمع کرنے کے بندوبست کے ساتھ ساتھ مجسموں کی تیاری اور دھاتوں سے بنی اشیاء کا وجود یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ راکی گڑھی ہڑپہ کی تہذیب کی بنیاد مانی جاسکتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ویدک عہد کا آغاز بھی اسی علاقے سے ہوا۔ تاریخی کتب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے پر صدیوں تک ہندوؤں کی حکومت رہی جن میں پیشو بھٹی خاندان (شاید اسی سے بھٹی قبیلے کا آغاز ہوتا ہے، ممکن ہے یہ بات درست نہ ہو) ہر شا خاندان اور تومار خاندان قابل ذکر ہیں۔

تیمور نے 1398ء میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ وہ یہاں اپنی سلطنت قائم کرنے کے لیے تو نہیں آیا تھا اس کا کیا مقصد تھا؟ وہی بہتر جانتا تھا اس نے یہاں پر موجود بے شمار شہروں، عمارات اور قلعوں کو ضرور تباہ کیا۔ ان بد قسمت شہروں میں سرسا، فتح آباد، سنم، کیٹھل اور پانی پت بھی شامل ہیں۔ اس کے مظالم کی شدت جاننے کے لیے چند مثالیں ہی کافی ہیں۔



Temur in Dehli Photo Credit: <https://www.pinterest.com>

کہا جاتا ہے کہ جب وہ سرسوتی (سرسا) پہنچا تو وہاں کے باشندے اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ تیمور نے ان کا پیچھا کر کے ہزاروں افراد کو ہلاک کر دیا اور جو کچھ لوٹا جاسکتا تھا اسے لوٹ لیا۔ احراری میں کچھ لوگوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ شکست خوردہ فوج اس کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور مقابلے میں آنے کی سزا کے طور قصبے کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ تیمور کی فوج نے دو سو جاٹوں کا تعاقب کر کے انھیں مار ڈالا اور کئی لوگوں کو قیدی بنالیا اور ان کی بیویوں اور بچوں کو اپنا غلام بنالیا۔

وہ جہاں بھی گیا ایک داستانِ غم چھوڑ آیا!

افسوس اس پر ہے کہ اسے ابھی بھی کئی لوگ ایک عظیم مسلمان فاتح مانتے

ہیں!

یاد رہے پانی پت، جہاں کئی جنگیں ہوئیں اور جس نے ہندوستان کی قسمت کے فیصلے بھی کیے، بھی ہریانہ میں ہی واقع ہے۔ مجھے اس قصبے سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہریانہ کی آبادی تین کروڑ کے قریب ہے جس میں توڑے فیصد سے زائد ہندو ہیں۔ مسلمان آبادی کا سات فیصد ہیں اور وہ بھی زیادہ تر میو قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہریانہ، بھارت کی ایک اہم ریاست ہے۔ اس نے یہ سب کچھ کیسے حاصل کیا، اس سے متعلق جاننا ہمارے لیے بے حد مفید ہو سکتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق ریاست ہریانہ میں آبادی کا پچیس فیصد جاٹ لوگوں پر مشتمل ہے۔ پنجاب میں جاٹوں کی آبادی پینتیس فیصد ہے جبکہ دیگر قریبی ریاستوں میں جاٹوں کی آبادی پانچ سے دس فیصد کے درمیان ہے۔ ہریانہ کی سیاست میں جاٹوں کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ بھارت کے چھٹے وزیر اعظم، چرن سنگھ کا تعلق بھی ہریانہ کے ایک جاٹ خاندان سے ہی تھا۔

## گرو گرام: بھارت کا ساہر سٹی، جس کا پرانا نام گڑ گاؤں تھا

گرو گرام، بھارت کی ریاست ہریانہ میں دہلی اور ہریانہ کی سرحد پر دہلی سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک ترقی یافتہ شہر ہے۔ یہ شہر بھارت میں آئی ٹی کا دوسرا سب سے بڑا سنٹر ہے جس کی وجہ سے اسے بھارت کا ساہر سٹی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھارت کا تیسرا سب سے بڑا مالیاتی اور بینکاری مرکز بھی مانا جاتا ہے۔ یہاں پر موجود ہسپتالوں میں دنیا بھر سے لوگ علاج کی غرض سے آتے ہیں اس وجہ سے اسے بھارت کا سب سے بڑا طبی سیاحتی مقام بھی مانا جاتا ہے۔ گرو گرام میں بھارت کی پانچ سو سے زائد بڑی کمپنیوں کے مرکزی دفاتر بھی موجود ہیں۔ ریاست ہریانہ کی کل



آمدن کا ستر فیصد اسی شہر سے حاصل ہوتا ہے۔ اس شہر کو شمالی بھارت کی ہائی ٹیک انڈسٹری میں ایک نمایاں مقام بھی حاصل ہے۔

گروگرام کا علاقہ زمانہ قدیم سے آباد ہے۔ دہلی کی قربت کی وجہ سے اس کی آبادی میں بہت تھوڑا اضافہ ہوا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقے کسی دور میں کورو بادشاہی کا حصہ تھے۔ یہاں یادو نام کا ایک قبیلہ بھی آباد تھا۔ یادو نام کے لوگ اب بھی اس علاقے میں آباد ہیں۔ اس قصبے کا ذکر مہابھارت کی کئی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ ایک وقت میں چندرگپت موریہ کے زیرِ تخت بھی رہا ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخر، جب ابھی انگریزوں کا اس علاقے پر مکمل قبضہ نہیں ہوا تھا لیکن ان کا یہاں آنا جانا شروع ہو چکا تھا، میں اس علاقے میں ایک کیتھولک عیسائی عورت بیگم سومبر (Joanna Nobilis Sombre) بھی گزری ہے۔ پیدائشی طور پر وہ ایک کشمیری مسلمان خاتون تھی اور اس کا نام فرزانہ زیب النساء تھا، وہ ایک پیشہ ور راقصہ تھی۔ بعد ازاں اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور وہ بیگم سومبر کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اس کی زندگی کی کہانی نہایت ہی دلچسپ ہے۔ گروگرام سے متعلق پڑھتے ہوئے اس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کو ملا۔ یہ محبت، قربانی اور کامیابی کی کہانی ہے۔ اس کا مختصر ذکر پیش خدمت ہے۔

کہتے ہیں کہ لکسمبرگ سے آئے ہوئے ایک کرائے کے فوجی والٹر رین ہارڈ سومبر (Walter Reinhardt Sombre) نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو اس وقت بیگم سومبر (فرزانہ) کی عمر چودہ برس تھی۔ میں نے کئی جگہ پڑھا کہ اُس دور میں انگریز (ایسٹ انڈیا کمپنی) یورپ بھر سے کرائے کے فوجی بھرتی کر کے ہندوستان لاتے تھے۔ اس سے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کتنا خوشحال ملک تھا کہ جہاں یورپی لوگ نوکریوں کے لیے آتے تھے۔ حال ہی میں افغانستان میں بلیک وائر کی موجودگی بھی اس

بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کرائے کے فوجی رکھنے کا رواج نیا نہیں ہے بلکہ اب تک یہ سلسلہ چل رہا ہے۔

والٹر رین ہارڈ سومبر نے فرزانہ سے شادی کرنا چاہی، وہ ایک مسلمان خاتون تھی اس لیے شادی ممکن نہ تھی۔ فرزانہ نے شادی کی خاطر اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔ میرے علم کے مطابق یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی معروف شخصیت نے شادی کی خاطر اپنا مذہب تبدیل کیا ہو۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس یورپی فوجی نے کئی مہمات میں حصہ لیا اور ایک کامیاب فوجی بن کر ابھرا۔ اس کی کامیابیوں میں فرزانہ صاحبہ کا بے حد اہم کردار تھا۔ والٹر نے کثیر تعداد میں مال و متاع چھوڑا۔

بیگم سومبر ایک نہایت ہی عقلمند اور دلیر خاتون تھیں۔ 1778ء میں اپنے شوہر والٹر رین ہارڈ کی وفات پر بیگم سومبر اس کی وراثت کی مالک بن گئی اور اس نے اتر پردیش کے ایک علاقے سردھنہ، جس میں گروگرام بھی شامل تھا اور جو دہلی سے شمال مشرق کی طرف اسی کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے، میں اپنی ایک ریاست بنالی۔ یوں وہ پہلی عیسائی خاتون تھیں جو ہندوستان میں ایک ریاست کی ملکہ بنیں۔



This painting of Begum Samru and her household was done around 1830. The supreme commander of 3,000 troops, including many European mercenaries

Photo Credit: <https://www.nationalgeographic.com>

وہ جنوری 1837ء میں 85 سال کی عمر میں سردھنہ میں فوت ہوئیں۔ بیگم سو مہر کے سیاسی، جنگی اور سفارتی کارناموں پر مبنی کئی کہانیاں اور ناؤل لکھے گئے ہیں۔ اس نے کئی محل بھی تعمیر کروائے جن میں دہلی کے چاندنی چوک میں واقع سو مہر محل قابل ذکر ہے۔ گروگرام پر بھی بیگم سو مہر کا راج تھا۔ بیگم سو مہر کی زندگی پر پیچم ہوم نامی ایک ڈرامہ بھی بنایا گیا جو برطانیہ کی ایک کمپنی نے بنایا۔ اس میں بیگم سو مہر کا کردار بھارت کی ایک مشہور اداکارہ لارا دوتہ (Lara Dutta)، جو مس یونیورس بھی ہیں، نے ادا کیا۔ آج ہم اس شہر سے گزر رہے تھے جہاں اس کہانی نے جنم لیا تھا۔

بیگم سو مہر کی موت کے بعد 1836ء میں انگریزوں نے اس علاقے کا براہ راست کنٹرول سنبھال لیا۔ انھوں نے اس علاقے میں ناصرف سرکاری افسران کی کٹھیاں بنائیں بلکہ ایک چھاؤنی بھی قائم کی۔ گروگرام میں انگریزوں اور مغلوں کے دور کی کئی قابل دید تاریخی عمارات موجود ہیں۔ دہلی، جہاں کئی سو سال تک مسلمان حکمران رہے، کے قریب ہونے کے باوجود بھی اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ فیصد کے قریب ہے۔ سکھ ایک فیصد، عیسائی نصف فیصد جبکہ ہندوؤں کی تعداد نوے فیصد سے زائد ہے۔ گروگرام کی آبادی دس لاکھ سے زائد ہے۔ اس کا جی ڈی پی ایک سو بیس بلین ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ اس علاقے میں پانچ سو سے زائد بڑی کمپنیوں کی موجودگی ہے۔

گروگرام کے قرب و جوار میں کئی اہم مقامات ہیں جن میں قطب خاں کا مقبرہ، فرخ کا قلعہ اور کئی قدیمی مندر بھی شامل ہیں جو اس علاقے کی اہمیت کو دوگنا کرتے ہیں۔

جب ہم گروگرام کر بازار سے گزر رہے تھے تو اس وقت میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہر طرف جس قدر خوشحالی نظر آ رہی تھی وہ بھارت کے اب تک سفر میں دیگر جگہوں پر کم ہی نظر آئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک نیا بھارت ابھر رہا ہے۔ جو بھارت کے دیگر علاقوں سے بالکل ہی مختلف تھا۔ اس سے میں بھارتی معاشرے میں بڑھتے ہوئے خلاء کو واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔



Puran Qila in Gurugram Area Photo Credit:  
<https://www.fabhotels.com>



Amber Fort Near Gurugram Photo Credit:  
<https://www.fabhotels.com>



Nahar Garh Fort Photo Credit: <https://www.fabhotels.com>



Farkh Nagar Fort Photo Credit:  
<https://www.thrillophilia.com>

## ریواڑی: صدیوں سے آباد ایک شہر

اگر آپ کبھی ملتان گئے ہوں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں ریواڑی کے نام سے مٹھائی کی دکانیں موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کا تعلق ریواڑی سے ہی ہوگا۔ ہجرت کے بعد ان لوگوں نے ملتان میں اپنے شہر کے نام پر ہی اپنے کاروبار کا نام رکھا ہوگا۔ یہ اپنے شہر سے محبت کا ایک انداز ہوتا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ ہجرت کے بعد میرے والدین سرہند سے آکر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد ہوئے، اس وجہ سے آج بھی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں لوگ ہمیں سرہندی کہہ کر ہی بلاتے ہیں۔ سرہند کے رہنے والوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک نئی کالونی آباد کی جس کا نام سرہند کالونی ہی رکھا۔ اپنے وطن کو یاد رکھنا ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ ہمارے شہر کے ایک معروف دینی راہنما اور نہایت ہی قابل احترام شخصیت، مفتی عبد الحمید صاحب بھی اپنے نام کے ساتھ لدھیانوی لکھتے تھے، جس کی وجہ یہی تھی کہ وہ لدھیانہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔

اگر کبھی آپ اس بات پر غور کریں تو آپ کو امریکہ میں بہت سارے نام ایسے ملیں گے جن کے ساتھ ”نیو“ لگا ہوتا ہے جیسے، نیویارک، نیوجرسی، نیوہمپشائر۔ نیویارک امریکہ میں ہے جبکہ یارک انگلینڈ میں، نیوجرسی امریکہ میں ہے جبکہ جرسی انگلینڈ میں موجود ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے نیویارک ان لوگوں نے بسایا جو یارک (برطانیہ) سے گئے تھے۔ میں نے یارک شہر بھی دیکھا، جسے رومیوں نے آباد کیا تھا۔ ابھی بھی اس شہر میں جگہ جگہ رومیوں کے مجسمے نظر آتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے آبائی علاقے کو بھول نہیں پاتا اور اسے بھولنا بھی نہیں چاہیے۔

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ مہابھارت کے زمانے میں ریواٹ نامی بادشاہ کی ایک بیٹی تھی جس کا نام ریواٹی تھا۔ والد اسے ریوا کہتے تھے، اور اس کے نام پر ایک شہر ”ریواواڑی“، یعنی ریوا کا واڑا، یا علاقہ، کی بنیاد رکھی جو آج ریواڑی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ریواڑی میتل کے برتنوں کی روایتی صنعت کی وجہ بھارت بھر میں جانا جاتا ہے۔

## ریواڑی: شہاب الدین غوری سے انگریزوں تک

کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ریواڑی ہی وہ علاقہ ہے جہاں ہندو مذہب کا آغاز ہوا یا ہندو مذہب کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا گیا۔ میں اس بات کا مختصر ذکر پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔ مسلمان حملہ آوروں سے قبل یہ علاقے صدیوں تک ہندو راجاؤں کے تحت رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے پر پہلا حملہ ابراہیم نامی ایک مسلمان نے کیا۔ میرا خیال ہے وہ صاحب غوری کے ساتھی تھے۔ انھوں نے ریواڑی سے تیس کلو میٹر دور ایک قلعے پر قبضہ بھی کیا لیکن وہ قبضہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ بعد ازاں ابراہیم، دہلی کے تومارا حکمران انگاپالا کے ہاتھوں شکست کھا کر ایک جنگ میں مارا گیا۔

شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد، ان کے ایک جرنیل، قطب الدین ایبک نے 1206ء میں ہندوستان میں پہلی مسلمان سلطنت کی بنیاد رکھی دلی کے قریب ہونے کی وجہ سے ریواڑی پہلی مسلمان ریاست کا حصہ بھی بنا۔ اس کے بعد کئی مسلمان حکمرانوں نے اس علاقے پر حکومت کی جن میں التمش، مملوک، علاؤ الدین خلجی اور تغلق حکمران قابل ذکر ہیں۔ طویل عرصے تک یہ علاقے آزاد رہے لیکن کب تک؟ ایک وقت آیا جب 1450ء میں بہلول لودھی نے یہاں لودھی خاندان کی حکومت کا آغاز کیا وہ عرصہ اسی سال پر محیط ہے۔



لودھی خاندان نے افغانوں کے قبضے کو مزید بہتر بنانے کے لیے شیر شاہ کے دادا، ابراہیم خان سوری کو ریواڑی میں ایک بڑی جاگیر بھی دی۔ جب بابر نے لودھی کو شکست دے کر دلی پر قبضہ کیا تو دوسرے علاقوں کے ساتھ ساتھ ریواڑی پر بھی اس کا حکم چلنے لگا۔ ہمایوں کی شکست کے بعد شیر شاہ سوری بھی اس علاقے کا حاکم بنا۔ بھارت کی طرف سے ہریانہ کے بارے میں شائع شدہ مواد کے مطابق سوری کے دور کو یہاں کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اسی دور میں ریواڑی کا رہائشی ہیم چندر (جسے ہیمو کہا جاتا ہے) بھی منظر عام پر آتا ہے۔

بھارت کے چار سفر حصہ دوم میں نے ہیم نامی ایک شخص کا ذکر کیا تھا جو کچھ دنوں کے لیے دلی کی گدڑی پر بیٹھا تھا۔ اس کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ اس نے ریواڑی میں توپ بنانے کی ایک فائونڈری بھی بنائی ہوئی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے مغلیہ سلطنت کی دشمنی میں شیر شاہ سوری کو بڑی مقدار میں توپ اور بندوقیں مہیا کی تھیں۔ اس کے بدلے وہ سوری خاندان کا ایک اہم درباری بھی رہا۔ اس کا مکان شہر کے قطب پور علاقے میں آج بھی موجود ہے۔ یہ عمارت فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اکبر کے دور میں ریواڑی صوبہ دہلی میں شامل تھا۔ یہاں کے لوگ مغلوں کے ساتھی تھے اسی لیے انھوں نے سترہویں صدی میں نند رام، جس کا تعلق آہیر قبیلے سے تھا، کو اس علاقے کا حاکم مقرر کیا۔ یہ ریاست (جاگیر) انیسویں صدی تک قائم رہی۔

ریواڑی ریاست کے ایک راجہ میتراسین نے 1781ء میں جے پور کے حکمرانوں کو اس وقت شکست دی جب انھوں نے ریواڑی پر حملہ کیا۔ اس حکمران کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس نے 1785ء میں اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل مراٹھوں کے حملے کو بھی ناکام بنایا تھا۔

مغل سلطنت کے خاتمے کے نتیجے میں ریواڑی پر مراٹھوں کا راج ہو گیا لیکن وہ قبضہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ 1808ء میں انگریزوں نے ریواڑی اور تیج سنگھ کی ریاست پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ یہ ریاست رقبہ کے لحاظ سے ایک چھوٹی ریاست تھی لیکن اس کے حکمران نے 1857ء کی جنگ آزادی میں بڑا اہم کردار ادا کیا، جس کی پاداش میں انگریزوں نے اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ جنگ آزادی کے اس ہیرو کا مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے، جو اس کا حق اور میرا فرض بنتا ہے۔۔۔

یہ اس لیے بھی ہے تاکہ لوگ جان سکیں کہ آزادی ہند کی خاطر کس نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے۔

### راؤ تولارام سنگھ (1825-1863) جنگ آزادی کا ایک نامور ہیرو

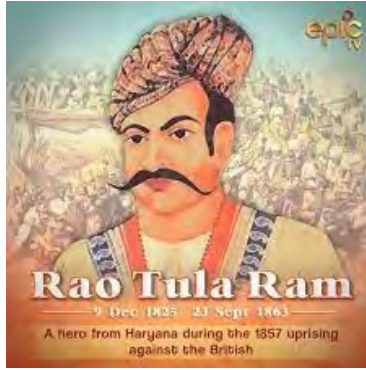
راؤ تولارام سنگھ آہیر خاندان کی طرف سے ریواڑی کا حاکم تھا۔ اسے 1857ء کی ہندوستانی بغاوت کے ایک اہم راہ نمائی حیثیت بھی حاصل ہے۔ انھیں ہریانہ میں ایک ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ ریواڑی میں ان کے نام سے ایک اسٹیڈیم اور دہلی میں ایک ہسپتال بھی بنایا گیا ہے۔ وہ 1825ء میں ریواڑی کے نواحی علاقے رام پورہ کے آہیر خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پورن سنگھ تھا۔ والد کی وفات کے بعد وہ آہیر خاندان کا سربراہ بنا۔ آہیر خاندان اور اس ریاست سے متعلق میں نے جو کچھ بھی پڑھا، اس کے مطابق یہ چھوٹا سا علاقہ تھا اور میں اسی لیے اسے ایک جاگیر طرز کی ریاست سمجھتا ہوں۔ میری معلومات کے مطابق آہیر، گجر قبیلے کی ایک شاخ ہے۔

جب 1857ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا تو راؤ تولارام سنگھ نے اپنے کزن راؤ گوپال دیو اور چارپانچ سوساتھیوں سمیت انگریزوں کے مقرر کردہ مقامی افسروں کو بے دخل کر کے ریواڑی شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہ ایک طرح سے آزادی کا

اعلان تھا۔ اس فتح سے حوصلہ پا کر راولپور اور رام سنگھ نے پانچ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل اپنی ایک فوج تیار کی، فوجی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بدوق اور دیگر گولہ بارود تیار کرنے والا ایک کارخانہ بھی بنایا۔ دلی کے قریب ہونے کی وجہ سے وہ انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے والی، بہادر شاہ اور دیگر باغی، قوتوں کی مدد کے لیے سب سے پہلے دلی بھی پہنچے۔ انھوں نے جہل جنت خان کو ایک کثیر رقم اور بڑی مقدار میں جنگی سامان کے ساتھ ساتھ دو ہزار بوری گندم بھی فراہم کی۔

نومبر 1857ء میں اس چھوٹی سی فوج نے انگریزوں کی تربیت یافتہ فوج کے خلاف، جس میں اکثریت ہندوستانی لوگوں کی ہی تھی، نارنول کے مضافات میں نصیب پور کے میدان میں لڑائی لڑی۔ اس جنگ میں راولپور اور رام سنگھ ان فوجوں کی قیادت کر رہا تھا جس نے انگریزی فوج کو شکست دی۔ اس جنگ میں متعدد برطانوی افسر ہلاک یا زخمی ہوئے۔ یہ وہ موقع تھا جب انگریزوں کو پے در پے شکست ہو رہی تھی۔

اگر اس موقع پر مقامی ریاستیں مل کر کاروائی کرتیں تو انگریزوں کی شکست یقینی ہوتی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس موقع پر انگریزوں کی فتح نے دلی پر ان کی حکمرانی کو حقیقت میں بدل دیا!



Rao Tula Ram Photo Credit: <https://m.facebook.com>

انگریز اس شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے جوابی کارروائی کی۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد راؤ تولارام سنگھ راجستھان چلے گئے اور ایک سال تک تانیا ٹوپے کی فوج کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ انگریزوں نے راجستھان میں سیکر کی لڑائی میں فتح حاصل کی۔ ان حالات میں راؤ تولارام نے شاہ ایران سے مدد لینے کے لیے ایران کا سفر بھی کیا۔ انھوں نے افغانستان کے امیر، دوست محمد خان سے بھی ملاقات کی اور مدد کی اپیل کی لیکن وہ سب بے سود ثابت ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے روس کے شہنشاہ دوم سے بھی رابطہ کیا لیکن وہاں بھی کچھ نہ بن سکا۔ اسی تگ و دو کے دوران 1863ء میں کابل میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک جنگ میں شدید زخمی ہو گئے تھے اور اپنے علاج کے لیے کابل گئے تھے، کیا سچ ہے کیا نہیں، یا دونوں باتیں ہی سچ ہیں کہ وہ علاج کے لیے گئے اور ساتھ ساتھ انھوں نے دیگر کام بھی کیے۔ اس طرح جنگ آزادی کا ہیرو ایک غلام ملک کی بجائے ایک آزاد ملک (افغانستان) میں دم توڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی فوج بھی بکھر گئی۔ آزادی کی جنگ لڑنے کے جرم میں انگریزوں نے راؤ تولارام سنگھ کی تمام تر جائداد کو ضبط کر لیا۔

بعد ازاں ان کے بیٹے نے جب انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلوا یا تو ان کی جائیداد واپس کر دی گئی اور اسے ریواڑی کا حاکم بھی تسلیم کر لیا گیا۔

اسے کیا کہیں؟ انگریزوں سے وفا یا ہندوستان سے بے وفائی یا ذاتی مفادات کا تحفظ، یا علاقے کے لوگوں کو انگریزوں کے ظلم و ستم سے بچانے کی ایک چال؟

حکومت ہند نے راؤ تولارام سنگھ کی تصویر والا ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا۔ راؤ تولارام سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی یاد میں ریواڑی شہر کے نواحی علاقے رام پورہ میں اب بھی ہر سال دو روزہ میلہ لگتا ہے جسے شہیدی میلہ کہتے ہیں۔

ہیروز کو یاد رکھنا نئے ہیروز پیدا کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے!

پہلی جنگ عظیم کے دوران، ہریانہ کے دوسرے اضلاع کی طرح ریواڑی کے لوگوں نے بھی انگریزوں کی دل و جان سے مدد کی۔ جنگ کے بعد انگریزوں نے مدد کرنے والے لوگوں اور بڑے بڑے زمینداروں کو جاگیر بھی دیں۔ یہ علاقہ سیاسی طور پر بھی بے حد متحرک رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران علاقے کے لوگوں نے حکومت کی جنگی کوششوں کی مخالفت کی۔ اس علاقے کے لوگوں کی کثیر تعداد سبھاس چندر بوس کی فوج میں بھی موجود تھی۔ بھارتی فوج میں ریواڑی سے تعلق رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد آج بھی موجود ہے جو اس علاقے کے لوگوں کی بہادری کی زندہ مثال ہے۔

میری معلومات کے مطابق ریواڑی وہ واحد ضلع ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی ایک فیصد سے بھی کم ہے جبکہ ہندو آبادی کا ننانوے فیصد ہیں۔ یاد رہے ضلع ریواڑی کی کل آبادی نولاکھ کے قریب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی انتہائی حیران کن تھی کہ پنجاب بالکل ساتھ ہونے کے باوجود سکھوں کی آبادی صرف 0.20 فیصد ہیں۔ ان سب باتوں سے لگتا ہے کہ یہ علاقہ اُن جگہوں میں سے ہے جہاں ہندوؤں کی اکثریت سب سے زیادہ ہے۔

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں لکھا کہ تیرہویں صدی کے آغاز میں ہی اس علاقے پر ایک نے حکمرانی شروع کر دی تھی۔ اس کے بعد مسلمان ہی زیادہ تر اس علاقے کے حکمران رہے۔ دلی سے سو کلو میٹر سے بھی کم فاصلے پر واقع ہونے کے باوجود پھر بھی مسلمانوں کی آبادی اس قدر کم کیوں ہے؟ اس کی ایک وجہ تو تقسیم ہند کے وقت یہاں سے کثیر تعداد میں مسلمانوں کی ہجرت ہو سکتی ہے اور دوسری وجہ اس علاقے کے ہندوؤں کا رویہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے آریہ سماج تحریک میں ریواڑی کے کردار کو سمجھنا ضروری ہے۔

آریہ سماج نامی تحریک کا آغاز دیانند سرسوتی نے 10 اپریل 1875ء کو ممبئی میں کیا۔ اس تحریک کا مقصد ہندومت کو ایک مذہب میں تبدیل کرنا تھا۔ جب اس تحریک نے ہریانہ میں زور پکڑنا شروع کیا تو اس وقت اس کے بانی، سوامی دیانند سرسوتی نے ریواڑی کا دورہ کیا۔ جس سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ریواڑی آریہ سماج تحریک سے کس قدر متاثر تھا۔

ایک نامور مؤرخ، کے سی یادو نے لکھا کہ دیانند کو ہریانہ کا دورہ کروانے میں راؤ یو دیشٹر سنگھ (راؤ تولارام کا بیٹا) پیش پیش تھا، جسے 1857ء کی جنگ کا ہیر و تصور کیا جاتا ہے۔ اس دورے کے نتیجے میں ریواڑی کے اندر سوامی دیانند گؤشالا بھی قائم کیا گیا۔ یاد رہے کہ یہ پہلا گؤشالا تھا جو شمالی ہندوستان میں قائم کیا گیا۔ اس سے آپ ہندوؤں کے نزدیک ریواڑی کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

معاشرتی معاملات کی اصلاح بھی آریہ سماج کے مقاصد میں شامل تھی۔ اس تحریک نے کم عمری میں بچوں کی شادی، خواتین کی غیر مساوی حیثیت، دوسری ذات میں شادی اور بیوہ خواتین کی دوبارہ شادی جیسے مسائل پر بھی بات کی۔ آریہ سماج کے قائدین کی تعلیم کے میدان میں کارکردگی کو بھی ایک طبقہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

آریہ سماج کے بانی نے پنجاب بھر میں اس کی شاخیں قائم کیں۔ ان شہروں میں لاہور، جالندھر، امرتسر، گوجرانوالہ، لائل پور، لدھیانہ، امبالا اور گروگرام شامل ہیں۔



Ideology of Arya Samaj Photo Credit:  
<https://www.facebook.com>

ہریانہ میں جاٹوں کی شناخت کا کام آریہ سماج تحریک کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس تحریک نے جاٹوں سے متعلق ایک عام تاثر، جس کے مطابق یہ لوگ متشدد اور جنگجو مانے جاتے تھے، کو ختم کرنے کے لیے بے حد کام کیا۔ جاٹوں میں آریہ سماج کی کامیابی کی وجہ اس تحریک کے بانی کی برہمن دشمنی تھی۔ وہ برہمنوں کے طریقے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس وقت ہریانہ کے جاٹ برہمنوں کی مذہبی سختیوں سے بے حد نالاں تھے۔ انھیں آریہ سماج کی صورت میں ایک ہمدرد نظر آیا۔

رام جی لال ہودا، آریہ سماج کی تحریک کا حصہ بننے والے پہلے جاٹ تھے۔ لالہ راجپت رائے انھیں آریہ سماج کا پہلا جاٹ کہتے ہیں۔ بعد ازاں لالہ رام جی نے اپنی جاٹ برادری میں اس تحریک کو بڑے پیمانے پر متعارف کروایا اور آریہ سماج کے نظریے کو عام کرنے کے لیے جاٹ سبھاس اور مہا سبھاس جیسی تنظیموں کو منظم کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک کا مقصد ان لوگوں کو ہندو دھرم میں واپس لانا بھی تھا جو کسی وقت

مسلمان یا عیسائی ہو گئے تھے۔ اس کام کے لیے انھوں شدھی سبھاس میں شمولیت اختیار کی اور اس کے مقامی صدر بھی بن گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آریہ سماج کی تحریک نے ہریانہ میں کاشتکاری کرنے والے جاٹوں کی پسماندگی کو دور کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس وجہ سے اسے جاٹ برادری میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج بھی ہریانہ کے تقریباً ہر شہر میں آریہ سماج کے مندروں اور تعلیمی اداروں کا وجود ان کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس علاقے میں آریہ سماج اور شدھی کی تحریکوں کی مقبولیت بھی ریواڑی میں مسلمانوں کی تھوڑی آبادی کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔ مجھے اپنے اس خیال کے حق میں کسی دوسرے کی رائے نہیں ملی۔





Rewari Rail Museum Photo Credit:  
<http://jeetrew.blogspot.com>



Rewari Sweet in Multan Photo Credit:  
<https://mobile.twitter.com/multanisoghat>

کاریہ: جہاں سولہویں صدی میں شاہ صاحب کے بزرگ آکر آباد ہوئے

جیسے ہی ہم ریوڑی سے نکلے تو محترم شاہ صاحب کے جذبات میں مزید شدت آ گئی۔ میں ان کے احساسات محسوس کر رہا تھا۔ انھیں وہ سب کچھ یاد آ رہا تھا جو آج سے پچاس سال پہلے بیٹا تھا۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ ایک شخص طویل عرصے بعد اس علاقے میں آئے جہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو اور زندگی کے پہلے دس سال گزرے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ جہاں اس کے آباؤ اجداد کی قبریں بھی موجود ہوں، جذباتی کیفیت ہونا ایک فطری عمل ہے۔

شاہ صاحب کو یہ یاد تھا کہ ریوڑی کے بعد تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع اٹلی منڈی کے پاس ریلوے لائن کے ساتھ ایک جگہ پتھروں کی سلیب بنانے کا کام ہوا کرتا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اب بھی وہاں پر یہ کام ہو رہا تھا۔ وہ سب دیکھ کر شاہ صاحب بے حد خوش ہوئے۔ انھیں یہ بھی یاد آیا کہ یہ وہی ریلوے سٹیشن تھا جہاں سے انھوں نے ریل پکڑ کر پاکستان ہجرت کی تھی۔ ایک صاحب سے راستے کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اٹلی سے آپ دائیں مڑ کر سات کلومیٹر کے فاصلے پر کاریہ گاؤں ہے۔ اس طرح ہم کاریہ، جو ہماری منزل تھا، پہنچ گئے۔

جوں جوں کاریہ قریب آتا جاتا، شاہ صاحب کی آنکھوں میں نمی بھی بڑھتی جاتی تھی۔

کاریہ، ہریانہ کے ضلع مہندر گڑھ میں واقع ہے۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ ان کے بزرگ سید ابراہیم صاحب، اکبر کے دور میں اس گاؤں میں آکر آباد ہوئے تھے۔ جس طرح ہمارے ہاں سڑک کے کنارے پر واقع گاؤں کا جو حال ہوتا ہے وہی کاریہ گاؤں کا بھی تھا۔ ریل سڑک دس سے بارہ دکانیں تھیں جن کے پیچھے گاؤں تھا۔ میرے اندازے کے

مطابق اس کی آبادی تقریباً بارہ سو ہوگی۔ ہم نے وہاں پر بیٹھے لوگوں سے اس بات کی تصدیق کی کہ کیا یہی کاریہ گاؤں ہے؟

ایک صاحب نے اس بات کی تصدیق کی اور ساتھ ہی پوچھا کہ آپ کو کس سے ملنا ہے؟ شاہ صاحب نے بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں اور میرے آباؤ اجداد اس گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کے نام بھی بتائے۔ یہ بات سن کر کئی لوگ ہمارے قریب آ گئے۔ جن میں کچھ بڑی عمر کے لوگ بھی تھے۔ انھوں نے بھی شاہ صاحب کے آباؤ اجداد کے بارے میں سن رکھا تھا۔ نوجوان بھی شاہ صاحب سے والدین سے متعلق تھوڑی بہت معلومات رکھتے تھے۔ کچھ لوگوں نے شاہ صاحب سے تصدیق کی اور ان کے آباؤ اجداد کے بارے میں کچھ سوالات بھی پوچھے۔ جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ شاہ صاحب ہی ان بزرگوں کی اولاد ہیں جن کا تعلق اس گاؤں سے تھا اور جن کی قبریں اب بھی اس گاؤں میں موجود ہیں تو وہ یہ سب جان کر بہت خوش ہوئے اور ہماری بہت زیادہ آؤ بھگت کی۔

ہم کچھ دیر ان کے ساتھ کھڑے رہے اور پھر ان سے درخواست کی کہ ہم گاؤں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر کچھ لوگ، جو اسی گاؤں کے رہنے والے تھے، وہ ہمارے ساتھ گاؤں کی طرف چل پڑے۔ مجھے اب تک یاد ہے اس کی گلیاں کافی کھلی تھیں۔ اکثر مکان ایک منزل پر مشتمل تھے۔ کچھ مکان پختہ اور کچھ مکان کچی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو ایک بڑے چوراہے پر شاہ صاحب نے اشارے سے بتایا کہ اس خالی جگہ پر ان کا مکان ہوا کرتا تھا۔ ہمارے ساتھ چلنے والے ایک صاحب نے اس بات کی تصدیق کی یہاں پر ہی آپ کا گھر تھا لیکن اب وہ جگہ خالی تھی۔

ابھی ہم وہاں پر کھڑے ہی تھے ایک بوڑھی عورت ہمارے پاس آ گئی اور اس نے شاہ صاحب سے بات کرنا شروع کی۔ اس عورت نے شاہ صاحب کی والدہ کا نام لیکر

پوچھا۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ میں انھی کا بیٹا ہوں لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میرے والدین اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ یہ سن کر اس بوڑھی عورت نے افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ میری بہت ہی گہری سہیلی تھیں۔ شاہ صاحب نے پوچھا کہ ہمارے گھر میں ایک نیم کا درخت بھی تھا۔ اس بوڑھی عورت نے بتایا کہ وہ درخت موجود تھا لیکن اب نہیں ہے۔ یہ سن کر شاہ صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر بولے کہ مجھے یاد ہے کہ جب ہم اس گھر سے جا رہے تھے تو میری والدہ محترمہ اس درخت سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی تھیں۔

شاہ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب ہم جا رہے تھے اس وقت میری عمر صرف دس برس تھی، لیکن میرے بڑے بھائی اور باقی عزیز واقارب جو مجھ سے بڑی عمر کے تھے، وہ گاؤں کے لوگوں سے گلے مل کر دور رہے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ جو جا رہے ہیں وہ شاید کبھی دوبارہ نہ آئیں۔ یہ باتیں کرتے وقت شاہ صاحب کی آواز رندھ گئی۔ وہ سب دیکھ کر میں نے انھیں آگے چلنے کے لیے کہا۔

ہم جس چوراہے پر کھڑے تھے اس سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک چبوترہ تھا جس پر چند قبریں موجود تھیں۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ یہ قبریں آپ کے آباؤ اجداد کی ہیں۔ میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ ابھی تک وہ چبوترہ محفوظ تھا۔ قبروں کی نشانیاں بھی موجود تھیں۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی تو ہے جو پچھلے پچاس سال سے ان قبروں کی حفاظت کر رہا ہے۔ کیونکہ اگر آپ ہر سال قبروں کی لپائی نہ کریں تو وہ برے موسمی حالات کا چھین سال تک مقابلہ نہیں کر سکیں۔ قبروں کو مناسب حالت میں دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ ہم نے دعا مانگی اور تصاویر بھی بنوائیں۔ شاہ صاحب نے ان قبروں کے پاس کھڑے ہو کر جو تصویر بنائی اسے اپنی ایک شعر و شاعری کی کتاب کے سرورق کے طور پر استعمال کیا۔ حال ہی بھی یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ گاؤں کے کچھ لوگوں نے ان قبروں پر

چھت ڈال کر انھیں ایک مزار کی شکل دے دی ہے اور منت وغیرہ ماننے کا کام شروع ہو گیا ہے۔

قبروں کے مغرب کی طرف ایک مسجد بھی موجود تھی۔ مسجد کا ڈھانچہ تو موجود تھا لیکن جب اسے قریب سے دیکھا تو اس کے ہال میں جلانے کی لکڑیاں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ ہمیں وہ سب دیکھ کر دھچکا لگا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا کوئی مسلمان اس گاؤں میں نہیں رہتا؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ کے جانے کے بعد جو مسلمان باقی رہ گئے تھے وہ بھی اُن علاقوں میں چلے گئے جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ اس لیے اس گاؤں میں اب کوئی مسلمان بھی باقی نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ مسجد ویران ہے۔

مسجد اور قبروں کی زیارت کے بعد ہم اس جگہ پر واپس آ گئے جہاں کسی زمانے میں شاہ صاحب کا گھر ہوا کرتا تھا۔ اس گھر کے سامنے والے گھر کی خواتین نے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اس وقت تک تقریباً پچاس لوگ ہمارے ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ ہم سب ان کے گھر چلے گئے۔ انھوں نے ہمیں چار پائیاں مہیا کیں۔ چائے کا پوچھا، اس کے لیے ہم نے معذرت کر لی لیکن انھوں نے ہمیں پیٹل کے گلاسوں میں پانی ضرور پلایا۔ مجھے یاد آیا کہ جب ہمارے دیہاتی علاقوں میں شیشے کے گلاس شروع نہیں ہوئے تھے تو پیٹل کے گلاسوں میں ہی پانی پیا جاتا تھا۔

وہاں پر کئی عورتیں جمع ہو گئیں۔ انھوں نے شاہ صاحب سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ کوئی کہہ رہی تھی کہ آپ کی والدہ میری سہیلی تھی، تو کوئی یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کی چچی سے مجھے بہت پیار تھا۔ کسی نے کہا کہ بیماری کی صورت میں ہم آپ کے بزرگوں سے دم کرواتے تھے۔ بات سے بات نکلتی جا رہی تھی۔ شاہ صاحب درمیان میں موجود تھے۔ میں صرف باتیں سننے میں مصروف تھا۔ میرے دماغ میں بھی یہی باتیں چل رہی تھیں کہ کل جب میں اپنی والدہ کے گاؤں جاؤں گا تو وہاں کی عورتیں بھی

میری ماں سے متعلق اسی طرح کی باتیں کریں گی۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ پھر ہم نے ان سے اجازت لی اور اڈے کی طرف چل پڑے۔

لوگ ہم سے باتیں کر رہے تھے، کوئی پاکستان کا پوچھتا تو کوئی عزیز واقارب کا۔ ایک صاحب، جن کی عمر پچاس کے قریب ہو گئی اور وہ تھوڑے پڑھے لکھے بھی لگ رہے تھے، انھوں نے ہم سے بات شروع کی۔ وہ ایسی بات تھی جس کا ذکر میں نے جہاں بھی کیا تو اس نے حیرت کا اظہار ہی کیا۔

ان صاحب نے پوچھا کہ محترم شاہ صاحب آپ اس گاؤں سے کیوں گئے؟

شاہ صاحب نے جواب دیا کہ جب آپ نے ہمیں مارنا شروع کیا اور ہمارے گھروں کو لوٹنا شروع کیا تو ہمارے پاس پاکستان جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ بات سن کر اس شخص نے جواب دیا کہ میں اس وقت بہت بڑی عمر کا تو نہیں تھا لیکن جو بات مجھے میرے بزرگوں نے بتائی، اس کے مطابق آپ کے بزرگ کئی صدیاں قبل اس علاقے میں آئے اور یہاں ایک مسجد بنائی۔ عام لوگ (ہندو اور مسلمان) انھیں بے حد پسند کرتے تھے۔ اس علاقے کے رہنے والے ہندو بھی آپ کے بزرگوں کے مرید تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میرے بڑوں نے یہ بھی بتایا کہ ارد گرد کے چھ دیہات بھی آپ کے بزرگوں کے مرید تھے۔ ان کی کوئی درگاہ تو نہیں تھی لیکن یہاں بے شمار لوگوں کا آنا جانا تھا۔

تقسیم ہند کے وقت جب فسادات کا آغاز ہوا تو جہاں بھی مسلمان اقلیت میں تھے وہاں مقامی لوگوں نے ان پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ اس علاقے کے لوگوں کو بھی احساس ہوا کہ کہیں کوئی فسادی آپ کے خاندان پر بھی حملہ نہ کر دے اور آپ کے گھر والوں کا کوئی نقصان نہ ہو جائے لہذا ارد گرد کے دیہات سے لوگوں نے آپ کے

گھروں پر پہرہ دینا شروع کر دیا۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ پہرہ اتنا سخت تھا کہ کسی کو بھی آپ کے خاندان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ سب آپ کے مرید اور خیر خواہ تھے اور آپ کی حفاظت کیلئے اپنی جان بھی قربان کرنے کے لیے تیار کرتے تھے۔ اس کے باوجود بھی آپ یہاں سے چلے گئے۔

میں یہ سب سنتا رہا، میں کسی بھی طرح کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ البتہ شاہ صاحب نے بڑی دلیری سے جواب دیا کہ جب آپ نے ہمیں مارنا شروع کیا تو پھر ہمارے لیے پاکستان جانے کے علاوہ کیا چارہ باقی بچا تھا؟

یہ بات سن کر اس شخص نے کہا کہ شاہ صاحب بات تھوڑی سی مختلف ہے، جب تک آپ اس گاؤں میں رہے، ہم سب کو یقین تھا کہ آپ بھارت سے نہیں جائیں گے۔ جیسے ہی آپ نے یہاں سے جا کر ریلوے اسٹیشن پر کیمپ لگایا تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ آپ پاکستان جانا چاہ رہے ہیں اور آپ نے پاکستان کو بھارت پر ترجیح دی ہے۔ اس دن علاقے کے لوگ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری سے دستبردار ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کے ساتھ جو ہوا وہ اسٹیشن پر ہوا، گاؤں میں نہیں۔ جب آپ نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو پھر ہم نے یہ سمجھا کہ اب آپ ہمارے دشمن ہیں، اسی لیے تو پاکستان جا رہے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کو (جو فساد ہی تھے) آپ کو نقصان پہنچانے کا موقع مل گیا۔

یاد رہے اس موقع پر بھی کسی سمجھدار شخص نے آپ کو نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ اُن لوگوں کے جتنے تھے جنہیں معاشرے میں کوئی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ ہم انھیں بعد میں فساد ہی کہتے رہے۔ درحقیقت انھوں نے جو کچھ کیا، اس کا مقصد سوائے لوٹ مار کے اور کچھ نہ تھا۔ ان کا عمل ہر لحاظ سے قابلِ مذمت تھا اور اب بھی ہے۔ آپ کے خاندان کے ساتھ ایسا ہوا، اس پر ہم اب تک شرمندہ ہیں۔

آخر میں انھوں نے کہا، کہ آپ کو میری باتوں پر یقین کرنا چاہئے، اس کے ثبوت کے طور پر میں صرف اتنا کہوں گا کہ پچاس سال بعد بھی اس گاؤں میں آپ کے بزرگوں کی قبریں صحیح سلامت ہیں۔ یہ سب ان سے ہماری عقیدت کی وجہ سے ہی ہے۔ کوئی تو ہے جو ان قبروں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ یہ ہم ہندو ہی ہیں، اس گاؤں میں تو اب کوئی بھی مسلمان نہیں ہے۔ کچھ دن پہلے برادرِ عامر جعفری صاحب نے بتایا کہ ان کے کسی عزیز نے ان قبروں کی مرمت کروانے کی دیکھ بھال شروع کر دی ہے۔ ان پر چادریں بھی چڑھادی ہیں۔ انھوں نے ان کی تصاویر بھی بھجوائیں۔

بحث طول پکڑتی جا رہی تھی اور ماحول میں جذباتی پن بھی آ رہا تھا۔ میں نے شاہ صاحب سے گزارش کی کہ ہمیں اس بحث کو ختم کر کے واپسی کا سفر شروع کرنا چاہیے۔ ان صاحب سے کی گئی گفتگو کے بعد بہت سے سوالات نے جنم لیا۔ جن میں یہ سوال سب سے اہم تھا کہ فسادات کے وقت یقینی طور پر یہ سب ہوا ہو گا۔ بعد ازاں ہر شہر میں کیمپ لگائے گئے۔ میرے آبائی شہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ کی غلہ منڈی میں ہندوؤں اور سکھوں کے لیے کیمپ لگایا گیا۔ سرہند میں میرے بزرگوں کے لیے حضرت مجدد الف ثانی کے دربار پر کیمپ بنایا گیا۔ دونوں طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ کئی ماہ بعد جب امن ہوا تو لوگوں کو ریل کے ذریعے بھارت سے پاکستان اور پاکستان سے بھارت لایا گیا۔

جو کچھ ہوا وہ فسادات کے دوران ہوا لیکن جب امن ہو چکا تھا تو ان لوگوں (ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں) نے کیمپوں سے واپس اپنے گھروں کو جانے کی بجائے نقل مکانی کو ترجیح کیوں دی؟ گھراور زمینیں تو موجود تھیں۔ گھروں کا سامان تو یقینی طور پر لوٹ لیا گیا تھا۔ تقسیم ہند کے فارمولے میں نقل مکانی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ مسلمان اکثریت والے علاقے (صوبے) پاکستان کا حصہ ہوں گے اور ہندوؤں اکثریت کے علاقے بھارت کا حصہ ہوں گے۔ ریاستیں اپنا فیصلہ خود کریں گے۔ بعد ازاں



اسے اضلاع تک پھیلا دیا گیا۔ اسی پر بس نہیں کی گئی، پھر تقسیم کا عمل تحصیل کی سطح تک آگیا۔ اسی بنیاد پر سندھ اور پنجاب کی تقسیم ہوئی، حتیٰ کہ اضلاع کی بھی تقسیم ہوئی۔ اس سے تو یہ ظاہر تھا کہ لاہور نے ہر حال میں پاکستان کا حصہ بننا ہے اور دہلی نے بھارت کا۔ اگر لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تو ان کو دوسری جگہ آ کر تکالیف کا سامان نہ کرنا پڑتا۔

کیا ایسا ہو سکتا تھا اگر ہو سکتا تھا تو ایسا کیوں نہ ہوا؟

اس کا مجھے کوئی تسلی بخش جواب تو نہ مل سکا لیکن لوگوں کا کہنا یہی تھا کہ وہ اس قدر مشکل وقت تھا کہ مل جل کر رہنے کی کوئی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کیا یہ بات درست تھی؟

میرے مطابق یہ بات کافی حد تک درست ہے۔ میں نے پچھلے صفحات میں بھی اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ ایسی کئی ریاستیں تھیں جنہوں نے بطور ریاست مسلمانوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا۔ تاریخ میں اس بات کے کئی ثبوت موجود ہیں کہ پہلے مسلمانوں سے ہتھیار جمع کیے گئے اور بعد میں ہندوؤں اور سکھوں کے جتھوں نے ان پر حملے کر دیا۔

سید مودودی صاحب نے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے برادر مراد محمد ظفر صاحب سے بات کی تو انھوں نے بھی اس بات کے ثبوت کے طور پر کئی واقعات کا تذکرہ کیا۔ بھارت کے بعض مقامات پر مقامی انتظامیہ نے مسلمان کی جان و مال کی حفاظت سے مجبوری ظاہر کی اور انھیں کیمپوں میں آنے پر مجبور کیا۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب مسلمانوں نے اپنی مرضی سے ہجرت نہیں کی بلکہ بہت سوں کو ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ ان کے لیے حالات ہی کچھ ایسے پیدا کر دیے گئے کہ

زندہ بچنے کی ایک ہی صورت باقی تھی۔ البتہ کچھ ایسے بھی ضرور ہوں گے جنہوں نے اپنی مرضی سے ہجرت کی۔

میں ایک ایسے شخص کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے 1990ء کے بعد ہجرت کی۔ میرے ساتھ آئی سی آئی میں کام کرنے والے ایک صاحب نے 1967ء میں حیدر آباد سے ہجرت کی۔ چند سال قبل بھارت سے کیمیکل کا کام کرنے والی ایک فرم کی طرف سے ہمارے ہاں ایک خاتون تشریف لائیں۔ اس نے بتایا کہ اس کی پیدائش سکھر کی ہے۔ اس کے والدین نے 1995ء میں نقل مکانی کی۔ اس طرح کے اکا دکا واقعات کا ہونا کسی بڑی بات کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

ایک طرف اگر میں یہ کہوں کہ مسلمانوں کو بزور طاقت ہجرت پر مجبور کیا گیا تو پاکستان سے جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کی نقل مکانی کی کیا وجہ تھی؟ کیا وہ اپنی مرضی سے گئے یا انھیں بھی مجبور کیا گیا؟ کیا وہ بھی اپنی جان بچانے کی خاطر نقل مکانی پر مجبور ہوئے؟

### اصل وجہ کیا تھی؟

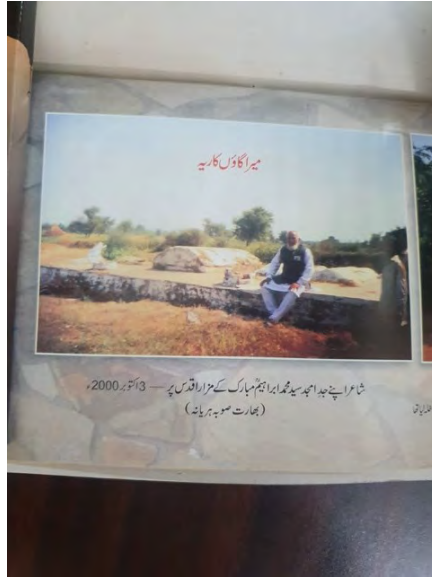
میں نے اس کا بھی جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس ہجرت کے ساتھ جڑے جذبات ہیں جو تاریخی حقائق پر حاوی ہو جاتے ہیں، یہ میرا تاثر ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔

وسیع پیمانے پر نقل مکانی اور اتنے سخت حالات کے باوجود بھی ایک مناسب تعداد میں (مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں) نے نقل مکانی نہیں کی۔ آج بھی پاکستان میں ایک مناسب تعداد میں بسنے والے ہندو اور سکھ اور بھارت میں بسنے والے بیس

کروڑ مسلمان اس بات کا ثبوت ہیں کہ دو قومی نظریے کے باوجود کسی بھی معاشرے میں دو سے زائد مذاہب کے لوگ مل جل کر رہ سکتے ہیں اور رہ بھی رہے ہیں۔

میرے علم کے مطابق تقسیم ہند کے وقت کسی بھی عیسائی نے موجودہ پاکستان سے بھارت کی طرف نقل مکانی نہیں کی۔ موجودہ پاکستان میں رہنے والے عیسائیوں نے پاکستان میں ہی رہنا کیوں پسند کیا؟ جب کہ اس ملک کی بنیاد ہی مذہب پر رکھی گئی تھی اور بھارت اُس وقت سے ہی ایک سیکولر ملک ہونے کا راگ الاپ رہا تھا (بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کافی حد تک بے بنیاد ہے)۔ اس طرح کے بے شمار سوالات سے جواب آج بھی لوگ تلاش کر رہے ہیں۔

ایک طویل سفر کے بعد ہم نے واپسی اختیار کی اور شام گئے مانگٹ صاحب کے گھر دہلی واپس آئے۔ اس دن ان کی شادی کی تیسویں سالگرہ تھی، جو ہم نے ان کے ساتھ مل کر منائی۔ اس کا کچھ احوال بھی پیش خدمت ہے۔



Shah sb at his forefathers graves



Graves of Grandfathers of Shah Sb  
now it is a Dragah made by local Hindus

## رنبیر سنگھ مانگٹ اور ان کی شادی کی تیسویں سالگرہ

ریوڑی سے واپسی پر ہم مانگٹ صاحب کے گھر چلے گئے جہاں ان کے والد محترم سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی بیٹی اور بیوی بھی وہاں موجود تھیں۔ بہت دیر تک ہم ان کے اہل و عیال سے باتیں کرتے رہے۔ مانگٹ صاحب کے والد سکھوں کی طرح داڑھی رکھے ہوئے تھے جبکہ مانگٹ صاحب اور ان کے بچوں نے کلین شیو کر رکھی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس پر جو انھوں نے مجھے جواب دیا وہ حاضر خدمت ہے۔

انھوں نے بتایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جب اندر راگاندھی کو ان کے سکھ گارڈز نے قتل کر دیا تھا تو اس وقت دلی میں ایک ہی دن کے اندر ہزاروں سکھوں کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت میں کسی دوسرے شہر میں تھا اور بذریعہ ریل دہلی واپس آ رہا تھا۔ ہم راستے میں تھے تو پتہ چلا کہ دہلی میں سکھوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا ہے۔ سکھ اپنی وضع قطع سے بہت آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ میں نے بھی سکھوں کی طرح اپنے سر اور داڑھی کے بال رکھے ہوئے تھے اور سر پر پگڑی بھی باندھتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میں اور ہمارے ساتھ ریل میں موجود سکھ بہت گھبرا گئے۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جائے؟ ایسی صورت میں سب نے سوچا کہ اگر ہم اسی حالت میں دہلی گئے تو ہمیں بھی قتل کر دیا جائے گا۔ ہم نے بہت ہی مجبوری میں یہ فیصلہ کیا کہ اپنی داڑھی اور سر کے بالوں کو کاٹ دیا جائے۔ ریل میں موجود کچھ لوگوں سے فینچی لی اور اپنے سر اور داڑھی کے بال کاٹ دیے اور پگڑیاں اتار کر بیگ میں ڈال لیں، سر کے بال بھیگی آنکھوں سے چوم کے بیگ کے اندر والے حصہ میں رکھ لیے، جان بچانے کی خاطر دھرم کو قربان کیا، جس کا آج تک افسوس ہے۔

وہ سب کچھ ہم نے اس لیے کیا تاکہ ہم پہچانے نہ جاسکیں۔ اس کے بعد سے ہی صورت حال ایسی ہے۔

میں نے رنبیر صاحب کے بیٹے سے پوچھا کہ آپ نے سکھوں جیسا حلیہ کیوں نہیں بنایا؟ ان کا جواب بھی دلچسپ تھا جو بھارت میں اقلیتوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کی نشاندہی بھی کرتا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ میں بچپن ہی سے سکھوں کی طرح سے داڑھی اور سر پر پگڑی رکھتا تھا۔ جب بھی میں اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ سفر کرتا تو راستے میں اگر کہیں بھی گاڑی کی چیکنگ ہوتی تو کسی اور کی چیکنگ نہیں ہوتی بلکہ یہی کہا جاتا کہ سردار جی آپ باہر آئیں۔ اس وجہ سے مجھے بار باریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ دھرم تو انسان کی سوچ میں ہوتا ہے، اس کے عمل میں ہوتا ہے پگڑی ہونے یا نہ ہونے، داڑھی ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس لیے میں نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا۔ اب میرے سامنے تین نسلوں کے لوگ تھے، مانگٹ صاحب کے والد (جواب تک مکمل سکھوں کی وضع قطع کے ساتھ تھے) اور باقی دونوں نسلوں کے لوگوں نے خود کو بدل لیا تھا۔

مانگٹ صاحب کے والد کسی مل میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کچھ دلچسپ باتیں بتائیں جو بظاہر تو بہت معمولی لیکن تھی بہت ہی غیر معمولی۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے چالیس سال تک ایک ہی مل میں کام کیا اور وہ بھی ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر۔ نہ میں نے نوکری بدلی اور نہ ہی مل والوں نے میری سیٹ لی اور نہ ہی میرا ڈپارٹمنٹ بدلنے کی کوشش کی۔ جس جگہ میں پہلے دن جا کر بیٹھا ریٹائرمنٹ کے بعد اسی جگہ سے اٹھ کر آیا یہ ایک بہت بڑی خوبی تھی جو بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

انھوں نے ایک اور دلچسپ بات بتائی ( جسے سن کر آپ یقیناً مسکرائیں گے ) عام طور پر گھڑی بائیں ہاتھ پر باندھی جاتی ہے لیکن میں نے ہمیشہ اپنے دائیں ہاتھ پر باندھی۔ اس کی وجہ یہ تھی اگر بائیں ہاتھ پر ہوتی تو مجھے وقت دیکھنے کے لیے ہاتھ کو اٹھانا پڑتا ہے اور پھر بازو گھما کر وقت دیکھنا پڑتا۔ اس میں وقت بھی لگتا اور مجھے اپنا کام بھی روکنا پڑتا۔ دائیں ہاتھ پر ہونے کی وجہ سے اگر میں لکھ بھی رہا ہوں تب بھی تو وقت دیکھنے کے لیے ہاتھ کو کوئی جنبش دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

انھوں نے ساری عمر محنت مشقت کی اور اب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا آبائی علاقہ لدھیانہ کے قریب تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مصروفیت کے لیے انھوں نے پینٹنگ شروع کر رکھی تھی۔ انھوں نے ہمیں اپنی کچھ پینٹنگز دکھائیں، جو ہر لحاظ سے عمدہ تھیں۔



R.S. Mangat an active member  
of Aam Admi Party

مانگٹ صاحب نے ہمیں یہ بتایا کیا آج رات کا کھانا ہم باہر کسی ریستوران میں کھائیں گے۔ ہمیں اس کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ جب ہم چلنے لگے

تو انھوں نے بتایا کہ آج ہماری شادی کی تیسویں سالگرہ ہے تو اس خوشی میں ہم کھانا باہر کھائیں گے۔ ہم نے انھیں مبارکباد دی اور اپنی گاڑی میں ریستوران کی طرف چل پڑے۔ راستے میں میں نے شاہ صاحب سے کہا کہ اس موقع پر ہمیں بھی کوئی تحفہ لینا چاہیے۔ انھوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ راستے میں ہم ایک دکان پر رکے۔ اس دکان کی مالک ایک خاتون تھیں جو اس وقت دکان میں بھی موجود تھیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم کسی کی شادی کی تیسویں سالگرہ پر جا رہے ہیں اور ان کے لیے کوئی تحفہ لینا چاہتے ہیں، لہذا ہماری راہ نمائی فرمائیں۔ انھوں نے بہت ہی اچھا سا پرفیوم ایک خوبصورت کاغذ میں پیک کر کے ہمیں دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ بہت خوش قسمت لوگ ہوں گے جو تیس سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں اور اپنی شادی کی تیسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ میری طرف سے بھی انھیں مبارکباد دیجئے گا۔



Ranbeer Singh Mangat (RS Mangat)

my Friend in Dehli

جب ہم ریستوران کی طرف جا رہے تھے تو شاہ صاحب نے کاغذ پنسل لے کر اس پر شادی کی سالگرہ کی مناسبت سے شعر لکھنا شروع کر دیئے۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ انھوں نے بہت کم وقت میں تقریباً کوئی دس بارہ خوبصورت شعر لکھ لیے۔



جب ہم ریسٹوران پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑا ریسٹوران تھا۔ اس کی دیوار پر بہت بڑا نقشہ بنا ہوا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ پنجاب کا ایسا نقشہ دیکھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے دہلی سے پشاور تک کے تمام علاقے کو پنجاب کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں انگریزوں نے سرحدی علاقہ جات کو الگ کر کے شمال مغربی صوبے کا نام دیا۔

میرے علم کے مطابق یہ پنجاب کی پہلی تقسیم تھی۔ اس کے بعد چل سو چل --- آج اس پنجاب کے چار حصے ہو چکے ہیں۔۔۔ اگر سرائیکی صوبہ اور ہزارہ صوبہ کی مانگ کامیاب ہو گئی تو پھر کتنے حصے ہوں گے۔۔۔ معلوم نہیں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب تقسیم کرو اور حکومت کرو کی سوچ کے تحت ہو رہا ہے۔ جو کل بھی کار گر تھا اور آج بھی یہی پالیسی چل رہی ہے۔

جب ہم ہال میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کافی لوگ بیٹھے تھے۔ میں نے ویٹر سے کہا کہ آج ہمارے دوست کی شادی کی تیسویں سالگرہ ہے۔ ایسے موقع کی مناسبت سے کوئی گانا سنوائیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ انھوں نے رفیع صاحب کا کوئی ایک بہت ہی مشہور گانا سنوایا، جس کے بول کچھ یوں تھے،

سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا

اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے دوست شاعر ہیں ہم پاکستان سے آئے ہیں اور انھوں نے شادی کی سالگرہ کے حوالے سے ایک غزل بھی لکھی ہے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے انھوں نے مائیک پر اعلان کیا کہ ہمارے ایک مہمان کی شادی کی تیسویں سالگرہ ہے اور اس موقع پر پاکستان سے آئے ہوئے ایک شاعر اپنے کچھ شعر سنانا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب کو اسٹیج پر بلوایا گیا۔ شاہ صاحب نے پچھلے آدھے گھنٹے میں لکھے گئے وہ تمام شعر سنائے اور بے حد داد و وصول کی۔

پاکستان آ کر میں نے وہ شعر لکھ کر مانگٹ صاحب کو بھی بکھوائے۔ مانگٹ صاحب نے جواب دیا کہ میرے لیے اردو پڑھنا ممکن نہیں لیکن میں نے اردو پڑھنے والے کچھ دوستوں سے انھیں پڑھوایا۔ تو مجھے بہت اچھا لگا، اس کا بے حد شکریہ۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو پنجاب کے سفر کی روداد سناؤں میں چاہوں گا کہ اس نمائش گاہ کا کچھ احوال سناؤں جس میں ہم شریک ہونے کے لیے بھارت آئے تھے۔

### پراگتی میدان: بھارت کی ایک اہم نمائش کا

ہمارا یہ سفر دہلی میں ہونے والی ایک صنعتی نمائش میں شرکت کے لیے تھا۔ اس نمائش میں ٹیکسٹائل سے متعلق کیمیکلز، مشینری اور بے شمار طرح کی اشیا موجود تھیں۔ یہ مرکز دہلی کے بالکل قریب ہی واقع تھا جس کا کل رقبہ 150 ایکڑ ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھارت کا بہت بڑا ایگزپسیشن سینٹر ہے۔ لاہور میں واقع ایکسپو سینٹر کا منصوبہ 2002 میں بنایا گیا اور اس کی تکمیل 2010 میں ہوئی تھی۔ اس کا کل رقبہ پچاس ایکڑ ہے اور اس میں اس وقت تک دو بڑے ہال ہیں۔

بھارت میں انیس سو ستر کی دہائی میں ایک طویل مدتی منصوبے پر کام شروع ہوا، جس کے تحت بے شمار تعلیمی ادارے اور کئی ریسرچ سنٹر بھی بنائے گئے۔ صنعتی ترقی کے لیے صنعتی نمائش کا ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے دہلی کے قریب ایک بہت بڑا رقبہ حاصل کیا گیا جس کا افتتاح 1972ء میں اندرا گاندھی نے کیا۔ اس افتتاح کو بھارت کی پچیس سالہ جشن آزادی کے ساتھ جوڑا گیا۔ اس سنٹر کو بہت عمدہ طریقے سے بنایا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے اس کی تمام ڈیزائننگ بھارتی لوگوں نے ہی کی ہے۔ اس کمپلیکس میں نمائش کے لیے اٹھارہ ہال ہیں اور عمارتیں موجود ہیں۔ یہاں پر ہر سال ستر سے زائد قومی اور بین الاقوامی نمائشوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ یہاں پر بھارت کی سب سے بڑی نمائش بھی لگتی ہے جس کا نام انٹرنیشنل انڈیا ٹریڈ ہے اس میں لگ بھگ تیس لاکھ لوگ شریک ہوتے ہیں۔

دہلی میں اس سسرے کے پاس چھوٹی پہاڑی پر ایک درگاہ موجود ہے جسے بابا منکا پیر کی درگاہ کہا جاتا ہے۔ بابا منکا پیر کا اصل نام صوفی حضرت شیخ ابو بکر طوسی حیدری قلندری رحمت اللہ علیہ ہے لیکن وہ بابا منکا پیر کے نام سے ہی جانے جاتے ہیں۔ جیسے ہی آپ درگاہ پر پہنچتے ہیں تو آپ کو ایک کے درخت سے لٹکے ہوئے مٹی کے برتن دکھائی دیں گے اور اس کے آس پاس کی دکانوں پر بھی مٹی کے برتن ملیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں آپ کو وافر مقدار میں چنے بھی بکتے نظر آئیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک جلد کی لاعلاج بیماری میں مبتلا ایک شخص یہاں آیا تو ان بزرگ نے اسے پانی دیا جس سے وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو گیا۔ یہ سن کر دلی کے اس وقت کے حکمران غیاث الدین بلبن نے بابا جی کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ایک شخص کے ہاتھ لوہے کی گیندوں اور کچھڑ کا ایک تھال بھیجا۔ تھال دیکھ کر بابا جی نے اسے ڈھانپ لیا اور دعا کرنے لگے۔ جب وہ دعا سے فارغ ہوئے اور تھال کا پردہ ہٹایا تو سب لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لوہے کی گیندیں بھنے ہوئے چنوں میں اور کچھڑ گڑ میں بدل گیا تھا۔ پھر بابا جی نے وہ سب پانی میں ملایا اور میٹھا دودھ بنا لیا۔ وہ سب کچھ سر عام ہوا۔ اس واقعے کے بعد ان کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور لوگ انھیں بابا منکا پیر کہنے لگے۔ آپ کو بھارت اور پاکستان کے طول و عرض میں ایسے بے شمار مزارات ملیں گے۔ ایسا صدیوں سے ہی ہوتا آیا ہے۔



Dargah of: Hazrat Sheikh Abu Bakr Tusi Haideri

Photo Credit: Loveindiatravel

## بیراجی کی بٹیا کی شادی

جیسا کہ میں نے بھارت کے چار حصہ اول میں ذکر کیا تھا کہ جب میں پہلی مرتبہ بھارت آیا تو میری بیراجی سے ملاقات ہوئی تھی، جن کا آبائی وطن پنجاب ہے۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد دہلی میں سکھوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام ہوا تو اس کا بدلہ لینے کے لیے سکھوں نے پنجاب میں ہندوؤں کو مارنا شروع کر دیا۔ یہ بالکل اسی طرح کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جیسی تقسیم ہند کے وقت تھی۔ جب مغربی پنجاب کے مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے تو انھوں نے اس کے بدلے مغربی پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ بیراجی ایسے ہی حالات کی وجہ سے دہلی آ گئے تھے۔ میں جب بھی بھارت آتا تو ان سے ضرور ملتا تھا۔

اس دفعہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ میری بٹیا کی شادی ہے اور آپ اس شادی میں ضرور شریک ہوں۔ ہمارے ہاں عام طور پر پر بٹی کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ بھارت میں بہت سے لوگ بٹی کی بجائے بٹیا کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ شادی کی تاریخ کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے سفر میں کچھ تبدیلی بھی کی۔ اس کی وجہ ان کی انتہائی محبت سے شادی میں شرکت کی دعوت تھی۔ یہ میری پہلی مرتبہ کسی بھی ہندو خاندان کی شادی میں شرکت تھی۔ شادی رات کے وقت تھی۔ انھوں نے کہا کہ آپ آٹھ بجے تک آ جائیں۔ وہ شادی مجھے اب تک یاد ہے۔

شادی کی جگہ حوض خاص کی طرف، کھلی جگہ پر تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ رات کے وقت اتنی دور شہر سے باہر جانے سے خوف بھی آ رہا تھا لیکن جانا بھی ضروری

تھا۔ بہر حال ہم تینوں ان کی شادی میں پہنچ گئے۔ ہمارے ہاں شادی کا تصور ابھی تک یہی تھا کہ شادی کسی شادی ہال یا گلی محلے میں شامیانہ لگا کر کی جاتی ہے اور مخصوص وقت پر لوگ آتے ہیں اور پھر سب مل کر کھانا کھاتے ہیں، لیکن اس شادی کا منظر بہت ہی مختلف تھا۔

جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں شادی ہو رہی تھی تو ہم نے دیکھا کہ تقریباً ایک ایکڑ پر پھیلا ہوا ایک کھلا میدان تھا جس کے ایک کونے میں لکڑی کا ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی تقریباً دس فٹ کی اونچائی پر ایک اسٹیج بنا ہوا تھا۔ ایک کونے میں بڑا سا کمرہ تھا۔ میدان میں داخل ہوتے ہی ہمارے بائیں طرف ایک بازار لگا ہوا تھا جہاں گول گپے، دہی بھلے اور اس طرح کی چیزیں موجود تھیں۔ ایک جگہ آگ جل رہی تھی جس کے اوپر ایک چھوٹی سی چھت بھی تھی۔ آگ کے پاس ایک صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ وہ کوئی ہندو پنڈت ہیں جو پھیروں کے وقت منتر وغیرہ پڑھتے ہیں۔ ایک طرف بہت سے پھلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن سے جوس نکالا جا رہا تھا۔ میدان کے وسط میں میں کئی تندور لگے ہوئے تھے جس میں مختلف قسم کی روٹیاں پکائی جا رہی تھیں اور اس کے چاروں طرف کھانوں کے اسٹال تھے۔ ہر اسٹال پر مختلف طرز کے کھانے میسر تھے۔ چار طرح کے مختلف سٹائز تھے، جن پر مختلف علاقوں کے کھانے موجود تھے؛ جیسے کانٹی نینٹل، چائینز، جاپانی، یورپین وغیرہ۔ جیسے ہی ہم داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ بیراجی مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ ہم بھی ان سے ملے۔ ہمیں مل کر وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنے بہت سے دوستوں کے ساتھ ہمارا تعارف بھی کروایا اور انھیں بتایا کہ یہ لوگ پاکستان سے آئے ہیں اور صرف میری بٹیا کی شادی کے لیے انھوں نے اپنے سفر کو موخر کیا ہے۔

جیسے ہی ہم آگے بڑھے تو ہم نے دیکھا کہ پلیٹ فارم کے ساتھ بنے ہوئے اسٹیج پر لڑکے، لڑکیاں اور بڑی عمر کے مرد و خواتین مختلف گانوں پر رقص کر رہے تھے۔ وہ پیشہ ور لوگ نہیں تھے بلکہ مہمان تھے اور ان میں سے کچھ جو ناچنا جانتے تھے وہ مختلف گانوں کی دھنوں پر ناچ رہے تھے۔ ہمارے ہاں اب یہ کام مہندی پر ہوتا ہے۔ کچھ نیچے اور کچھ اسٹیج کے اوپر ناچ رہے تھے۔

جیسے ہم بیراجی سے مل کر آگے جانے لگے تو ایک صاحب ایک ٹرے میں دس بارہ قسم کے جو س لے کر آگئے۔ وہ تازہ پھلوں کے جو س سے پہلا سواگت تھا۔ اس کے بعد ہم کھانے کے شانز کی طرف چلے گئے۔ تندوروں میں مختلف اقسام کے اناج سے روٹیاں بن رہی تھیں جو سائز میں بہت ہی چھوٹی تھیں۔ مختلف شانز پر ہم نے بہت سے کھانے دیکھے۔ مختلف کھانے پکھنے (کھانے نہیں) کے بعد سامنے کی طرف دیکھا تو ایک اور بازار نظر آیا جس میں دودھ دہی کی دکان موجود تھی۔ ایک جگہ دودھ میں جلیبی ڈال کر بھی دی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ بے شمار میٹھی چیزوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دودھ جلیبی دیکھ کر یاد آ گیا کہ ہمارے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک خان دودھ والے ہوتے تھے۔ وہ شام کے وقت پیالوں میں دودھ اور جلیبی ڈال کر رکھتے تھے۔ رات کے وقت بہت بڑی تعداد میں لوگ ان کی دکان پر دودھ جلیبی کھانے جاتے تھے۔

جیسے ہی ہم باہر نکلنے کے لیے چلے تھوڑا آگے پہلے تو ہم نے دیکھا کہ دائیں طرف پان کا ایک بازار لگا ہوا ہے۔ جس میں مختلف اقسام کے پان مل رہے تھے۔ پان کی گوری بھی ہم سب نے بہت شوق سے کھائی۔ ہم لوگ جتنا کچھ کھا چکے تھے اسے ہضم کرنے کے لیے پان ایک مفید چیز تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ کھانے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا۔ جیسے جیسے لوگ آتے، کھانا کھاتے اور چلے جاتے لیکن جاتے ہوئے بیراجی کو ایک لفافہ ضرور پکڑا جاتے۔ لفافہ دینے کی رسم پنجاب میں عام ہے۔ اس موقع پر میں نے ایک دلچسپ مکالمہ بھی سنا۔ (ہمارے ہاں بھی ایسا ہوتا ہے)۔

میں نے دیکھا کہ دونوں جوان لڑکے بیراجی کو ایک لفافہ دے رہے تھے، لیکن بیراجی وہ لینے سے انکاری تھے۔ بچے یہ کہہ رہے تھے کہ ابو کی طبیعت خراب تھی (یا کوئی اور بہانہ لگا رہے تھے) اس لیے وہ نہیں آسکے۔ بیراجی کہہ رہے تھے کہ اگر وہ نہیں آئے تو میں یہ سلامی (نیوندرہ) بھی نہیں لوں گا۔ ہمارے ہاں بھی اکثر یہی ہوتا ہے کہ اگر کوئی بڑا دعوت میں نہ آئے تو پھر اس کی طرف سے بھیجی گئی سلامی بھی نہیں لیتے۔ اس شادی میں دو ہزار سے زائد مہمان تھے۔ وہ ایک دلچسپ تجربہ تھا جس کی ایک مختصر جھلک میں نے آپ کی خدمت میں پیش کی ہے۔

یاد رہے کہ یہ ایک ہندو خاندان کی شادی تھی۔۔۔ ان کے تمام کھانوں میں نہ ہی کوئی انڈا تھا اور نہ ہی کسی بھی قسم کا کوئی گوشت۔۔۔

اسکے باوجود بھی سینکڑوں اقسام کے کھانے۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ شادی کا طریقہ کار بھی وہی صدیوں پرانا۔۔۔

جسے ہندو اپنی تہذیب اور تمدن کہتے ہیں۔ جس سے متعلق ہندوؤں کا کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ ان پر کئی غیر ملکی اور غیر ہندو مذاہب کے لوگوں نے صدیوں حکمرانی کی اور وہ ان کے غلام رہے، انھوں نے اپنی صدیوں پرانی تہذیب و تمدن کو نہیں بدلا اور اسے مضبوطی سے سنبھالے رکھا۔۔۔

اسے وہ اپنی تہذیب و تمدن کی کامیابی کے ساتھ ساتھ ہندو پریم پراؤں کا پاس کرنا بھی کہتے ہیں۔۔۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ باہر سے آکر حکومت کرنے والوں نے ان پر اپنی زبان کا نفاذ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن آج بھی ان کی زبان ہندی ہی ہے۔۔۔

ان کی یہ بات تو کسی حد تک درست ہے لیکن ان کی نئی نسل میڈیا کی یلغار کے سامنے سرنگوں کر چکی ہے اور اپنی تہذیب سے دن بدن دور ہوتی جا رہی ہے۔ جسے

غیر ملکی حکمران کو فتح نہ کر سکے، لیکن غیر ملکی میڈیا ضرور ڈھیر کر چکا ہے، اس بات پر عام ہندو بھی پریشان ہے، (ویسے پریشان ہم بھی کم نہیں)۔

## دہلی میں موجود ایک اور میانوالی

اپنے وطن سے کس کو محبت نہیں ہوتی۔ وہ بھلے مسلمان ہو، انگریز ہو، ہندو ہو یا سکھ۔ جب ہم بھارت جا رہے تھے تو شاہ صاحب نے بتایا تھا کہ میانوالی سے دہلی آکر آباد ہونے والے ہندو بھی کثیر تعداد میں دہلی میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک روشن لال صاحب ہے وہ شانتی نگر میں رہتے ہیں۔ وہ میانوالی بھی آتے رہتے ہیں اور میری ان سے اچھی سلام دعا بھی ہے۔ شاہ صاحب کے پاس ان کا رابطہ نمبر بھی تھا۔ ایک دن ہم نے انھیں ہوٹل سے فون کیا اور وہ دوسرے دن صبح ہی تشریف لے آئے۔ اس طرح مجھے بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ شخص اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔ وہ جتنی دیر ہمارے پاس بیٹھے رہے، اور مسلسل باتیں کرتے رہے، جن کا موضوع میانوالی اور اس میں رہنے والے لوگ تھے۔ انھوں نے زیادہ تر سرائیکی میں ہی بات کی۔ کبھی کبھی اردو بھی بولتے تھے لیکن وہ بھی سرائیکی لہجے میں۔ ان کا میانوالی کے لوگوں کی طرح اونچی آواز میں کھل کر بات کرنا مجھے اب تک یاد ہے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم ممبئی جا رہے ہیں اور واپسی پر ان کے ہاں آئیں گے۔

جب ہم ممبئی میں تھے تو شاہ صاحب نے پوچھا کہ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ایک دن پہلے چلا جاؤں کیونکہ ممبئی میں میرا دل نہیں لگ رہا اور میں کچھ وقت روشن لال کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ وہ موبائل فون کا دور نہیں تھا اس لیے میں تھوڑا سا گھبراہٹ سے شاہ صاحب اکیلے جائیں گے۔ ایک طویل سفر اور اجنبی شہر۔ پریشانی فطری بات تھی۔ شاہ صاحب نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں انشاء اللہ محفوظ طریقے سے روشن



لال کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اسی کے ڈیرے پر ہی رہوں گا۔ شاہ صاحب محض اپنی دھن کے کپکے اور ارادوں کے پختہ، انسان تھے۔ میں نے بہت ہی مجبور ہو کر ان کی بات مان لی اور وہ ایک دن پہلے مبی سے دہلی آ گئے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ روشن لال کے گھر پہنچیں تو مجھے اطلاع دیں جو انھوں نے دے دی۔ جس سے میں مطمئن ہو گیا کہ شاہ صاحب اب محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔

جب شاہ صاحب ان کے گھر گئے تو انھوں نے بتایا کہ میانوالی کے لوگوں کو یہاں اکٹھا کیا ہوا ہے اور ان کی ایک انجمن بھی بنائی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ میانوالی کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔ جس کا مقصد ان سب کو اکٹھا رکھنا اور ساتھ ساتھ ان کے مسائل کے حل کے لیے کوشش بھی کرنا ہے۔ یہ برادری خاص طور پر بچے اور بچیوں کی شادی کے معاملے میں ایک دوسرے کی بہت مدد کرتی ہے اسی طرح کی ایک بنوں برادری کی تنظیم بھی موجود ہے۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ ان کا گھر کم اور ڈیرہ زیادہ ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی آیا ہی رہتا ہے۔ شاہ صاحب ان کے ہاں دورات رہے۔ جب واپس آئے تو بہت ہی خوش تھے۔

انھوں نے بتایا کہ کئی خاندان میانوالی سے سے لٹ لٹا کر، اپنی صدیوں پرانی رہائش گاہوں کو چھوڑ کر اور اپنے کاروبار کو بند کر کے دہلی آئے تھے۔ یہ لوگ میانوالی سے تو آ گئے لیکن آج بھی ان کا دل میانوالی میں ہی ہے۔ ان کے گھروں میں میانوالی کی سرانیکی زبان ہی بولی جاتی ہے۔ (جو زبان صدیوں سے یہ لوگ بولتے آ رہے تھے وہ چند سالوں میں دہلی کی فضا میں بدل نہیں سکتی تھی۔) شاید آنے والی نسلیں اسے آگے لے کر نہ چل سکیں۔ روشن لال سے مل کر یوں لگتا تھا کہ دہلی کی ثقافت نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔

میں جب ان سے ملا تو مجھے کئی اور لوگ بھی یاد آئے جن ایک مشہور بھارتی صحافی بھی شامل ہیں جن کا تعلق میانوالی کے قریب وان بھچراں سے تھا۔ انھوں نے اپنے اس قصبہ سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس طرح بے شمار لوگ ہیں جو یہاں سے وہاں گئے اور انھوں نے اپنے شہروں کو یاد رکھا۔ کئی لوگوں کے آبائی شہروں کے نام ان کے نام کا حصہ بھی ہیں، جیسے بٹالوی، لدھیانوی، امرتسری، سرہندی وغیرہ۔ یہ سب اپنے آبائی وطن سے محبت کی نشانی ہے۔

ایک دن میں ٹیکسٹائل کی نمائش میں تھا (جس کا ذکر میں پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں)۔ میرے پاس کچھ مقامی لوگ بھی کھڑے تھے۔ ایک صاحب نے دوسرے سے کہا ”بھئیہ ونج“۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور ان سے پوچھا کہ آپ سرائیکی میں بات کر رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا سرائیکی تو پاکستان میں بولی جاتی ہے۔ کیا یہ زبان بھارت میں بھی بولی جاتی ہے؟ میری یہ بات سن کر انھوں نے پوچھا کہ کیا آپ پاکستان سے ہیں؟ میں نے کہا کہ جی ہاں، میں لاہور میں رہتا ہوں۔ یہ سن کر وہ سب میرے قریب آگئے اور کہنے لگے ہمارا گھر بنوں میں تھا۔ تقسیم ہند کے وقت ہمارے بڑے بھارت آگئے تھے۔ پھر دیر تک --- بنوں کی باتیں، بنوں کی یادیں، نقل مکانی کی داستان، جو مارے گئے یا راہ میں مر گئے، ان کا ذکر، اندروں بنوں میں دکانوں کی روداد۔۔۔ اور آخر میں رندھی ہوئی آواز اور بھیگی پلکیں۔۔۔ دونوں طرف۔۔۔

پھر مجھے استاد دامن یاد آگیا جس نے تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں ہونے والے پہلے ہندو پاک مشاعرے میں یہ پنجابی غزل پڑھی تھی۔

بھاویں مومنوں نہ کہیے پر وچوں وچی

کھوئے تسی وی او، کھوئے اسی وی آں

ایسناں آزادیاں ہتھوں برباد ہونا  
 ہوئے تسی وی او ہوئے اسی وی آں  
 کجھ امید اے زندگی مل جائے گی  
 موئے تسی وی او، موئے اسی وی آں  
 جیوندی جاں ای، موت دے منہ اندر  
 ڈھوئے تسی وی او، ڈھوئے اسی وی آں  
 جاگن والیاں رج کے لٹیا اے  
 سوئے تسی وی او سوئے اسی وی آں  
 لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے  
 روئے تسی وی اور وئے اسی وی آں

یہ رونا کیوں ہوا؟ کون ذمہ دار ہے؟ کس کے سر ہے بیس لاکھ لوگوں کا خون؟  
 کس نے صدیوں سے آباد ایک ہی گلی میں رہنے والے لوگوں کو ایک دوسرے کا دشمن  
 بنایا؟۔ کس نے ایک کروڑ سے زائد لوگوں کو اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا؟

میرے ننھیالی گاؤں سر ہند، پٹیالہ کے پاس تھا۔ میرے نانا کے کسی بڑے نے  
 اسلام قبول کیا لیکن باقی سارا خاندان سکھ ہی رہا۔ ایک ہی برادری، ایک ہی خاندان، ایک  
 ہی محلہ، ایک ہی گاؤں، کچھ لوگ مسلمان اور کچھ لوگ سکھ۔ تقسیم ہند کے وقت انھی  
 سکھوں نے میرے نانا کے خاندان پر بے انتہا ظلم ڈھائے، عورتوں کو اغوا کیا، جو تقسیم ہند  
 کے بعد سکھوں کے بچے جنتی رہیں اور کبھی واپس نہ لوٹ سکیں۔ میرے عزیز فیصل ٹھاکر  
 صاحب نے بتایا کہ نارووال کے قریب ان کے گاؤں میں صدیوں سے آباد ستر ہندوؤں کا

قتل عام کیا گیا۔ ایک عورت کو اغوا بھی کیا گیا۔ فیصل صاحب کے ایک رشتہ دار نے اس سے شادی کی، اس سے ایک بچہ بھی ہوا (جو جنوری 2021 میں فوت ہو گیا۔ ہندو ہونے کی وجہ سے اس عورت کو خاندان میں کسی نے نہ تو عزت دی اور نہ ہی اس بچے کو اس کا صحیح مقام۔۔۔

فصور اسکا جس نے اغوا کیا اور سزا اسے جسے اس کے والدین اور خاندان سے زبردستی جدا کیا گیا۔

کیا تقسیم ہند بغیر کسی قتل و غارت کے ممکن نہ تھی؟ میرے خیال میں ممکن تھی۔۔۔ پھر یہ لاکھوں کی تعداد میں بے گناہ انسانوں کا قتل کیوں ہوا؟

یہ سوال تو ہمیشہ موجود رہیں گے۔۔۔ اور آج نہیں تو کل تاریخ اسکا جواب ضرور دے گی۔۔۔ جب جواب آئے گا تو جھوٹی عقیدتوں کے بت مسمار ہوں گے، کاش اس دن میں زندہ ہوں اور ان ظالموں کا انجام دیکھ سکوں۔

اہل برطانیہ نے بھی ایک سو سال بعد ایک آمر کی لاش قبر سے نکال کر اسے پھانسی کی سزا دی تھی، بیس لاکھ لوگوں کے قاتل کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا، میری سوتیلی والدہ کے اغوا کار اور اسے پناہ دینے والوں کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا، میرے والد، جو ایک خوشحال زمیندار گھرانے کا ایک گھبر و نوجوان تھا کو ایک زمیندار کے کامے ہونے پر مجبور کرنے والے کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا، ہو گا یقیناً ہو گا، یہ سب میرے ذاتی دشمن ہیں، کیسے بخش دوں، کیسے بھول جاؤں، ناممکن ہیں۔ یہ تحریر بھی اسی لیے لکھ رہا ہوں تاکہ اگلی نسل یہ جان سکے کہ ان کے باپ دادا کے ساتھ کیا جاتی تھی، کون اس کا مذہم دار تھا، اسے ضرور تلاش کرنا ہے، تاریخ کے اُن اوراق سے ضرور پردہ اٹھانا ہے

جنہیں جان بوجھ کے چھپایا گیا، ایک غلط راگ الاپا گیا، سورج طلوع ہونے کا یقین ہے تو اس بات کا بھی یقین ہے، کہ مجرم چہرے ضرور سامنے آئیں گے۔۔ اگر میرے سوہنے رب، سچے بادشاہ، میرے پالنے والے نے چاہا تو وہ دن ضرور آئے گا۔  
مجھے تو فیض بھی سکھا گیا ہے، اس نے صحیح کہا ہے کہ،

ہم دیکھیں گے، ہم دیکھیں گے  
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے  
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے  
جو لوح ازل میں لکھا ہے  
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں  
روئی کی طرح اڑ جائیں گے  
ہم محکوموں کے پاؤں تلے  
یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی  
اور اہل حکم کے سراپے  
جب بجلی کڑکڑکے گی  
جب ارضِ خدا کے کعبے سے  
سب بُت اٹھوائے جائیں گے  
ہم اہلِ سفار و دودِ حرم  
مسند پہ بٹھائے جائیں گے  
سب تاج اچھالے جائیں گے  
سب تخت گرائے جائیں گے

بس نام رہے گا اللہ کا  
 جو غائب بھی ہے حاضر بھی  
 جو ناظر بھی ہے منظر بھی  
 اٹھے گا انا الحق کا نعرہ  
 جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو  
 اور راج کرے گی خلق خدا  
 جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو  
 لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔۔۔

اگر آج پاکستان میں پانچ فیصد غیر مسلم رہ سکتے ہیں تو بیس فیصد کیوں نہ رہ  
 پاتے؟ آج اگر بھارت میں بیس فیصد مسلمان رہ سکتے ہیں تو تیس فیصد کیوں نہ رہ پاتے؟  
 اگر آج بھارت کے شہر حیدرآباد میں چالیس فیصد مسلمان رہ سکتے ہیں تو سرہند میں دس  
 فیصد مسلمان کیوں نہ رہے؟ اگر آج تھر میں پچاس فیصد سے زائد ہندو امن سے رہ سکتے  
 ہیں اور اپنے ایم این اے خود چنتے ہیں تو لاہور میں پانچ فیصد ہندو اور سکھ کیوں نہ رہے؟  
 کیا کہیں ایسا تو نہ تھا کہ اصل مقصد نقل مکانی اور ہجرت کا ماحول بنا کر، فساد کو  
 مذہبی رنگ دے کر، فضا میں نفرت کے بیج بو کر اور اقلیتوں کو ختم کر کے اکثریت کو اپنی  
 من مانی کرنے کا موقع مہیا کرنا تھا؟

میں اس سوال کے جواب کی تلاش میں ہوں۔

یہ میری رائے ہے اور پختہ رائے ہے،

اور اختلاف آپ کا حق ہے۔۔۔ نفرت نہیں اختلاف۔۔۔ یہ جو کچھ ہوا۔۔۔ یہ  
 اختلاف نہیں تھا بلکہ نفرت تھی جو پھیلانی گئی۔۔۔ اور پھر تاریخ کی سب سے بڑی نقل

مکانی و ہجرت ہوئی اور بیس لاکھ لوگوں کا قتل ہوا، ایک کروڑ سے زائد لوگ نقل مکانی پر مجبور ہوئے، لاکھوں خواتین اغوا ہوئیں، بے شمار بچے والدین سے ہٹھڑ گئے،۔۔۔ ایک پوری نسل اس سانحے میں برباد ہوئی۔۔۔ ایسے سانحے کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔۔۔ اللہ کرے ایسا کسی کے ساتھ بھی نہ ہو۔



Roshan Lal with Atta Ullah Esia Khilwi Photo Credit:  
<https://www.arabnews.com>



Another Mianwali in Dehli Photo Credit:  
<https://www.arabnews.com>



Roshan Lal with his friends during his visit to Mianwali  
Photo Credit: <https://www.arabnews.com>





Roshan Lal traditional dance Photo Credit:  
<https://www.arabnews.com>

## دہلی سے چند گڑھ: ایک یادگار سفر

جب بھی ہم شالیمار کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک خوب صورت باغ کا تصور آتا ہے۔ یہ لفظ شالیمار ہے یا شالامار ہے۔ سرکاری کاغذات میں اسے شالیمار باغ ہی لکھا ہوا ہے لیکن عام بول چال میں ہم اسے شالامار باغ بھی کہتے ہیں۔ پاکستان ریلوے نے لاہور سے کراچی تک ایک ٹرین بھی چلائی جس کا نام شالیمار رکھا گیا تھا۔ پاکستان میں رہنے والے لوگ لاہور میں واقع شالیمار باغ سے بخوبی واقف ہیں۔ البتہ اس بات کا مجھے بھی علم نہیں تھا کہ ایسے دو اور باغ، سرینگر اور دہلی میں بھی واقع ہیں۔ جب ہم نے دہلی سے چند گڑھ کا سفر شروع کیا تو نقشے سے پتہ چلا کہ دہلی کے شمال مغرب میں ایک بڑی آبادی کا نام شالیمار باغ ہے۔ اس علاقے میں مغل حکمرانوں کا بنایا ہوا ایک شالیمار باغ بھی ہے۔ میں اس باغ کو دیکھ نہ سکا، جس کی حسرت ہی رہی۔ نا دیکھنے کی وجہ میری شالیمار باغ سے متعلق لاعلمی تھی۔ اس باغ کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

شالیمار باغ دہلی، ستارویں صدی میں مغل حکمرانوں نے بنوایا تھا۔ یہ باغ ان پرانے باغوں میں سے ایک ہے جو اپنی اصل حالت میں اب تک موجود ہیں۔ اس باغ

کے ساتھ ایک تاریخی واقعہ بھی جڑا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ 1658ء میں اس باغ میں اورنگ زیب کی تاج پوشی کا فنکشن بھی ہوا تھا۔ ان تین باغات کے نام شالیمار باغ ہی کیوں رکھے گئے؟ میں نے اس کا جواب ڈھونڈنے کی کافی کوشش کی لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔

میرے اندازے کے مطابق اس لفظ کا تعلق شاہجہاں سے ہے۔ مار کے لفظ سے لگتا ہے کہ یہ لفظ عمارت سے لیا گیا ہے۔ یہ سب قیاس ہے۔ صحیح بات کیا ہے میں اس بات کا کھوج تاحال نہیں لگا سکا۔ کئی لوگوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ تمام تر باغات شاہجہاں کی بیوی اکبر آبادی بیگم نے بنوائے تھے۔ شاہجہاں نے بے شمار عمارتیں بنوائیں اور اسی وجہ سے اسے مغلیہ سلطنت کا معمار بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی بیٹی کی بنائی ہوئی بھی کئی عمارتیں موجود ہیں، جس سے لگتا ہے کہ تعمیرات سے دلچسپی اس خاندان کا خاصہ تھی جس کا اظہار ہندوستان بھر میں شاندار عمارتوں کی تعمیر سے ہوتا ہے۔

اگر آپ نے لاہور کا شالیمار باغ دیکھا ہے تو آپ سمجھ لیجیے کہ یہ باغ بھی اسی جیسا ہے۔ البتہ اس میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی گئیں ہیں جو لاہور میں نہیں کی گئیں، جیسے بچوں کے لیے کھیل کی جگہ وغیرہ۔ اس کے باوجود ایک بڑے حصے پر پھلوں کے درخت اب بھی موجود ہیں۔ اس باغ کی ایک اور منفرد بات یہ ہے کہ اس کے بالکل آخر میں وہ جگہ ہے جو شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھی، جہاں وہ آکر ٹھہرتے تھے، جسے شاہی کونہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

شالیمار باغ، لال قلعے اور شاہجہان آباد (دلی) سے کافی فاصلہ پر واقع ہے۔ اس لیے یہ بادشاہ کی تفریح کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ لاہور کا شالیمار باغ بھی قلعے سے دور ہے، جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ بادشاہ سلامت تفریح اور جنگ کو علیحدہ رکھتے تھے۔ ایک طویل عرصے تک یہ باغ مراٹھوں کے زیر قبضہ بھی رہا۔ انگریزوں نے بھی اس پر

قبضہ کیا اور دہلی میں برطانوی باشندوں نے بھی اس سے لطف اٹھایا کئی انگریزوں نے تو اسے اپنی نجی ملکیت بھی بنایا، جس نے اس باغ کی تباہی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔



Shala Mar Bagh Dehli Photo Credit:  
<https://thenomadicguy.files.wordpress.com>

میں یہاں پر ایک دلچسپ بات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ لاہور کے اندر سات مشہور مقامات ہیں، جہانگیر کا مقبرہ، بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، داتا علی ہجویری کا مزار، شالیمار باغ، شاہدرہ اور شیخوپورہ میں واقع ہرن مینار۔ بالکل اسی طرح دہلی میں بھی سات مشہور عمارتیں موجود ہیں۔ ان کے نام کچھ اس طرح سے ہیں، ہمایوں کا مقبرہ، جامع مسجد، لال قلعہ، نظام الدین اولیاء کا مزار، شالیمار باغ، شاہدرہ اور قطب مینار۔ یہ دہلی اور لاہور کے درمیان پائی جانے والی دلچسپ مماثلت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ دونوں شہر دریا کے کنارے واقع ہیں؛ ایک جمنا کے اور دوسرا راوی کے اور دونوں مغلیہ سلطنت کے پایہ تخت بھی رہے ہیں۔

چاندنی چوک سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر شاہدرہ کا بھی ایک علاقہ موجود ہے۔ دلی سے میرٹھ جانے والی سڑک پر ہونے کی وجہ سے یہ قدیم وقتوں قافلوں کے

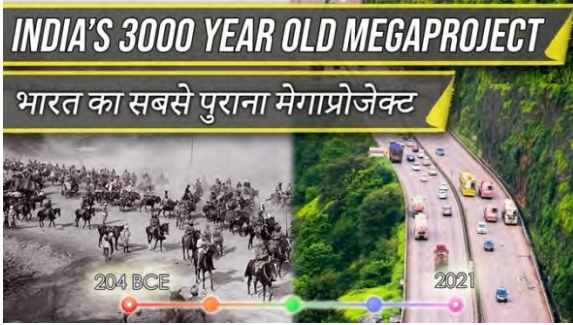
ٹھہرنے کے لیے بھی مشہور تھا۔ شاہدرہ کا مطلب ہے بادشاہوں کا دروازہ۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقہ مغلیہ سلطنت کے دور میں آباد ہوا۔ اس سے قبل یہاں پر چندرولی گاؤں موجود تھا اور اب یہ اناج کی ایک بڑی منڈی کے طور پر جانا جاتا ہے۔

### جی ٹی روڈ: پچیس سو سال پرانی سڑک

ہم نے صبح آٹھ بجے کے قریب اپنا سفر شروع کیا۔ ہماری منزل چندی گڑھ تھی۔ جیسے ہی ہم شہر سے نکلے تو ہم نے جی ٹی روڈ پر سفر شروع کر دیا۔ (جی ٹی روڈ یعنی گرینڈ ٹرنک روڈ، یہ نام انگریزوں کا دیا ہوا ہے)۔ یہ ایک طویل سڑک ہے جو کابل سے شروع ہو کر پاکستان اور بھارت سے ہوتی ہوئی بنگلہ دیش تک جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں اطراف بے حد ٹریفک تھی لیکن جیسے ہی ہم شہر سے باہر نکلے تو اس میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ مجھے اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں بھارت میں ہوں۔ سڑک کے دونوں طرف دوکانیں، دکانوں کے آگے پھر دکانیں اور پھر ٹھیلے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہمارے ہاں کی بسوں اور ویگنوں کے ڈرائیورز اور ان کے ڈرائیورز کا استاد ایک ہی ہے۔ کسی بھی طرح کا کوئی بھی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو راستے میں آنے والے مختلف شہروں کے بارے میں بتاؤں میں چاہوں گا کہ آپ کو جی ٹی روڈ کی کہانی سناتا چلوں۔

جی ٹی روڈ کو اس سے پہلے کئی ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے جن میں اتھراپا تھ، سڑک اعظم، بادشاہی سڑک، اور سڑک شیر شاہ، شامل ہیں۔ یہ ایشیاء کی قدیم ترین چوبیس سو کلومیٹر طویل سڑک ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی تعمیر کا آغاز آج سے پچیس سو سال قبل ہوا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب وسطی ایشیا اور ہندوستان کے لوگوں کے درمیان رابطہ ہوا تو یہی وہ راستہ تھا جس پر لوگ سفر کیا کرتے تھے۔ اس کے نقشے کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک سرمایہ دار کی سرحد پر جبکہ دوسرا کابل میں ہے۔ اس

طرح یہ سڑک افغانستان، پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کو آپس میں ملاتی ہے۔ ہر ملک نے اپنے حساب سے اس کا نمبر رکھا ہوا ہے۔ پاکستان میں جی ٹی روڈ کے اس حصے کو N-5 کہتے ہیں جو لاہور سے براستہ، گوجرانوالہ، گجرات، لالہ موسیٰ، جہلم، راولپنڈی اور پشاور تک جاتا ہے، لیکن عام لوگ اسے جی ٹی روڈ ہی کہتے ہیں۔



GT Road Photo Credit: kukufm.sng

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ چند رگپتا موریہ نے اس شاہراہ کا آغاز کیا تھا۔ ابتداء میں اس نے اسے گنگا سے لیکر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد تک پھیلا دیا تھا۔ اشوک نے بھی اس کی بہتری کے لیے بہت کام کیے۔ مغلوں اور انگریزوں کے علاوہ شیر شاہ سوری نے بھی اس کی تزین و آرائش میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پرانی سڑک کو شیر شاہ سوری نے ہی نئے سرے سے دوبارہ بنایا۔ اس وجہ سے بھی سوری کو کافی نیک نامی ملی۔ اس نے سڑک کے ساتھ ساتھ سرائیں بھی تعمیر کروائیں۔ جنہیں پختہ کرنے کا کام 1833ء سے 1860ء کے درمیان برطانوی دور میں ہوا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شمال سے آنے والے قافلے، صوفیا اکرام اور جنگجو اسی راستے سے آتے رہے ہیں۔ آج بھی یہ سڑک ایک اہم تجارتی سڑک مانی جاتی ہے۔

آج ہم بھی اسی سڑک پر سفر کر رہے تھے جہاں لوگ صدیوں سے سفر کرتے آئے ہیں۔ ایک قدیم راستے پر چلتے وقت، قدیم قافلوں کی یاد ایک قدرتی امر ہے۔

**نریلا: جہاں چھ سو سال پرانا تالاب اور مراٹھوں اور ابدالی کامیدان جنگ**

یاد رہے دہلی بھی بھارت کی باقی ریاستوں کی طرح ایک ریاست ہے۔ (جیسے پاکستان میں اسلام آباد ایک الگ علاقہ ہے۔) اس کے کئی اضلاع ہیں جن میں ایک شمالی ضلع بھی ہے۔ نریلا اسی ضلع کا ایک قصبہ ہے جو دہلی سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر دہلی اور ہریانہ کی سرحد پر واقع ہے۔ دہلی کی قربت کی وجہ سے اس شہر نے بھی کافی تیزی سے ترقی کی ہے۔

نریلا میں واقع ایک علاقے بھور گڑھ میں آثار قدیمہ کے ماہرین نے کھدائی کی اور ان کی رائے کے مطابق یہ علاقہ انڈس ولی تہذیب کا ایک نمایاں حصہ تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر سات ہزار سال پہلے بھی آبادی تھی۔ اس علاقے میں واقع ایک سرانے کا ذکر جہانگیر نے بھی کیا ہے، وہ اس سرانے میں ٹھہرا بھی تھا۔ اس جگہ کی اہمیت اس طرح بھی ہے کہ یہاں دہلی سے باہر جانے والی فوجوں کا اکٹھا ہوتا تھا اور حملے کے لیے تیاری کی جاتی تھی۔ یہاں پر موجود تالاب بھی ایک قدیم روایت کا حامل ہے۔ یہ تالاب چھ سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تالاب ہمیشہ بھرا رہتا تھا لیکن اب خشک ہو گیا ہے۔ میں نے اس کی وڈیو بھی دیکھی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تالاب کافی وسیع تھا۔ اسے کس نے بنایا؟ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ بات مصدقہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی یہ تالاب موجود تھا۔

اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اگرہ سے کابل تک کا علاقہ ہمیشہ ہی جنگ و جدل کا میدان رہا ہے لیکن چند بڑی جنگیں دہلی سے پانی پت کے درمیان ہی

ہوئیں ہیں۔ نریلا کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مراٹھوں اور ابدالی کے درمیان پانی پت کی بڑی جنگ ہونے سے قبل ان کے دستوں کے درمیان پہلی جھڑپ نریلا میں ہی ہوئی تھی۔ جس میں مراٹھوں نے ابدالی کی فوج کو شکست دی تھی۔ اس جیت نے مراٹھوں کو جیت کے نشہ میں مبتلا کر دیا اور وہ ابدالی کو ایک آسان دشمن سمجھ بیٹھے۔ اس کے برعکس اس شکست نے ابدالی کو چوکنا کر دیا۔ مراٹھوں کی وہ پہلی جیت ان کی آخری شکست کا باعث بنی۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔

انھی سوچوں میں گم ہم چند گڑھ کی طرف سفر کر رہے تھے۔ میرے جذبات کٹرول سے باہر ہو رہے تھے۔ میں وہاں جا رہا تھا جہاں ہم صدیوں سے آباد تھے لیکن پھر ایک دن سب ہی ہمارے دشمن ہو گئے۔ میں تصور میں اس گلی کو دیکھ رہا تھا جہاں میرے والد محترم کی پیدائش ہوئی اور ان کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔

**سونی پت: جہاں بابا بندہ سنگھ نے مغلوں کی شکست دی اور سکھ ریاست قائم کی**

پانی پت کا نام تو بہت سننے میں آتا ہے لیکن سونی پت پہلی دفعہ سننے کو ملا۔ جیسے ہی ہم نریلا سے آگے نکلے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ علاقے ہمارے پنجاب سے کافی ملتے جلتے تھے۔ لوگوں کی رنگت اور قد کاٹھ بھی ہمارے جیسا ہی تھا۔ یہ اس وجہ سے بھی تھا کہ ہم ایک مرتبہ پھر ریاست ہریانہ میں تھے جو کبھی پنجاب کا حصہ تھی۔ میں نے اپنے پاس موجود کتاب میں اس علاقے کے بارے میں پڑھا تو مجھے یہ اندازہ ہوا کہ یہ شہر بھی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

یہاں سے دوائی شخصیات کا تعلق ہے جو تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ ایک بابا بندہ سنگھ، ایک سکھ جرنیل جس نے سب سے پہلے سکھوں کی طرف سے مغلیہ سلطنت کو لاکارا۔ اس نے خوب مقابلہ کیا لیکن آخر کار گرفتار ہوا اور مغلوں نے اسے

شدید تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا۔ دوسری شخصیت شیخ خضر ہیں جن کا مقبرہ بے حد خوبصورت اور قابل دید ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ سونی پت اور اس کے ارد گرد واقع چند اہم مقامات کا ایک مختصر تذکرہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ (سیالکوٹ میں سونی نام کے کئی خاندان آباد ہیں)۔

سونی پت ریاست ہریانہ میں واقع ایک شہر ہے جو دہلی سے تقریباً پینتالیس کلو میٹر کے فاصلے پر موجود ہے۔ کسی وقت اس کا نام سوارنپراستھا بھی تھا جو بعد میں سورنپراستھا (سونے کا شہر) میں تبدیل ہو گیا۔ اب اسے سونی پت ہی کہتے ہیں۔ اس شہر کا ذکر مہابھارت میں بھی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک قدیم شہر ہے جس کی تاریخ مہابھارت سے بھی پرانی ہے۔

سونی پت کے بارے میں آئین اکبری میں درج ہے کہ یہ اکبر کے دور میں ایک امیر شہر تھا اور اسے ایک الگ پرگنا کا درجہ بھی حاصل تھا۔ اس شہر سے اکبر کو کثیر تعداد میں مال و دولت اور فوجی ساز و سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ اس وقت یہاں پر ایک قلعہ بھی موجود تھا۔ سونی پت کی مجموعی آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس شہر میں مردوں کی شرح خواندگی نوے فیصد سے بھی زائد ہے۔

### خواجہ خضر ایک مشہور صوفی بزرگ

خواجہ خضر سولہویں صدی کے ایک مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں، سونی پت میں ان کا مقبرہ بھی موجود ہے۔ یہ مقبرہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ آپ دریا خان کے بیٹے تھے۔ ان سے متعلق تاریخ میں ملتا ہے کہ ان کے مقبرے کی تعمیر امیر اہیم لودھی نے کروائی تھی۔ یہ مقبرہ سونی پت کے علاقے جٹ واڑہ میں شہری علاقے سے



ہٹ کر ایک نیم شہری جگہ پر واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف سرسبز و شاداب باغ ہیں۔ یہ مقبرہ ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ یہاں کثیر تعداد میں لوگ منٹیں ماننے آتے ہیں۔ اس کی فن تعمیر دیکھنے کے لیے بھی یہاں سیاحوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ یہ مقبرہ دس ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس وقت اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھارتی حکومت پر ہے۔

میں نے اس مقبرے کی تاریخ جاننے کی کوشش کی تو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ ایک صاحب، جن کا نام دریا خان سروانی تھا، سکندر لودھی (ابراہیم لودھی کے والد) کے دربار میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے کا نام خضر تھا۔ میں نے مناسب کوشش کی کہ یہ جان سکوں کہ کیا یہ ان کا اصل نام تھا یا مسلمانوں میں مشہور خواجہ خضر نامی کے ایک مشہور بزرگ، جن کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ ایک زندہ صوفی ہیں لیکن پوشیدہ ہیں اور مشکل وقت میں لوگوں کی مدد کے لیے آتے ہیں۔ وہ ایک صوفی منش انسان تھے اور اپنے والد کی طرح کسی دربار سے منسلک نہیں تھے۔ ان کی وفات پر سکندر لودھی نے ان کے مقبرے کی تعمیر شروع کی لیکن وہ اسے مکمل نہ کروا سکا۔ بعد ازاں ابراہیم لودھی نے اس کی تکمیل کی۔



Khaja Khizer Tomb Soni Pat Photo Credit:  
<https://www.tripadvisor.com>

یاد رہے سونی پت اور پانی پت ہی وہ علاقے ہیں جہاں بابر اور لودھی کے درمیان ایک جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ کی ابتدا بھی لودھی خاندان میں ایک جھگڑے سے ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابراہیم لودھی کا چچا دولت خان پنجاب کے علاقے کا گورنر تھا۔ وہ اپنے بھائی سکندر لودھی کی وفات کے بعد حکمرانی کا دعویدار تھا لیکن اس کی بجائے سکندر کے بیٹے ابراہیم نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس بات سے ناراض ہو کر دولت خان نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا اور اسے ہر طرح کی مدد فراہم کرنے کی یقین دہانی بھی کروائی۔ اور پھر وہی ہوا۔

بابر آیا، گھر کا بھیدی اس کے ساتھ تھا، جس علاقے میں جنگ لڑی گئی وہاں دولت خان مدت سے رہ رہا تھا اور اس نے بابر کا دل و جان سے ساتھ بھی دیا۔ ابراہیم میدان جنگ میں مارا گیا۔ مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ لودھی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ دولت خان کو کیا ملا حقیقت تو معلوم نہیں لیکن میں اتنا ضرور اندازہ کر سکتا ہوں کہ غداروں کو ذلت کے علاوہ کچھ نہیں ملتا!



Khaja Khizer Tomb marble Photo Credit:  
<https://trip101.com>

### سونی پت کی جنگ جو سکھوں اور مغلوں کے مابین لڑی گئی

جب ہم سونی پت سے گزر رہے تھے تو ہم ایک جگہ پر چائے کے لیے رکے۔ ہماری گاڑی کا ڈرائیور ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جس نے پورے راستے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ فرنٹ سیٹ پر مانگٹ صاحب کا بیٹا بیٹھا ہوا تھا، کچھلی دو سیٹوں پر میں اور شاہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اس کی خاموشی کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔ جب ہم چائے کے لیے ایک ڈھابے پر رکے تو وہ ہم سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اس کے پاس بیٹھ گیا اور بات کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جیسے ہی میں اس کے پاس جا کر بیٹھا وہ وہاں سے اٹھ کر کسی دوسری جگہ بیٹھ گیا۔ جس سے میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سب دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی خاص بات تو ضرور ہے جو وہ ایسا کر رہا ہے۔ بعد ازاں مجھے اس کا بات پتہ چلا کہ وہ کسی نیچ ذات سے تعلق رکھتا تھا جنہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ میرے لیے یہ سب بہت ہی مختلف تھا۔



Jurasik Park Sonipat Photo Credit: <https://trip101.com>

ایک شخص ہماری گاڑی چلا سکتا ہے، ہماری خدمت کر سکتا ہے لیکن ہمارے ساتھ بیٹھ کر چائے نہیں پی سکتا۔ ایسا بھارتی معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم کی وجہ سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اس میں کافی کمی واقع ہو رہی ہے کیونکہ میں آج سے بیس سال پرانی بات کر رہا ہوں۔

میں تو اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن وہ اپنی معاشرتی روایات کا پابند محسوس ہوتا تھا!

جب ہم سونی پت میں تھے تو مجھے یہاں پر ہونے والی ایک جنگ یاد آگئی۔ اس جنگ میں سکھوں کی طرف سے بندہ سنگھ بہادر، جبکہ دوسری طرف مغل سلطنت تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ میرے بزرگ بھی کبھی کبھی بندہ سنگھ بہادر کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ بندہ سکھ کا تعلق ان کے علاقے سے تھا اور اس نے مغلوں کو لاکھڑا تھا۔ ہم اس جنگ والے علاقے سے گزر رہے تھے۔ اس جنگ کا مختصر ذکر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

بندہ سنگھ بہادر: ایک بہادر شخص جس کا ذکر آج بھی سکھ عزت سے کرتے ہیں

بندہ سنگھ بہادر 1670ء میں دہلی کے ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوا۔ ان کا پیدائشی نام کچھمن داس یا کچھمن دیوتھا۔ یاد رہے کہ آغاز میں ہندو دھرم کے لوگ ہی سکھ دھرم اختیار کرتے تھے۔ میں نے سندھ میں کئی مندر دیکھے ہیں جہاں بابا گورو نانک کی تصاویر لگی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ایک مسلمان عالم نے ان کے بارے میں ایک کتاب لکھی جس میں انہیں ایک بت شکن کا خطاب دیا گیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ کسی بھی گردوارے میں کوئی بھی مورتی نہیں ہوتی۔ وہ پندرہ سال کی عمر میں گھر سے نکل گئے تھے۔ ایک وقت آیا کہ وہ گرو گوبند سنگھ کے شاگرد بن گئے، جن کی زندگی کا بڑا حصہ سکھ افواج کو اکٹھا کرنے اور مغلیہ سلطنت کے خلاف جنگ میں گزرا۔ سکھ دھرم میں داخل ہونے کے بعد انھیں بندہ سنگھ بہادر کا نیا نام دیا گیا۔ بندہ سنگھ بہادر کا کارنامہ اگر صرف جنگ جیتے تک ہوتا تو بھی قابل ذکر ہوتا لیکن انھوں نے ایک ایسا کام کیا جو ہندوستان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ مسلمان تاریخ دانوں نے ان کا ذکر مسلمانوں کے ایک قاتل کے طور پر کیا ہے جس نے پنجاب میں مسلمانوں کے سفاک طریقے سے قتل کیا اور ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

گورو گوبند سنگھ نے برکت کے طور پر اسے پانچ تیر دیئے تھے۔ گورو گوبند سنگھ سے ملاقات کے بعد انھوں نے کھنڈا کی طرف مارچ کیا اور سوئی فوج کی مدد سے سوئی پت کی لڑائی میں مغلوں کا مقابلہ کیا۔ بندہ سنگھ بہادر سوئی پت آیا جہاں اس نے ایک بڑی فوج کو جمع کیا۔ اس کی پہلی بڑی لڑائی نومبر 1709ء میں مغلوں کے خلاف اسی علاقے میں ہوئی جس کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت کے صوبائی دارالحکومت سمانا سے مغلوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ سمانا بھارتی ریاست پنجاب کے ضلع پٹیالہ کا صدیوں پرانا ایک اہم شہر ہے۔ (میرے آباؤ اجداد کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا)۔ جنگ جیتنے کے بعد اس نے ایک

ریاست کا اعلان کیا اور ایک ایسا کام کیا جس کی کسی کو بھی توقع نہ تھی۔ اس نے علاقے میں موجود زمینداروں کا نظام ختم کر دیا اور ان سے حاصل کی ہوئی زمین کو کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا۔ بعد ازاں بندہ سنگھ کو مغلوں نے پکڑ کر تشدد کر کے قتل کر دیا۔

سامانا میں مغلیہ سلطنت کے لیے سکے ڈھالے جاتے تھے، جہاں بندہ سنگھ بہادر کی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ اس طرح سکھ معاشی طور پر مستحکم ہو گئے۔ اسکے بعد بندہ سنگھ بہادر کی فوجوں نے مصطفیٰ آباد (جس کا نام اب سرسوتی نگر ہے)، سدھوڑہ (جگادھری کے قریب)، ملیہ کوئلہ اور نہان سمیت ستلج کے قریب واقع پنجاب کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

اسی دوران 1710ء میں سکھوں نے سرہند کے گورنر وزیر خان اور دیوان سوچانند کو ہلاک کر دیا۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے گرو گوبند سنگھ کے دو چھوٹے بیٹوں کو دیوار میں چنوا یا تھا۔ (میں نے شیر گڑھ میں واقع ایک گردوارہ میں وہ دیوار دیکھی تھی جس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ اس میں ان بچوں کو زندہ چنوا یا گیا تھا۔ ایسا فعل ہر لحاظ سے قابلِ مذمت ہے)۔ اس دور میں سکھوں نے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ انھی وقتوں میں بندہ سنگھ نے حکم دیا کہ زمین کی ملکیت کسانوں کو دی جائے تاکہ وہ وقار اور عزت نفس کے ساتھ زندگی گزاریں۔ ایسا حکم تاریخ ہندوستان میں کہیں نہیں ملتا۔

بندہ سنگھ بہادر یہ سمجھتا تھا کہ بڑے زمیندار کسانوں کا استحصال کرتے ہیں۔ اس نے کسانوں کو حق ملکیت دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سرکاری افسران کے خلاف بھی سخت اقدامات کیے۔ اس کی انھی کاوشوں کی وجہ سے اسے آج بھی اس علاقے میں ایک بھگوان کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ ایک سکھ جرنیل کا کارنامہ تھا جو سکھوں کے نزدیک ایک محترم نام ہے جب کہ مسلمان اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے!

بندہ سنگھ بہادر نے مخلص گڑھ نامی قصبہ آباد کیا اور اسے اپنا دار الحکومت بنایا۔ اس کے بعد اس نے اس کا نام لوہ گڑھ (اسٹیل کا قلعہ) رکھ دیا جہاں اس نے سکوں کو ڈھالنے کا کام شروع کیا۔ اپنی حکومت اپنا سکھ کہتے ہیں کہ اس کے پر لکھا ہوتا تھا کہ لوہ گڑھ ایک ایسا شہر ہے جہاں شہری امن سے رہتے ہیں اور زندگی کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ زیب و زینت کی عکاسی کرتا ہے۔

پنجاب میں بندہ سنگھ بہادر کی حکومت صرف نصف سال تک ہی قائم رہی۔ اس کے دور میں توسیع کا عمل بھی جاری رہا۔ اس نے اتر پردیش میں بھی اپنی فوجیں بھیجیں اور سہارنپور، جلال آباد، مظفر نگر سمیت کئی مسلم اکثریتی علاقوں پر قبضہ بھی کیا۔ میرے خیال میں اس کی توسیع پسندانہ پالیسی ہی اس کے جلد زوال کا باعث بنی۔ کچھ عرصے بعد ہی مغلیہ سلطنت نے اس پر قابو پا لیا۔ یہ سب کیسے ہوا؟ اس کا مختصر ذکر پیش خدمت ہے۔

بندہ سنگھ بہادر کو شکست دینے اور اسے مارنے کے لیے ایک بڑی مغل فوج تیار کی گئی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ مغل فوج میں کوئی سکھ نہ ہو، تمام ہندوؤں کو دائرہ منڈوانے کا حکم جاری کیا گیا۔ (اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغل فوج میں ہندوؤں کی کثیر تعداد موجود تھی)۔ منعم خان، مغل فوج کا کمانڈر تھا۔ ایک طویل اور خونریز جنگ کے نتیجے میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ بندہ سنگھ بہادر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ وہی دور تھا جب مغل شہنشاہ، بہادر شاہ نے حکم دیا تھا کہ جہاں کہیں بھی کوئی سکھ ملے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔

کتنے سکھ قتل ہوئے، کسی کو بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے!

بندہ سنگھ بہادر نے ایک مرتبہ پھر سکھوں کو منظم کیا اور کئی جنگیں لڑیں اور دوبارہ ایک بڑے علاقے پر قابض ہو گیا۔ پھر لاہور کے گورنر عبدالصمد خان کی قیادت میں مغلوں کی فوج نے 1715ء میں بندہ سنگھ بہادر کی فوجوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑی۔ بندہ بہادر کی فوجیں گورداسپور میں واقع ایک گاؤں تک محصور ہو گئیں۔ مغل فوج نے اس گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ آٹھ مہینوں تک جاری رہا۔ بلا آخر سکھ ہار مان گئے۔

بندہ سنگھ بہادر کو لوہے کے پنجرے میں ڈال دیا گیا اور باقی سکھوں کو زنجیروں میں جکڑ کر دہلی لایا گیا۔ دہلی میں انھیں انتہائی ظالمانہ طریقے سے قتل کیا گیا (اس کی تفصیل لکھنا میرے بس میں نہیں ہے)۔ یہ وہ دن تھے جنہیں کوئی بھی سکھ کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ اسے سکھ اور مسلمان کی جنگ کی بجائے، تخت و تاج کی جنگ ہی سمجھنا چاہیے۔ جسے بھی تخت ملا اس نے دشمن کو تاراج کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

جسے موقع ملا اس نے وہ کیا جس کا تصور بھی محال ہے، یہ سب اپنی انا کے اسیر تھے!



Baba Banda Singh Bahadar Photo Credit:



## Times of India

آج بھی آپ کو اس علاقے میں جگہ جگہ بندہ سنگھ بہادر کے مجسمے ملیں گے۔ ابھی حال ہی میں مودی نے پنجاب کے پرکاش سنگھ بادل کے ہمراہ بندہ سنگھ بہادر کی تین سو سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک یادگار کی نقاب کشائی بھی کی ہے۔ اس سے آپ بندہ سنگھ بہادر کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک سٹال پر بندہ سنگھ بہادر کی تصویر بھی دیکھی۔ جس سے میں یہ اندازہ کر سکتا ہوں کہ بندہ سنگھ بہادر اب بھی لوگوں کی نظر میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

میں نے بھارت بھر میں جا بجا ان لوگوں کے مجسمے اور یادگاریں دیکھیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کو غیر ملکیوں سے آزاد کروانے کے لیے جدوجہد کی لیکن کسی غیر ملکی کی کوئی یادگار میری نظر سے نہیں گزری۔ اگر ہے بھی تو ان لوگوں کی خود کی بنائی ہوئیں۔ تقسیم ہند کے بعد بھارت میں کسی بھی غیر ملکی کی کوئی یادگار نہیں بنائی گئی (یہ ان غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف نفرت کا اظہار بھی ہو سکتا ہے)۔ اسکے برعکس پاکستان میں آپ کو مسلمان حملہ آوروں کی یادگاریں جگہ جگہ مل جائیں گیں۔ حتیٰ کہ پاکستان میں بننے والے کئی میزائلوں کے نام بھی ان کا نام پر رکھے گئے ہیں، جیسے غوری وغیرہ۔ اس کے مقابلے میں بھارت میں بننے والے میزائلوں کے نام انھوں نے اپنی مذہبی شخصیات کے نام پر رکھے ہیں، جیسے پرتھوی وغیرہ۔ دلچسپ یہ بات بھی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد بھارتی لوگوں نے کچھ ایسے مسلمانوں کی یادگاریں بھی بنالیں۔ جنہوں نے ہندوستان کی آزادی میں اہم کردار ادا کیا، جیسے ٹیپو سلطان۔ یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بھارتیوں نے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے والوں کی جو قدر کی۔۔۔ ہندوستان کی آزادی پر قبضہ کرنے والوں کی نہیں۔

لیکن ایک بات کاجب مجھے پتہ چلا تو میں بہت ہی حیران ہوا۔ یہ بات میں نے کبھی بھی کسی سے بھی نہیں سنی تھی۔ یقیناً آپ کے لیے بھی یہ بات ایک انوکھی بات ہو گی کہ اس علاقے میں شیخ جلی کا مقبرہ بھی ہے۔ اگلے صفحات میں شیخ صاحب کا ایک مختصر ذکر آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

## چودھری چرن سنگھ

جب ہم سوئی پت سے نکلے تو کافی دن چڑھ چکا تھا۔ سڑک پر بھی اچھی خاصی رونق بھی تھی۔ اگست کا مہینہ ہونے کی وجہ سے گرمی بہت زیادہ تھی۔ اتفاق سے ہماری گاڑی میں ایئر کنڈیشن بھی نہیں تھا۔ اگست کے مہینے میں جس کی وجہ سے موسم قدرے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بہر حال سفر میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ میں نے جب ہندوستان کی تاریخ بارے میں پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ایک صاحب جن کا نام چودھری چرن سنگھ تھا، ان کا تعلق ایک قریبی قصبہ چپارولی سے تھا۔ یاد رہے کہ ہم دریائے جمنا کے مغرب میں سفر کر رہے تھے۔ جمنا کے مغرب میں ہریانہ اور مشرق میں اتر پردیش واقع ہے۔ چپارولی دریائے جمنا کے مشرقی کنارے پر واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اتر پردیش کا حصہ ہے۔ (کسی چھوٹی جگہ سے کسی بڑی شخصیت کا تعلق بھی اسے بڑا بنا دیتا ہے۔) اسی قصبے سے چودھری چرن سنگھ نے اپنی سیاست کا آغاز کیا۔

چودھری چرن سنگھ کے بارے میں مزید پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک نظریاتی سیاست دان تھے، جنھوں نے جو امر لال نہرو کی روس نواز پالیسی کی مخالفت کی اور ناصر ف اتر پردیش کے پہلے غیر کانگریسی وزیر اعلیٰ بھی بنے بلکہ کچھ ماہ کے لیے بھارت کے وزیر اعظم بھی بنے۔ انھوں نے چھ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ یہ ساری کتابیں بہت نظریاتی اور علمی نوعیت کی ہیں۔ چودھری چرن سنگھ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

وہ بھارتی کسانوں کا ایک قابل اعتماد اور متفقہ نمائندہ تھے۔ (آج جب میں یہ سفر نامہ لکھ رہا ہوں بھارت میں کسانوں کا احتجاج جاری ہے۔)

کوآپریٹو فارمنگ، جس کا تصور آج مودی نے دیا ہے، کوئی نیا طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ تصور پہلی مرتبہ جواہر لال نہرو نے ہی دیا تھا، جس کی چودھری چرن سنگھ نے سخت ترین مخالفت کی تھی۔ (اسی وجہ سے انھیں بھارت کے کسانوں کا صحیح خیر خواہ کہا جاتا ہے۔) آج میں ان کے آبائی قصبے کے قریب سے گزر رہا تھا میں نے ان کے بارے مزید جاننے کی کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ بھارت کی سیاست میں ان کا ایک اہم کردار رہا ہے اور وہ ان چند لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے سیاسی میدان میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ علمی دنیا میں بھی اپنا نام کمایا، اصولوں کی خاطر صرف چوبیس ماہ وزیر اعظم رہنے کے بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

ان کی شخصیت کے بارے میں لکھنے کا دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ آپ کے علم میں ہو کہ بھارت ایک ایسا ملک ہے جہاں تقسیم ہند کے بعد روسی نظریات کا اہم کردار رہا ہے۔ بھارت میں بننے والی بہت سی معاشی پالیسیاں سوشلزم کو سامنے رکھ کر بنائی جاتی رہی ہیں۔ کئی ریاستیں تو کمیونسٹ بھی کہلاتی تھیں۔ مرکزی طور پر تو بہت سی کمیونزم اور سوشلزم کی پالیسیوں پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئی۔ ان کی مخالفت میں چودھری چرن سنگھ سب سے آگے رہے۔

چودھری چرن سنگھ کی زندگی کا ایک مقصد نہرو کی کسان دشمن پالیسیز کی مخالفت بھی تھا۔ انھوں نے سب سے یہ کہا کہ کسان کبھی بھی اپنی زمین سے دستبردار نہیں ہوگا (اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ ٹریکٹر لے کر دہلی کے لال قلعے کے مینار تک بھی پہنچ گیا۔) بھارت میں انھیں زرعی اصلاحات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں ہیں۔ ان کی علم دوستی کی وجہ سے اور شاید اس وجہ سے

بھی کہ میں بھی ایک کسان کا بیٹا ہوں میں نے ان کے متعلق تفصیل سے پڑھا۔ ان کی جدو جہد کا مختصر احوال پیش خدمت ہے۔

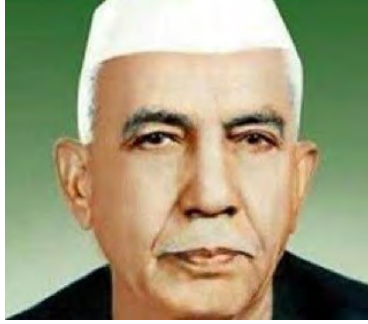
چودھری چرن سنگھ 1902ء میں ضلع میرٹھ کے ایک گاؤں میں رہنے والے جاٹ خاندان میں ہوئے اور 1987ء میں وفات پائی۔ وہ 28 جولائی 1979ء سے لیکر 14 جنوری 1980ء تک بھارت کے پانچویں وزیر اعظم بھی رہے۔ انھوں نے سیاسی زندگی کا آغاز گاندھی کے ساتھ مل کر کیا اور تحریک آزادی ہند کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ انھیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ وہ آزادی سے قبل، سن 1937ء میں منتخب ہونے والے متحدہ صوبوں کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ ایک وقت میں وہ کانگریس کے چوٹی کے تین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ بحیثیت وزیر برائے زرعی اصلاحات کے طور بھارت میں ہونے والی زرعی اصلاحات میں ایک اہم کردار ہے۔ ایک طرح سے وہ پہلے ایک کانگریسی لیڈر ہیں جنہوں نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی سوشلسٹ اور اجتماعی زمین کی پالیسیوں کی عوامی سطح پر مخالفت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے شمالی ہندوستان میں ذات پات میں پسے طبقوں اور کسانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی اور یہ سب لوگ انھیں اپنا لیڈر تسلیم کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں کانگریس کی پالیسیوں کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ اپنے انھیں خیالات کی وجہ سے وہ کانگریس سے الگ ہو گئے اور اپوزیشن پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ایک وقت آیا کہ وہ یوپی کے پہلے نان کانگریسی پہلے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ بعد میں 1979ء میں بھارت کے وزیر اعظم بن گئے اور صرف چوبیس ہفتوں کے بعد انھوں نے اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ جس کی ایک بڑی وجہ اندرا گاندھی کے ہنگامی حالات سے متعلق عدالتی معاملات واپس لینے کے لیے دباؤ تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی موت تک حزب اختلاف میں شامل رہے۔

چودھری چرن سنگھ کا تعلق راجہ نہار سنگھ جو فرید آباد میں واقع بال بھگڑھ ریاست کا ایک بہت بڑا حکمران سے تھا۔ اس کا تعلق جاٹ قبیلہ کی ایک شاخ تیوتیہ گوتر سے تھا۔ یہ ایک جاٹ ریاست تھی جو اپنے وقت کی ایک چھوٹی مگر امیر ریاست ماننی جاتی تھی۔ اس خاندان کے سورج مل کے ساتھ خاندانی تعلقات بھی تھے۔ راجہ نہار سنگھ کو بغاوت کے جرم میں دہلی کے چاندنی چوک میں سرعام پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا تھا۔

کیا اس کے باوجود بھی انگریزوں کو ہندوستان میں چند ترقیاتی کام کرنے کے بنا ء پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے، قطعی طور پر نہیں!

اس طرح ان کی ریاست کا خاتمہ انگریزوں کے ہاتھوں ہوا۔ انگریزوں کے مظالم سے تنگ آکر چودھری چرن سنگھ کے دادا اترپردیش کے ضلع بلند شہر چلے گئے تھے۔ اس ریاست کا تعمیر کردہ ایک محل اب ہریانہ ٹورزم کے تحت ہے۔ فرید آباد میں نہار سنگھ اسٹیڈیم کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ بھارتی لوگوں نے انھیں ضرور یاد رکھا جنہوں نے آزادی کی خاطر پھانسی چڑھنا قبول کیا۔ ایک میٹرو سٹیشن کا نام بھی راجہ نہار سنگھ کے نام پر رکھا گیا ہے۔



Chaudhary Charan Singh Photo Credit:

<https://all-essay.blogspot.com>

چودھری چرن سنگھ کی درج ذیل کتب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

- Joint Farming X-rayed (1959)
- India's Economic Policy – The Gandhian Blueprint (1978)
- Economic Nightmare of India: Its Cause and Cure (1981)
- Abolition of Zamindari
- Co-operative Farming X
- Prevention of Division of Holdings Below a Certain Minimum

ابھی ہم ہریانہ میں ہی میں سفر کر رہے تھے اور ہماری اگلی منزل پانی پت تھا۔ جو بھی تاریخ میں نے پڑھی ہے اس میں پانی پت کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ یہی وہ علاقے ہیں جہاں پر مہابھارت کے دور کی جنگیں ہوئی اور بعد میں بابر اور لودھی کی جنگ بھی اسی علاقے میں ہوئی اور آخری بڑی جنگ مراٹھوں اور ابدالی کے درمیان بھی اسی علاقے میں لڑی گئی۔

میں جب اس علاقے کی تاریخ نبھ پڑھ رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے بائیں طرف یعنی جی ٹی روڈ کے مغرب میں ایک بہت پرانا قصبہ موجود ہے جو ہندوؤں کے نزدیک نہایت متبرک سمجھا جاتا تھا اس کا نام گوبانا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ پرتھوی راج چوہان نے بارہویں صدی میں یہاں ایک قلعہ بنوایا تھا۔ جب غوری نے چوہان کو شکست دی تو اس نے اس کے قلعہ کو بھی تباہ کر دیا۔ ابھی بھی

اس قلعہ کی باقیات موجود ہیں۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ تمام تر علاقے کسی وقت میں چوہان ریاست میں شامل تھے۔ بعد میں ان علاقوں پر سلاطین دہلی اور مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں نے قبضہ کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد یہاں سے بہت سے مسلمان جن پر بے شمار مظالم ڈھائے گئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں آپ کو بے شمار ایسے لوگ ملیں گے جو ان علاقوں سے پاکستان میں آکر آباد ہوئے۔ ان میں سے اکثریت ہریانوی زبان بولنے والوں کی جسے کچھ لوگ کھڑی بھاشا بھی کہتے ہیں۔ (پنجابی کے بعد ہریانوی میری پسندیدہ زبان ہے۔ جو میں کسی حد تک بول بھی لیتا ہوں)

آپ ہندوستان کے جس بھی علاقے میں جائیں تو آپ کو اس علاقے کے بارے میں اگر جاننے کا موقع ملے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ علاقے ہزاروں سال سے آباد ہیں اور اپنی بڑی ہیں دلچسپ تاریخ رکھتے ہیں۔ اس تاریخ سے آگاہی ہم سب کے لیے بے حد ضروری ہے۔

جو قوم اپنی تاریخ نہیں جانتی وہ اپنا مستقبل بھی نہیں سنوار سکتی!



Agricultural scientists offer flowers to the statue of former Prime Minister Chaudhary Charan Singh on his birth anniversary. Photo Credit: www.pipanews.com





ChaudharyCharan Singh University



Village Tourism Haryana Photo Credit:  
<https://www.tripadvisor.com>

## میرٹھ اور روہتک: تاریخی قصبے

جب ہم سوئی پت سے آگے نکلے تو میں نے نقشے میں دیکھا کہ ہمارے بائیں طرف تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر روہتک شہر ہے اور دائیں طرف ساٹھ کلومیٹر کی دوری پر میرٹھ شہر موجود ہے اور ہم ان دونوں کے بیچ میں سے سے گزر رہے تھے۔ ان دونوں شہروں کی تہذیب اور زبان ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے۔ روہتکی لہجے میں اردو بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد پاکستان میں بھی آباد ہے۔ دریائے جمنا کے دوسری طرف اتر پردیش میں میرٹھ ایک ایسا شہر ہے جہاں کئی سیاسی نامور شخصیات پیدا ہوئیں جنہوں نے اردو ادب کی بے مثال خدمت کی۔ ان میں بچوں کے لیے نظمیں لکھنے والے مشہور شاعر اسماعیل میرٹھی کا نام میری نسل کے اکثر لوگوں کو یاد ہے اور ان کی مشہور نظمیں جیسے، رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی اور بچہ اور جگنو قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ دونوں شہروں میں ایک ایسا فرق ہے جس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا اور یہ شاید آپ کے لیے بھی بہت ہی اچنبھے کی بات ہوگی۔ روہتک میں مسلمان آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں ہیں جبکہ تقسیم ہند سے پہلے یہاں ایک کثیر تعداد میں مسلمان بستے تھے۔ دوسری طرف میرٹھ میں مسلمان آبادی کا تیس فیصد ہیں۔ میرے علم کے مطابق میرٹھ شمالی ہندوستان کا وہ واحد شہر ہے جہاں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ میں ان دونوں شہروں میں تو نہ جاسکا لیکن ان کی تاریخی حیثیت کی وجہ سے ان کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کی جو مجھے بے حد دلچسپ لگی۔

ان دونوں شہروں کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

شاہ صاحب نے بھی میرٹھ کے متعلق کافی کچھ بتایا اور کئی نامور شعرا کے نام بھی لیے۔ اس علاقے کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلا کہ دہلی کے قریب ہونے کی وجہ سے اس

وقت مسلمانوں کے مدارس میں فارسی ہی ذریعہ تعلیم تھا اور اردو عام طور پر گھروں میں ہی بولی جاتی تھی۔ فارسی کا چلن مغلیہ سلطنت کی وجہ سے تھا۔ جیسے ہی مغلیہ سلطنت ختم ہوئی فارسی بھی کتابوں تک ہی محدود ہو گئی۔ اس وقت برصغیر کے کسی بھی کونے میں فارسی بولی نہیں جاتی۔ اس کے برعکس انگریزوں کی سکھائی ہوئی زبان انگریزی، برصغیر کی ایک اہم زبان ہے اور غیر اعلانیہ طور پر بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کی سرکاری زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے!

## میرٹھ: جہاں سے جنگِ آزادی ہند کا آغاز ہوا

میرٹھ اتر پردیش کے مغربی حصے میں واقع ایک قدیم شہر ہے۔ اس علاقے میں وادی سندھ کی تہذیب کے آثار بھی پائے گئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں سات ہزار سال قبل بھی لوگ آباد تھے۔ بھارت میں اس کی شہرت کھیلوں کا سامان بنانے کے علاوہ موسیقی کے آلات کی صنعت کی وجہ سے بھی بہت زیادہ ہے۔ کچھ لوگ اسے "اسپورٹس سٹی آف انڈیا" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

اس شہر کے نام کی وجہ پر کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور پر اس کے نام کی وجہ، میا سورا بادشاہی ہی سمجھا جاتا ہے۔ چند سال قبل آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو میرٹھ کے قریب عالمگیر پور سے کچھ ایسی اشیاء ملی ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ علاقے وادی سندھ تہذیب کی مشرقی آبادی تھی۔ شہنشاہ اشوکا کے دور میں یعنی تین صدی قبل مسیح کے دور میں میرٹھ بدھ مت کا ایک بڑا مرکز بھی رہا ہے۔ اس دور کا یہاں ایک بڑا ستون بھی تھا جسے اشوکا ستون کہتے تھے۔ اس ستون کو فیروز شاہ تغلق دہلی لے گیا تھا۔

گیارہویں صدی عیسوی تک اس شہر پر بلند شہر کے راجپوت راجہ ہار دت کی حکومت تھی۔ اس نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا، جو اپنی مضبوطی کی وجہ سے مشہور تھا۔ محمود غزنوی نے اس علاقے پر حملہ کیا اور یہاں کے راجہ کو شکست دے کر اس شہر پر قبضہ کیا اور اپنی فتح کی یاد میں ایک جامع مسجد بھی تعمیر کروائی۔ محمود غزنوی کے واپس جانے کے بعد ایک دفعہ پھر مقامی ہندو راجا نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ ایک وقت آیا کہ محمد قطب الدین ایبک نے اس علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس وقت سے لے کر مغلیہ سلطنت کے خاتمہ تک اس شہر پر مسلمان حکمران رہے۔ کہتے ہیں کہ تیبور نے بھی 1399ء میں میرٹھ پر حملہ کیا تھا۔ مقامی مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔ تیبور نے صلح کی کوشش کی جو مقامی لوگوں نے ٹھکرادی۔ جس پر تیبور نے اس شہر کو تباہ کر دیا اور یہاں کے مردوں کو سرعام قتل کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا۔

اس کے ظلم کی داستان اب تک لوگوں کو یاد ہے، اسے پھر بھی ایک عظیم فاتح کہا جاتا ہے، میرے خیال میں وہ عظیم قاتل کھلانے کا حقدار ہے!

پھر اس کے بعد ایک وقت آیا کہ یہ شہر مغلیہ سلطنت کا حصہ بنا۔ مغل دور میں شہر میں امن امان رہا۔ یہ شہر اپنی خوشحالی کی وجہ سے کافی جانا جاتا تھا۔ مغل حکمرانوں نے اس علاقے میں عبداللہ پور میرٹھ کے سید لوگوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کی۔ جن کی اولاد اب تک اس علاقے میں ایک بااثر خاندان کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں اب بھی آبادی کا تیس فیصد مسلمان ہیں۔ بعد میں اس علاقے پر جاٹوں اور روہیلوں نے بھی حملے کیے۔ میں نے پچھلے صفحات والٹر رین ہارڈ اور اس کی ہندوستانی بیوی بیگم سمرو کا ذکر کیا تھا۔ والٹر رین ہارڈ نے بھی اسی علاقے میں سردھنہ کے نام سے ایک چھوٹی ریاست قائم کی تھی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور یہاں اپنی مشہور زمانہ میرٹھ چھاؤنی قائم کی۔ ایک وقت آیا کہ میرٹھ کی چھاؤنی انگریزوں کا

ہندوستان میں سب سے بڑا فوجی مرکز بن گیا۔ یہی وہ فوجی مرکز تھا جہاں سے 1857ء میں آزادی ہند کی ایک جدوجہد کا آغاز منگل سنگھ پانڈے کی پھانسی سے شروع ہوا۔

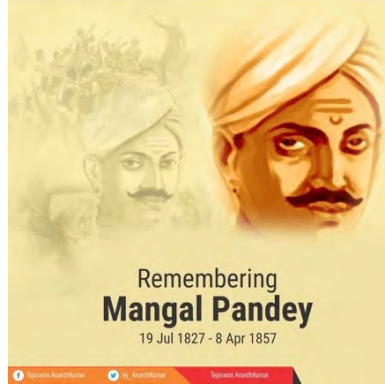


Photo Credit: tej\_ananthkumar, through  
<https://twitter.com>

میں اسے کبھی بھی بغاوت کا نام نہیں دے سکتا۔ یہ بغاوت نہیں تھی یہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کروانے کی ایک مسلح جدوجہد کا آغاز تھا جسے عام فوجیوں نے شروع کیا تھا جو اس وقت انگریزوں کی فوج میں ملازم تھے اور انگریز انہیں ہندوستان کو غلام بنا کر رکھنے کے استعمال کرتے تھے۔ ایک دن انھی وفادار فوجیوں نے انگریزوں کے خلاف ایک جنگ کا آغاز کیا۔ جو اس وقت تو کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس نے ہندوستان کے عام لوگوں میں آزادی حاصل کرنے کا ایک جذبہ بیدار کرنے میں ایک اہم کردار ضرور ادا کیا۔



Meerut Cant where in 1857, Mutiny took place Photo  
Credit: <https://scroll.in>

انگریزوں نے 1803ء میں میرٹھ چھاؤنی بنائی۔ اس کا رقبہ دس ہزار ایکڑ کے قریب ہے اور اس میں ایک لاکھ سے زائد لوگوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ انگریزوں کی دنیا بھر کی لڑائیوں میں اس فوجی مرکز کا ایک اہم کردار ہے۔ اس وقت بھی یہ مرکز بھارت فوج کا ایک اہم مرکز ہے۔

فوجی مرکز کے ساتھ ساتھ یہ شہر تعلیمی میدان میں بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس وقت (یعنی 2021ء میں) اس شہر میں پانچ یورسٹیاں، پچاس کے قریب انجینئرنگ کالجز، بیس مینجمنٹ کالجز، سات فارمیسی کالج، چار کالج ہوٹل مینجمنٹ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ سو سے زائد کالج ہیں۔ اس سے آپ اس شہر کی تعلیم کے میدان میں کام کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

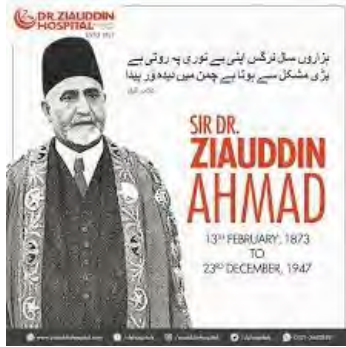
میں نے اکثر لوگوں سے یہ سنا ہے کہ مسجد قوت الاسلام دہلی شمالی ہندوستان کی سب سے قدیم مسجد ہے جو تیرویں صدی کے شروع میں ایک نے بنوائی تھی۔ لیکن میرٹھ کی تاریخ پڑھتے ہوئے معلوم ہوا کہ میرٹھ کی شاہی جامع مسجد حسن مہدی جو کہ سلطان محمود غزنوی کا ایک وزیر تھا نے 1019ء میں بنوائی تھی۔ اس طرح یہ مسجد قوت الاسلام مسجد سے دو سو سال قبل بنائی گئی تھی۔ اسی وجہ سے کئی لوگ اسے شمالی ہندوستان

کی سب سے پہلی مسجد قرار دیتے ہیں۔ میرٹھ کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ اسے دیکھنے کی خواہش دل میں موجود ہے۔ یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے معلوم نہیں۔

## روہتک: ایک قدیم مسجد اور ہندو شاہی دور کی نکسال

میرے ننھیال کے گاؤں جو کہ سرگودھا میں واقع ہے میں کئی ایسے خاندان آباد ہیں جن کا آبائی علاقہ روہتک ہے اور وہ تقسیم ہند کے وقت ظلم و بربریت کا سامنا کرتے ہوئے لٹ پٹ کر پاکستان آئے تھے۔ ان میں سے کئی میرے دوست بھی ہیں۔ ان کے ساتھ ملنے جلنے سے مجھے روہتکی لہجے میں پنجابی اور اردو زبان بھی بولنی آتی ہے۔ جب میں روہتک کے پاس سے گزرا تو مجھے وہ سب لوگ یاد آئے اور ان کی باتیں بھی جو زیادہ تر ہجرت کے متعلق ہوتی تھیں۔ ہم ایک جگہ رکے تو میں نے یہ جاننا کہ میرے ارد گرد لوگ اسی لہجے میں بات کرتے تھے جو میرے روہتکی دوستوں کا تھا۔ میں نے بھی ان سے اسی لہجے میں بات کی جس سے مجھے کئی باتیں جاننے کا موقع ملا۔ اس علاقے کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

روہتک کا دہلی سے فاصلہ ستر کلو میٹر ہے۔ روہتک ہریانہ کا چھٹا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔ اس کی مجموعی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔ اس علاقے میں آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران قدیم ہندوستان میں سکے ڈھالنے کی تاریخ کا سراغ ملتا ہے۔ ماہرین کے مطابق تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں اس علاقے میں سکوں کی ڈھلانی کا کام ہوتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ اس شہر میں کابل کے ہندو شاہی خاندان کے بادشاہ سامنت دیوتا کے سکے بھی پائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس شہر میں ایک قدیم قلعہ بھی موجود ہے۔ یہ قلعہ غوری خاندان کی حکومت کے دوران تعمیر کیا گیا تھا، بعد میں محمود تغلق بھی اس قلعے پر قابض رہا ہے۔



Sir Ziauddin Ahmad who was born in Meerut Photo  
Credit: <https://m.facebook.com>

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس علاقے میں چودہویں صدی سے حکومت کرتے آئے ہیں اسکے باوجود آبادی کے لحاظ سے مسلمان ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔ کیا اس سے کوئی یہ مطلب نکال سکتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے مقامی ہندوؤں کو تلوار کے زور پر زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اس علاقے میں مسلمان اس قدر تھوڑی تعداد میں نہ ہوتے۔ روہتک ان اضلاع میں سے ایک ہے جہاں سب سے پہلے انگریزوں نے اپنا نظام نافذ کیا تھا۔ انگریزوں نے اس علاقے کو 1800ء میں ہی برٹش انڈیا میں شامل کر لیا تھا۔ جب کہ لاہور پر قبضہ اس کے پچاس سال بعد کیا گیا تھا۔





Gurudwara Bangla Sahib Rohtak Photo Credit:  
<https://www.thetoptours.com>



Shri Krishna Arjun Rath is also placed at a nearby space of Brahma Sarovar. Photo Credit:wildfilmsindia



A 80 years old mosque..once a beautiful mosque in Rohtak current condition no Muslim left the place.

Photo Credit: <https://www.facebook.com/SaveTheMosquesOfIndia>

اس علاقے کی تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے کابل کے ہندو شاہی خاندان کے متعلق کچھ جاننے کا موقع ملا۔ میرے لیے بہت سی باتیں بڑی ہی انہونی تھیں۔ کچھ کا تذکرہ آپ کی خدمت میں بھی پیش ہے۔

## ہندو شاہی یا کابل شاہی کا دور حکومت

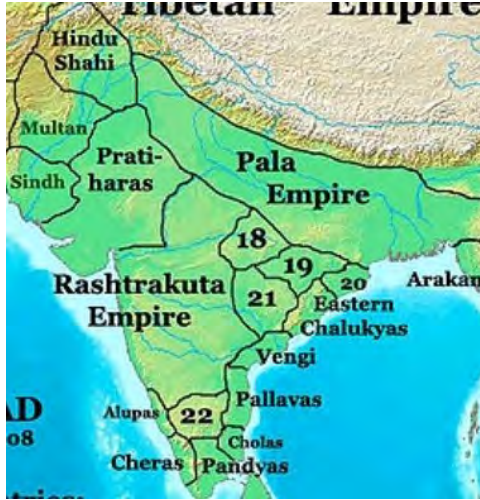
یہ بات تو ہم سب کے علم میں ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں پر تین مذاہب کے ماننے والے لوگ رہتے تھے۔ ان مذاہب کے نام ہندو مت، بدھ مت اور جین مت ہیں۔ میرے علم کے مطابق برصغیر میں اسلام کی آمد چار مختلف راستوں سے ہوئی۔ مسلمانوں کی آمد کا ایک راستہ عرب تاجر تھے جو سمندری سفر کرتے تھے اور انھوں نے جنوبی ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں اسلام کی اشاعت کا کام کیا۔ میں نے حصہ دوم میں جنوبی ہندوستان میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی ایک مسجد کا ذکر بھی کیا ہے۔

محمد بن قاسم جو آٹھویں صدی کے شروع میں سندھ میں آئے اور انھوں نے اسلام کی اشاعت میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ یہ ایک دوسرا راستہ تھا۔ جس کے ذریعہ سے برصغیر میں اسلام کی آمد ہوئی۔ ایران کی فتح کے بعد جب مسلمانوں نے موجودہ افغانستان کے مختلف علاقوں کو فتح کیا اس کے ساتھ ہی برصغیر کا مشرقی حصہ بھی اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوا۔ اس راستے سے بھی مسلمان ہندوستان میں آئے۔ اسے میں تیسرا راستہ کہتا ہوں۔ چوتھا راستہ وسطی ایشیا سے آکر مسلمانوں نے افغانستان کا شمالی علاقہ جس میں کابل وغیرہ شامل ہیں کو فتح کیا اور اس راستے سے مسلمان ہندوستان میں آئے۔



اس سے قبل برصغیر پاک و ہند اور اس کے ساتھ موجودہ افغانستان کا مشرقی علاقہ غیر مسلم حکمرانوں کے زیر تسلط تھا۔ آٹھویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک اسلام کی تعلیمات موجودہ افغانستان کے مختلف علاقوں تک ہی محدود رہیں۔ گیارویں صدی کے آغاز میں محمود غزنوی وہ پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے برصغیر پاک و ہند کے شمالی علاقہ جات میں قدم رکھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے کابل اور اس کے ارد گرد قابض ہندوؤں کی حکومت کو ختم کیا۔ اس کا آبائی وطن غزنی تھا جو کابل سے کئی سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس طرح سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں افغانستان کی فتح کا آغاز ایران کی اور وسطی ایشیا کی فتح کے بعد ہوا۔ افغانستان کو فتح کرنے والے بھی عرب تھے۔ ایران کو فتح کرنے کے بعد ایران کے شمالی علاقہ جات جو اب موجودہ افغانستان میں شامل ہیں کو ان عرب مسلمانوں نے ہی زیر کیا۔



India in 1000 CE Photo Credit: <https://dharmayudh.com>

قدیم تاریخوں میں افغانستان کے مشرقی علاقوں کو سیاسی طور پر ہندوستان کا ہی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقے میں بدھ مت اور ہندو مت کے ماننے والے لوگوں کی اکثریت تھی۔ موجودہ افغانستان کے کئی علاقوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے شمالی علاقوں میں بدھ مت کے آثار بھی موجود ہیں۔ (اس سے آگے ایران میں پارسی برسر اقتدار تھے)۔ عرب سے آنے والے لوگ اور اس کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا سے آنے والے لوگوں کو انہی لوگوں نے روکنے کی کوشش کی۔ وہ کسی حد تک تو کامیاب رہے لیکن مکمل طور پر مسلمانوں کے حملوں کو نہ روک سکے۔

موجودہ افغانستان کے مشرقی علاقے جس میں خاص طور پر کابل کا ذکر اہم ہے، محمود غزنوی کے دور میں مکمل طور پر مسلمان حکمرانوں کے تحت آ گئے۔ اس سے پہلے بھی ان علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت رہی لیکن مکمل طور پر یہ حکومت نہیں تھی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے محمود غزنوی کو سب سے پہلی جنگ 1001ء پشاور کے حکمران

راجہ جے پال سے ہی لڑنی پڑی جس میں غزنوی کو فتح حاصل ہوئی۔ اس طرح جے پال ہندو شاہی کابل کا آخری بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کی شکست کے ساتھ ہی ہندو شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور یوں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا راستہ کھل گیا اور غزنوی شمالی ہندوستان کے ساتھ ساتھ وسطی ہندوستان یعنی گجرات (سومناٹ) تک بھی پہنچ گیا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جے پال کی شکست ہندوستان میں ہندوؤں کی صدیوں پرانی حکمرانی کی تباہی کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ ہندو شاہی کابل کے دور میں استعمال ہونے والے سکے روہنگ میں پائے گئے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقے بھی ہندو شاہی کابل کے تحت تھے۔ یہ تھا ایک مختصر تعارف اس ہندو خاندان کا جو اسلام کی آمد سے قبل کابل سے لیکر متحدہ پنجاب کے مغربی علاقوں پر حکمرانی کرتا تھا۔



Rja Jay Pal Sindhu Photo Credit:  
<http://blog.chughtaimuseum.com>

میں نے شاہ صاحب سے بھی ان باتوں کا ذکر کیا۔ ان کا بھی کہنا تھا کہ آپ کی یہ بات درست ہے۔ ان کے بقول ان کے بزرگ بھی عرب سے آکر پہلے موجودہ افغانستان کے کسی شہر میں آباد ہوئے تھے اور جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو وہ ہندوستان میں آئے۔ پاکستان میں اراکین اور اعوان بڑی تعداد میں بستے ہیں جو سب عرب سے ہی آکر ہندوستان میں آباد ہوئے۔ اعوان لوگوں کا تو یہ

کہنا ہے کہ وہ غزنوی کی فوج کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ اسی طرح پاکستان میں بسنے والے پنجٹون لوگ بھی پنجٹون حملہ آوروں کے ساتھ ہی ہندوستان آئے تھے۔ ہندوستان میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو اپنا رشتہ وسطی ایشیا سے جوڑتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ وہ تیمور کی فوج میں شامل تھے اور ان میں سے کچھ یہیں بس گئے۔ اسی طرح کلاش کے لوگ اپنے آپ کو یونانی کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سکندر کی فوج کے ساتھ آئے تھے۔ ایسا ہی دعویٰ ہنزہ کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ گلگت میں ابھی بھی کئی ترک لوگ موجود ہیں جو وسطی ایشیا سے آنے والے حملہ آوروں کی اولاد ہیں۔

اوپر کی ساری بحث سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا کہ ہندوؤں نے کبھی بھی ہندوستان سے باہر اپنی حکومت قائم نہ کی ہو۔ کابل ہندو شاہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوؤں کی حکومت ہندوستان سے باہر بھی رہی ہے۔

میرا خیال ہے جس کے پاس بھی طاقت تھی اس نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سب نے ایک سا ہی وتیرہ اختیار کیا۔

## حصار: ایک قدیم شہر

جیسے ہی ہم سوئی پت سے نکلے تو ہم ایک ایسے علاقے میں تھے جہاں پر موجود کئی ایسے شہر تھے جن کے نام بارہا سننے کو ملتے ہیں۔ ان میں حصار، رومڑکی، کرناں، مظفر نگر اور پانی پت کے علاوہ کئی اور نام بھی ہیں۔ پاکستان میں بہت بڑی تعداد خاص طور پر پنجاب میں ایسے لوگوں کی ہے جو ان علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ وہ اپنی منفرد بود و باش، مختلف لب و لہجہ اور زبان کی وجہ سے آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ آج جب ہم اس علاقے سے گزر رہے تھے تو میں نے یہ محسوس کیا یہاں کے لوگوں کی بول

چال بھی جانی پہچانی ہے۔ یہ صرف اس لیے تھا یہاں سے گئے ہوئے لوگوں سے میری کافی واقفیت ہے۔

میرے لیے سب سے حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان علاقوں میں مسلمان ایک بڑی تعداد میں رہتے تھے لیکن اب ان علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔ اتنی کم تعداد کی کوئی بھی حیثیت نہیں ہوتی اور ایسی اقلیت کو زندہ رہنے کے لیے بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ لوگوں سے بات کرنا چاہی لیکن مجھے کوئی خاص معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ صرف اتنا ہی پتہ چلا کہ جب پورے محلے میں مسلمانوں کا ایک ہی گھر ہوگا اس کی کیا حیثیت ہوگی۔

اس بات کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ دہلی میں ایک ہندو خاندان کی عورت میں سے میں نے پوچھا کیا آپ کے محلے میں کوئی مسلمان بھی رہتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک خاندان ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا ان سے کیسا برتاؤ ہے؟ ان کا جواب تھا کہ کیونکہ وہ بہت ہی کمزور ہیں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے ان کے ساتھ ہمارا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ ہم سب ان کے ساتھ ہمدردی کا رویہ رکھتے ہیں۔

مجھے ان کی اس بات پر کافی حد تک یقین آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب میں اپنی والدہ کے گاؤں گیا جو سکھوں پر مشتمل ہے اور اب اس میں صرف ایک مسلمان گھر ہے۔ مسلمان اس گاؤں کے چوکیدار بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ سکھوں کے جانور بھی چرانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ یہ بات میں نے ان سے بھی پوچھی تھی۔ انھوں نے کہا تھا ہم تو صرف ایک خاندان ہیں اس لیے ان کے ساتھ ہمارا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ جب مقابلہ ہی نہ ہو تو پھر ایک کے پاس ہمدردی کے اور دوسرے کے پاس اطاعت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچتا۔



بہر حال اقلیت کبھی بھی اکثریت کا مقابلہ نہیں کر پاتی۔ وہ ہمیشہ ہی نفسیاتی طور پر دباؤ میں رہتی ہے۔ ایسا ہی اس علاقے میں تھا، جس سے ہم گزر رہے تھے۔ میں باوجود کوشش کے کوئی ایسی دکان نہ دیکھ سکا جسے کوئی مسلمان چلا رہا ہوں۔ میرے خیال میں یہاں جو بھی مسلمان ہیں ان میں سے اکثریت محنت مزدوری ہی کرتی ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو پانی پت کے بارے میں کچھ بتاؤں جس کے بارے میں یقیناً آپ بھی جاننا چاہیں گے میں حصار اور اس کے ساتھ ساتھ روہڑکی، جو ایک صدیوں پرانے علاقے ہیں کے متعلق کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

حصار دہلی کے مغرب میں 164 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس شہر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر پر تیسری صدی قبل مسیح میں موریه خاندان کی حکومت تھی۔ اس طرح سے یہ شہر دو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ بارہویں صدی تک یہاں پر مختلف ہندو راجاؤں کی حکومت رہی ہے۔ بعد میں سلاطین دہلی بھی اس علاقے پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ یہ شہر مغلیہ سلطنت کا بھی حصہ رہا ہے۔

حصار کے قریبی مقامات پر آثار قدیمہ کی کھدائی سے پتہ چلا ہے کہ اس جگہ پر ہڑپہ دور میں بھی آبادی تھی۔ بعد میں یہاں ریاست حصار قائم ہوئی جس کا جس کا پایہ تخت اگر وہ تھا۔ یونانیوں کے خلاف جنگ اس علاقے کے لوگوں نے ممکنہ طور پر چندرگپت موریه کی مدد کی۔ بعد میں یہ علاقے موریه سلطنت کا حصہ بھی رہے۔ پرتھوی راج کی شکست کے بعد غوری بھی اس علاقے پر حکومت کرتا رہا۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ موجودہ شہر حصار فیروزہ، فیروز شاہ تغلق نے 1354ء میں آباد کیا تھا۔ اس شہر کے چار دروازے ہیں، جن کے نام دہلی گیٹ، موری

گیٹ، ناگوری گیٹ اور طلّی گیٹ ہیں۔ یہاں پر ایک قلعہ بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ اس قلعے کے وسط میں فیروز شاہ محل بھی موجود ہے۔ اس قلعے میں کئی اور عمارتیں بھی ہیں جن میں ایک اہم فیروزہ حصار محل ہے جو بادشاہ سلامت نے اپنی ایک گجری بیوی کے لیے بنایا تھا۔ اس قلعہ پر تیمور نے 1398ء میں حملہ کیا اور حسب معمول لوٹ مار کرنے کے بعد اس کے فوجیوں نے قلعے کو آگ لگا دی تھی۔ لودھی کو شکست دینے کے بعد باہر نے بھی اس قلعہ پر قبضہ کیا۔ یہ شہر سن 1760ء تک مغلوں کے قبضے میں رہا بعد میں مقامی لوگوں نے ایک طرح سے آزادی کا اعلان کر دیا۔

فیروز شاہ تغلق کا بنایا ہوا یہ کمپلیکس فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ اس کمپلیکس میں کئی عمارتیں ہیں جس میں دیوان، عام، دیوان خاص اور بھی کئی۔ یہاں پر ایک کونے میں ایک چوترا بنا ہوا ہے۔ جس پر بیٹھ کے فیروز شاہ تغلق فیصلے کیا کرتا تھا۔ اس تخت کے بالکل نیچے ایک گہرا کنواں بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ تغلق نے یہ کنواں اس لیے بنوایا تھا کہ اگر وہ کوئی غلط فیصلہ کرے گا تو یہ تخت ٹوٹ جائے گا اور وہ سیدھا کنویں میں گر جائے گا۔

شروع میں حصار شہر، قلعے کے اندر تک ہی محدود تھا۔ جس کے چار دروازے تھے۔ اس محل میں ایک مسجد بھی بنائی گئی جس کو لاٹ کی مسجد کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کے ساتھ بھی ایک کہانی منسوب ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے حصہ اوّل میں میرٹھ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ فیروز شاہ تغلق وہاں سے اشوکا ستون اٹھا کر لایا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے یہ ستون چار حصوں میں تقسیم کر کے اس مسجد کے صحن میں دوبارہ جوڑ کر کھڑا کیا۔ جس کی وجہ سے اس مسجد کو لاٹ کی، یعنی ستون کی مسجد کہا جاتا ہے

ہندوؤں کا کہنا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کے لیے بھی مسجد قوت الاسلام کی طرح کئی مندر تباہ کیے گئے اور ان سے سامان اٹھا کر یہ مسجد تعمیر کی گئی۔ اس بات کے ثبوت کے

طور میں وہ یہاں کئی پتھروں پر سنسکرت زبان کی موجودگی کا سہارہ لیتے ہیں۔ اس دعویٰ کی سچائی میں ہندوؤں کے پاس مسجد میں لگے ہوئے ستون بھی ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوؤں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس ستون کا ایک حصہ فتح آباد میں واقع مسجد میں لگایا گیا تھا۔ اشوکا کے بنائے ہوئے اس طرح کے ستون ہندوستان کے کئی اور علاقوں میں بھی پائے گئے ہیں۔ ان ستونوں پر اس دور کی زبان میں تحریر بھی لکھی ہوئی ہے۔ جسے، انگریز جیمس پرنسپ نے جو اس زبان کا ماہر تھا نے ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ ستون اڑھائی سو قبل مسیح میں بنائے گئے تھے۔ میں اس کمپلیکس کو دیکھ تو نہ سکا لیکن میں نے اس کمپلیکس کی کئی وڈیو دیکھی ہیں جو ان سب باتوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس وقت شہر میں مسلمانوں کی آبادی بہت ہی کم ہے۔ اس لیے معلوم نہیں کہ یہ مسجد آباد بھی ہے کہ نہیں۔ وڈیو سے یہ لگتا ہے کہ یہ مسجد آباد نہیں ہے۔ یہاں لوگ صرف ایک قدیم کمپلیکس کو ہی دیکھنے آتے ہیں۔ اس کا انتظام اب بھارتی حکومت کے پاس ہے۔

انگریزوں سے پہلے ایک آئرش نے اس علاقے پر قبضہ کیا۔ یہ بات میرے لیے بھی نہایت ہی حیران کن ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ ہندوستان کی بندر بانٹ ہو رہی تھی، سب ہی اپنا حصہ لے رہے تھے۔ لیکن جلد اس علاقے پر مراٹھوں نے حملہ کیا اور آئرش کو نکال دیا۔ پھر ایک دلچسپ صورت پیدا ہوئی کہ مراٹھوں کے حلیف لیفٹیننٹ بورکویان جو کہ ایک فرانسیسی افسر تھانے مراٹھوں کے نمائندہ کے طور پر ان علاقوں کو کنٹرول کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں مراٹھوں کی مدد کی تھی۔ اس نے توہن اور حصار کے قصبوں کو دوبارہ سے تعمیر کیا تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی دشمنی یورپ سے چلتی ہوئی شمالی ہندوستان تک بھی آن پہنچی تھی۔

چاروں طرف انگریزوں کا راج تھا۔ جیسے ہی مراٹھوں کو شکست ہوئی انگریزوں نے اس علاقے پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح یہاں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج قائم ہو گیا۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں کے لوگوں نے 1857ء کی آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس میں محمد عظیم اور راؤ تولارام پیش پیش تھے۔ (راؤ تولارام کا ذکر میں نے پچھلے صفحات میں کیا ہے)۔ آخر کار مقامی لوگوں کو شکست ہوئی اور جنگ میں حصہ لینے کی پاداش میں مقامی بااثر افراد کو پھانسی دے دی گئی اور جنہوں نے صاحب بہادر کی مدد کی انھیں جاگیریں دی گئیں۔

صلہ تو ملا۔۔۔

کسی کو پھانسی اور کسی کو دربار میں کرسی!

یہی وہ دور تھا جب انگریزوں نے نمک کی تجارت پر محصول حاصل کرنے کے لیے ایک چار ہزار کلومیٹر طویل ایک راہداری بنائی تھی۔ جو اس دور کی اپنی نوعیت کی واحد ایک مثال تھی۔ اس شہر میں اسٹیل کی ایک بڑی صنعت ہونے کی وجہ سے اسے بھارت کا 'سٹی آف اسٹیل' کہا جاتا ہے۔ بھارت میں جستی لوہے کی سب سے بڑی صنعت بھی اسی شہر میں واقع ہے۔ جنرال گروپ کی سربراہ ساویتری جنڈال ہیں جو دنیا کی دسویں سب سے زیادہ دولت مند خاتون مانی جاتی ہیں کا تعلق بھی حصار سے ہی ہے۔ غرض تاریخی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شہر معاشی طور پر بھی ایک اہم شہر ہے۔

اس شہر کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔ آبادی کا ستانوے فیصد ہندو ہیں، باقی تین فیصد آبادی مسلمانوں، سکھوں اور دیگر مذاہب کے ماننے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ تقسیم ہند سے قبل ایک اندازہ کے مطابق مسلمان آبادی کا بیس فیصد تھے۔ تقسیم ہند

کے بعد جن علاقوں سے مسلمانوں کو ایک کثیر تعداد میں قتل کیا گیا ان میں یہ علاقے بھی شامل ہیں۔

فسادات میں جو ہاتھ لگ گئے انھیں مار دیا گیا باقی جان بچا کر پاکستان میں آگئے!

ایسی ہی کہانی ہے پنجاب اور ہریانہ کے مختلف علاقوں کی بھی ہے۔۔۔

انھیں یہ سب یاد ہے جو اس کہانی کے مظلوم کردار تھے!

حال ہی میں اس علاقے میں کئی مسلمانوں کے ہندو دھرم قبول کرنے کے واقعات بھی ہوئے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر کہ مسلمانوں کی کیا صورت حال ہے۔ اقلیت۔۔۔ کہاں تک مقابلہ کر سکتی ہے۔۔۔

اب دوپہر بھی ہو رہی تھی۔ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ پانی پت بھی قریب ہی تھا۔ میری دلچسپی اس بات میں تھی کہ راستے میں بار بار رکا جائے تاکہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے بات کر سکوں۔ اس لیے میں نے شاہ صاحب سے ایک جگہ رکنے کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ اس جگہ ایک صاحب سے ایک مختصر ملاقات ہوئی جس سے مجھے بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔



Prithviraj Chauhan's Fort Hisar  
Photo Credit: <https://www.luxurytrailsofindia.com>



Dargah Char Qutub is situated in Hansi near Hisar Photo  
Credit: <https://www.luxurytrailsofindia.com>



Lat ki Masjid Hisar  
Photo Credit @iamrana through twitter

## ہریانہ: ایک ہندو ریاست جہاں کبھی مسلمان بھی آباد تھے

ہم پانی پت سے ذرا پہلے ایک ڈھابے پر چائے کے لیے رکے۔ وہاں پہلے سے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان سے اجازت لے کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور انھیں اپنا تعارف کروایا تاکہ ہم پاکستان سے ہیں اور چند ہی گڑھ جارہے ہیں۔ ان کا بھی غالباً کسی پاکستانی سے پہلا تعارف تھا۔ یہ جان کر کہ ہم پاکستان سے ہیں وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔ وہ کوئی تین چار لوگ تھے۔ ان میں سے ایک صاحب تھوڑے پڑھے لکھے بھی لگ رہے تھے۔ میں نے ان سے ہریانہ کے بارے میں پوچھنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ ہم جاٹ لوگ ہیں پہلے لسی پانی کا پوچھتے ہیں پھر باتیں کرتے ہیں۔ اس لیے ہم نے پہلے چائے پی اور چائے کے بعد، میں نے پوچھا کہ ہریانہ کے بارے میں سب سے اہم بات کیا ہے؟

ان کا جواب تھا کہ ہریانہ بھارت میں ان ریاستوں میں سے ایک ریاست ہے جہاں پر 97 فیصد ہندو رہتے ہیں۔ اس طرح آپ اسے ایک خالص ہندو ریاست کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی پنجاب ہے جہاں پر سکھ لوگ کثرت سے رہتے ہیں لیکن ہریانہ میں سکھوں کی تعداد ایک فیصد سے بھی زائد نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہریانہ کی آبادی کا بیس فیصد جاٹوں پر مشتمل ہے۔ یہ جاٹ لوگ بہت ہی مغرور لوگ ہیں اور اپنے جاٹ ہونے پر بہت زیادہ فخر بھی کرتے ہیں۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا، ان لوگوں کی گاڑیوں پر جاٹ لکھا ہوتا ہے۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کے سر پر پگڑی اور ہاتھ میں حقہ ہوتا ہے اور جہاں بھی دو چار اکٹھے ہو جائیں، چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور دیر تک گپیں مارتے ہیں۔



انھوں نے مجھے یہ بھی کہا کہ یہاں کے رہنے والے اکثر لوگوں کا تعلق جنگجو قبائل سے ہے جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ ایک بڑی تعداد میں بھارتی فوج میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ علاقے صدیوں سے میدان جنگ بنے رہے۔ اس کی ایک مثال پانی پت اور مہابھارت کی لڑائیاں بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگ کھیلوں میں بھی بڑھ چڑھ کا حصہ لیتے ہیں۔ ان کا پسندیدہ کھیل کبڈی اور کشتی ہے۔ اس کے باوجود کہ لوگ لڑائی جھگڑے کو پسند کرتے ہیں، ہریانہ میں جرائم کی شرح بہت زیادہ نہیں ہے۔ یہ لوگ تعلیم میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں کیونکہ زمین تقسیم در تقسیم کے عمل سے کم ہوتی جا رہی ہے اور لوگوں کو یہ بات سمجھ آ رہی ہے کہ تعلیم کے بغیر وہ ایک خوشحال زندگی نہیں گزار پائیں گے۔ دہلی کے قریب ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں معاشی طور پر بھی کافی ترقی ہو رہی ہے۔



Many Muslims converted to Hinduism Photo Credit:  
<https://www.opindia.com>

میں نے پوچھا کہ میرے علم کے مطابق ہریانہ ریاست، پنجاب کے کچھ علاقوں کو الگ کر کے بنائی گئی ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ زبان کی بنیاد پر ایک الگ ریاست بنی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس ریاست کو بنانے کا مقصد

ایک ہندو ریاست کا قیام بھی ہے۔ انھوں نے کہا ہاں، بظاہر ایسا نہیں کہا گیا۔ عام طور پر یہ کہا گیا کہ ہم پنجابی زبان سے ہٹ کر ہندی بولنے والے لوگوں پر مشتمل ایک ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے اس کے پیچھے ایک مذہبی فکر بھی موجود تھی۔

انھوں نے مزید کہا کہ اب مذہبی تعصب کی باتیں بہت پرانی ہو گئیں ہیں۔ ہمارے بزرگ ان باتوں کے شدت سے قائل تھے۔ ہم ذرا کم ہیں اور ہماری اولاد تو ان باتوں پر کوئی خاص توجہ ہی نہیں دیتی۔ میں نے وجہ پوچھی، اس پر انھوں نے کہا کہ اس کی تین وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اب ہماری زندگی میں مذہب کا اتنا عمل دخل نہیں ہے، جتنا ہماری پہلی نسلوں میں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب یہ بات اہم ہے وہ کون سا کام کیا جائے جس سے سے معاشی فائدہ ہو۔ تیسری بات تعلیم، فلم، میڈیا اور ایک دوسرے سے ملاقاتوں کے نتیجے میں ہمارے اندر ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اب ہم یہ کہتے ہیں کہ مذہب آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ آپ کسی بھی مذہب سے ہوں اس پر عمل کریں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ اپنے پیدا کرنے والے کو کس نام سے پکارتے ہیں اور کس مذہب ہی مقام پر جاتے ہیں، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے اور اس بات پر کوئی جھگڑا بھی نہیں ہے۔ اب جس میدان میں مارا ماری ہو رہی ہے وہ دولت کمانے کا میدان ہے۔

میں نے ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہی، جس پر انھوں نے کہا کہ خوشی سے۔ میں نے کہا کہ اب تک میں نے جو پڑھا ہے اس کے مطابق ہریانہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر پر ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں آٹھ سو پچاس کے قریب خواتین ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سو سال پہلے کے سروے بھی یہی بات بتاتے ہیں اور دلچسپ بات یہ کہ دیہاتی اور شہری علاقوں میں صورت حال تقریباً ایک جیسی ہی ہے۔ دیہات میں بھی ایسی صورت ہے اور شہروں میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے اور آپ کے

نزدیک اس مسئلے کا کیا حل ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ ایک بہت ہی مشکل صورتحال ہے اور یہ صدیوں سے روایت چلی آرہی ہے۔ ایک تو آپ کے علم میں ہے کہ اس علاقے میں بے شمار جنگیں بھی ہوئیں، جن میں پانی پت کی جنگیں بہت مشہور ہیں۔ شاید اسی وجہ سے مردوں کی اہمیت زیادہ ہے۔ دوسری وجہ روایتی سوچ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ سب کچھ موجود ہے کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں کم اہمیت دی جاتی ہے۔ حکومت نے اس صورتِ حال کو بہتر کرنے کی کافی کوشش کی ہے لیکن صورتِ حال کوئی زیادہ بہتر نہیں ہے۔

انھوں نے مزید کہا کہ یہ بات شاید آپ کے لیے قابلِ قبول نہ ہو کہ آج بھی لڑکی کے قتل کا معاملہ موجود ہے۔ پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے بعد بھی۔ حکومت نے کئی طرح کے پروگرام شروع کر رکھے ہیں۔ کئی نعرے بھی دیے ہیں۔ جیسے بیٹی پالو، آپ کی بیٹی ہم سب کی بیٹی، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود ابھی تک بھی صورتِ حال بہتر نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ شادی نہیں کر پاتے۔ جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ جو اچھے قد کاٹھ کے مالک ہوتے ہیں وہ جنوبی بھارت سے لڑکیاں لاتے ہیں، جو کہ بہر حال ایک مناسب بات نہیں ہے۔

میں نے پوچھا کہ پرانے وقتوں میں ہم سنتے تھے کہ ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے تھے۔ کیا اب بھی ایسا ہی ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا اب یہ بات کافی حد تک ختم ہو گئی ہے لیکن اب بھی کہیں کہیں ایسی باتیں موجود ہیں۔ میں نے چند سال پہلے میں نے ایک ڈاکو منسٹری دیکھی تھی جو ہماچل پردیش کے کسی پہاڑی علاقے کی تھی جہاں کے ایک خاندان کے بارے میں دکھایا گیا تھا جس میں ایک عورت دو بھائیوں کی بیوی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اب بھی کہیں ایسا ہو سکتا ہے لیکن اب یہ بات عام نہیں ہے۔ شاید ہی کہیں ایسا ہوتا ہو۔ یہ بھی زیادہ تر ان لوگوں میں ہو سکتا ہے جو معاشی اور

معاشرتی طور پر معاشرہ کے نچلے طبقے کے لوگ ہیں، جہاں ان باتوں کا زیادہ خیال نہیں کیا جاتا۔

انھوں نے کہا عورتوں کی تعداد کا کم ہونا ایک تکلیف دہ بات ہے۔ اس میں بھی کوئی بہتری کے امکانات بھی نظر نہیں آرہے۔ شاید آنے والی نسلیں اس مسئلے کو کچھ بہتر انداز سے حل کر سکیں۔ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ کسی وقت میں یہاں پر بہت بڑی تعداد میں مسلمان رہتے تھے، اب نہیں ہیں۔ آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے بڑے اپنے مسلمان دوستوں کی باتیں ہمیں بتاتے تھے ہم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اس لیے ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ایک مناسب تعداد میں ہمارے علاقے میں رہتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت وہ یہاں سے پاکستان چلے گئے اور بہت سے ہندو اور سکھ پاکستان سے آکر یہاں آباد ہو گئے۔ مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی بے شمار مساجد ویران ہیں۔ ان کے گھروں کو ہم نے آباد کر لیا ہے۔ ان میں وہ ہندو اور سکھ لوگ رہ رہے ہیں جو پاکستان سے نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ مکانات اور زمینیں ہندوؤں اور سکھوں کو الاٹ کی گئی ہیں لیکن مساجد تو کسی کو الاٹ نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ ابھی تک محفوظ تو ہیں لیکن ان کو آباد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اللہ کا گھر تو ہے، اللہ والے چلے گئے۔ کبھی تو گھر بھی آباد تو ہوں گے۔ مجھے قوی امید ہے!

میں دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ اتنی دیر میں شاہ صاحب کی آواز سنائی دی کہ بھائی آ جاؤ ہمیں آگے بھی جانا ہے۔ اس طرح سے ہم ان کی باتیں سن کر اور چائے بھی کر آگے روانہ ہو گئے۔

## مظفر نگر: جسے بھارت کا کرائم کیسیٹل بھی کہا جاتا تھا

ہم پانی پت سے ابھی خاصے فاصلے پر تھے کہ جب میں نے نقشے میں دیکھا کہ ہمارے دائیں طرف ایک مشہور شہر مظفر نگر واقع ہے۔ اس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر کسی مسلمان نے آباد کیا تھا۔ اس شہر سے متعلق دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ اس کی آبادی کا چالیس فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم جی ٹی روڈ پر سفر کر رہے تھے ہمارے بائیں طرف وہ علاقے تھے جہاں مسلمانوں کی تعداد ایک فیصد سے بھی کم تھی۔ ہمارے دائیں طرف اترپردیش کا علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی چالیس فیصد سے بھی زائد ہے۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان صاحب کی (پیدائش تو کرنا ل کی ہے) ایک رہائش گاہ مظفر نگر کے قریبی قصبے میں بھی تھی۔ پاکستان فلم انڈسٹری کے ایک معروف اداکار سلطان راہی کی پیدائش بھی 1938ء میں مظفر نگر میں ہی ہوئی تھی۔ ان کا تعلق ایک ارائیں خاندان سے تھا۔ تقسیم ہند کے بعد ان کا خاندان گوجرانوالہ میں رہائش پذیر ہوا۔ اس شہر کو کرائم کیسیٹل آف انڈیا بھی کہا جاتا ہے۔ ان سب باتوں نے مجھے مظفر نگر کے بارے میں مزید جاننے پر مجبور کیا اور جو چند اہم باتیں مجھے پتہ چلیں وہ آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ چودھویں صدی تک یہ علاقے خاصے غیر آباد تھے۔ اس علاقے کو سروت کہا جاتا تھا اور مقامی جاٹ اس کے حاکم تھے۔ تیمور کے حملہ کے وقت مقامی لوگوں نے اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے جس کا نتیجہ ایک تباہی کی شکل میں سامنے آیا۔

یہ علاقہ شاہ جہاں کے ایک جرنیل خان خاناں کے والد سید مظفر خان کو شاہجہاں نے سپرد کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد خان خاناں نے یہاں پر ایک شہر کی بنیاد

رکھی، جس کا نام اپنے والد کے نام پر مظفر نگر رکھا۔ اس بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں لکھی ہیں، اس سے قبل اس علاقے میں مولائری جاٹوں کی حکومت تھی۔ وہ سروت یا سروسوتی پورہ کے نام سے مشہور تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد یہ علاقہ برٹش انڈیا کا حصہ بن گیا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شہر کی بنیاد ساڑھے تین سو سال قبل رکھی گئی تھی۔ یہ شہر بھی انھی علاقوں میں شامل ہے جہاں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس شہر میں ہندوؤں کی 55 فیصد جبکہ مسلمانوں کی تعداد 40 فیصد سے بھی زائد ہے۔ پنجاب کے قریب ہونے کے باوجود یہاں سکھ ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔ اس علاقے میں بولی جانے والی زبان کو کھڑی بولی کہا جاتا ہے جو کہ ہندی زبان کا ہی ایک لہجہ ہے۔

اس علاقے میں بھارت کی سب سے بڑی گڑ منڈی بھی موجود ہے جس کی وجہ سے اسے Sugar Bowl of India بھی کہا جاتا ہے۔ پانی پت سے اس کا فاصلہ اسی کلو میٹر ہے۔

ابھی حال ہی میں ”بھادکال“ نام کی ایک ہندی فلم بنائی گئی ہے۔ یہ فلم ایک پولیس آفیسر نویت سکھیہرا سے جڑے واقعے سے متعلق ہے جس نے اس شہر میں جرائم کے خاتمے کے لیے بے حد اہم کارنامے سرانجام دیے۔ 2013ء میں یہاں ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے، ان کی بھی ایک درد ناک کہانی ہے۔ اس علاقے میں کالی ندی کے قریب ایک گاؤں سے مڑپہ دور کی اشیا بھی ملی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقے صدیوں سے آباد ہیں۔



Photo Credit: Social News XYZ

## پانی پت: جہاں ہندوستان کے تاج و تخت کے وارثان کا فیصلہ ہوتا تھا

ہمیں دلی سے چلے تقریباً تین گھنٹے ہونے کو تھے اور اب ہم پانی پت پہنچ چکے تھے۔ اس سفر میں یہ یہ سب سے اہم جگہ تھی جسے میں اور شاہ صاحب دیکھنا چاہتے تھے۔ پانی پت موجودہ دور میں بھی کئی دیگر وجوہات سے بہت مشہور ہے، لیکن میرا مقصد اس شہر اور ان میدانوں کو دیکھنا تھا جہاں ہندوستان کی تقدیر کے فیصلے ہوتے رہے ہیں۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ پانی پت کے میدانوں کو ہی تین بڑی لڑائیوں کے لیے کیوں چنا گیا؟

مختلف لوگوں کے جوابات سے یہ معلوم ہوا کہ پانی پت ایسا مقام تھا جو دلی سے تقریباً سو کلومیٹر پہلے آتا تھا۔ جو لوگ دلی کی حفاظت کرنا چاہتے تھے ان کے نزدیک بہتر یہی تھا کہ وہ مغرب سے آنے والے حملہ آور کو دلی سے دور ہی روکیں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ لودھی دلی پر قابض تھے اور بابر ان پر حملہ آور ہوا تھا تو انھوں نے دلی کو بچانے کے لیے دلی سے ایک سو کلومیٹر کے فاصلہ پر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسری جنگ میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا جبکہ تیسری جنگ میں بھی صورت حال ایسی ہی تھی۔ دلی پر مراٹھوں کا قبضہ تھا اور ابدالی ان پر حملہ آور تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ ایک میدانی

علاقہ ہونے کی وجہ سے یہ بڑی جنگ کے لیے مناسب سمجھا جاتا تھا۔ میرے خیال میں یہی دواہم وجوہات تھیں۔

پانی پت کی اس دھرتی پر کتنے لوگوں کا خون گرا۔۔۔ کسی کو کچھ علم نہیں۔۔۔ لیکن میں اپنی معلومات کی بنیاد پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان بھر میں کوئی ایک بھی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں اس قدر انسان قتل کیے گئے ہوں۔

یہ مٹی خون کی کتنی پیاسی تھی۔۔۔ کوئی نہیں جانتا!

ہم دوپہر کے کھانے کے لیے ایک ریسٹوران پر رکے۔ کھانا تو جو مقدر میں تھا وہ مل ہی گیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہاں کے کچھ مقامی لوگوں سے بات چیت کا موقع بھی ملا، جو میرے لیے کھانے سے بھی زیادہ اہم تھا۔ میں نے یہاں کے مقامی لوگوں سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ میدان کتنی دور ہے جہاں پر جنگیں ہوئیں تھیں۔ مقامی لوگوں سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق وہ جنگیں اس علاقے کے مختلف مقامات پر ہوئیں تھیں۔ کئی مقامات پر اب بھی ان جنگوں کی نشانیاں موجود ہیں۔ ایک صاحب نے ہمیں ایک سفید رنگ کا چبوترے (جو سڑک سے چند سو فٹ کے فاصلے تھا) سے متعلق بتایا کہ ایک جنگ اس جگہ پر بھی ہوئی تھی جس کی نشانی کے طور پر یہ چبوترہ بنایا گیا ہے۔ ہم اسے زیادہ قریب سے نہ دیکھ سکے۔

قتل گاہ کو دور سے ہی دیکھا۔۔۔

قریب سے میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا!

میں یہاں پر لڑی جانے والی تین بڑی لڑائیوں کا ذکر پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں لہذا وہ میدان ضرور دیکھنا چاہتا تھا جہاں یہ سب کچھ ہوا اور جہاں ہندوستان کے لوگوں کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا رہا ہے۔ آج میری یہ خواہش بھی پوری ہو گئی جو میرے لیے



انتہائی خوشی کی بات تھی۔ پانی پت میں دس سے زائد مقامات ایسے ہیں جہاں پر بہت سی تاریخی عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ ایک مشہور صوفی بزرگ بوعلی قلندر صاحب کی درگاہ تھی۔ ان اہم مقامات میں سے چند ایک کا مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش ہے جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پانی پت کس قدر اہم شہر تھا اور اب بھی ہے۔



Photo Credit: Kings and Generals

پانی پت، ہریانہ میں واقع ہے یہ دہلی سے 95 کلومیٹر شمال جبکہ چندی گڑھ سے 169 کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔ یہ شہر 1526ء، 1556ء اور 1761ء میں لڑی جانے والی تین بڑی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شہر "ویورز کا شہر" اور "ٹیکسٹائل سٹی" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہاں پر "ٹیکسٹائل کی ری سائیکلنگ کا کام بھی بڑے پیمانے پہ ہوتا ہے۔ اس شہر میں دو سو کے قریب ایسی ملبیں بھی موجود ہیں جو دنیا بھر کے استعمال شدہ کپڑوں سے دوبارہ ریشہ اور دیگر اشیاء حاصل کر کے انھیں دوبارہ استعمال کے قابل بناتی ہیں۔ (اس طرح کی صنعت مستقبل میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوگی)۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت کئی ہزار لوگ اس صنعت سے وابستہ ہیں۔

## مزار شرف الدین بو علی شاہ قلندر پانی پتی

شرف الدین بو علی شاہ قلندر پانی پتی جو بو علی قلندر کے نام سے مشہور ہیں، کا مزار پانی پت کا ایک اہم مقام ہے۔ آپ تیرہویں صدی کے آغاز میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ (کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ لاہور کے قریب کسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے)۔ آپ کا تعلق سلسلہ چشتیہ سے تھا۔ آپ کے والد سید محمد ابوالحسن فخر الدین (جو فخر عالم کے نام سے بھی جانے جاتے تھے) اپنے دور کے ایک بہت بڑے عالم اور ولی تھے۔ ان کا مزار پاراچنار، پاکستان میں ہے۔ وہ شیعہ امام زین العابدین کے نسب سے ہیں ان کی اولاد پاکستان میں رہتی ہے اور حسینی کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے "دیوان حضرت شرف الدین بو علی قلندر" کے نام سے فارسی زبان میں شاعری کا ایک مجموعہ بھی لکھا ہے۔ ان کا تعلق کئی مشہور قلندروں جیسے لال شہباز قلندر اور شمس علی قلندر ہیں کے ساتھ بھی جوڑا جاتا ہے۔ ان سے بے شمار کرامات بھی منسوب ہیں۔

ان کا مزار پانی پت میں قلندر چوک کے مقام پر واقع ہے جسے لوگ درگاہ کے نام سے جانتے ہیں، یہاں پر ایک مسجد بھی ہے۔ مسجد اور مزار پر مشتمل یہ کمپلیکس، جہانگیر کے ایک جرنیل، مہابت خان نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کمپلیکس میں مہابت خان، حکیم مکرم خان اور اردو کے شاعر مولانا الطاف حسین حالی کے مقبرے بھی موجود ہیں۔ مولانا حالی کی پیدائش بھی پانی پت میں ہوئی۔ مقبرے کی بائیں دیوار پر سنہری حروف میں ایک قصیدہ لکھا ہوا ہے جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اسے زہری نیشابوری نے لکھا تھا جو اکبر کے دور میں ہندوستان آیا تھا۔ مزار شرف الدین بو علی شاہ قلندر پانی پتی کی درگاہ پر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، غرض ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد بڑی تعداد میں آتے ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل پانی پت کس قدر مرد خیز علاقہ تھا، اس کا ذکر پانی پت سے تعلق رکھنے والے اظہر حسن نے اپنی ایک کتاب "سند کرہ شہر مرحوم" میں کافی تفصیل سے کیا ہے جو کہ انتہائی دلچسپ ہے۔ اظہر صاحب کے مطابق ان کے آباؤ اجداد تیرہویں صدی میں افغانستان سے ہندوستان ہجرت کر کے پانی پت میں آباد ہوئے تھے۔

اظہر حسن کے والد دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ ان کے مطابق پانی پت کی بنیاد مہابھارت کی جنگوں کے وقت ارجن نے رکھی تھی (کسی اور نے ایسا نہیں لکھا)۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ پانی پت میں مسلمان ایک کثیر تعداد میں آباد تھے۔ اس علاقے سے کئی اہم شخصیات کا تعلق بھی تھا، جن میں خواجہ شمس الدین ترک اور شیخ جلال الدین (انھوں نے کبھی بھی دلی کے حکمرانوں کے سامنے سر نہیں جھکایا اور اپنے امن، اتحاد اور خیر سگالی کے پیغام کی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں میں بڑے مقبول رہے)۔ ان کے ساتھ ساتھ الطاف حسین حالی کی وجہ سے بھی پانی پت دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ فیصد کے قریب ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تقسیم ہند کے وقت یا تو شہید کر دی گئی یا پھر ہجرت پر مجبور ہو گئی اور وہ لوگ اب پاکستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔

میں نے ایک مختلف بات کا مشاہدہ کیا کہ ہریانہ اور پنجاب کے دیہات اور قصبوں میں آپ کو کئی مساجد ویران نظر آئیں گی لیکن کسی مسلمان صوفی کی درگاہ یا مزار اجڑا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ان مسلمان صوفیوں کے مزارات پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد بھی حاضری دیتی تھی اور دیتی ہے، اسی لیے ایسے مقامات اجڑنے سے بچ گئے۔ پچھلے صفحات میں، میں نے شاہ صاحب کے گاؤں کاریا میں ان کے بزرگوں کی قبروں کا ذکر کیا تھا۔ 2000ء میں وہاں صرف قبریں تھیں۔ ابھی حال ہی میں شاہ صاحب کے پوتوں نے

کسی طرح کاریا میں رہنے والے ہندوؤں سے کسی طرح رابطہ قائم کیا اور تو انہیں معلوم ہوا کہ اب اس گاؤں کے ہندوؤں نے ان قبروں کو مزارات کی شکل دے دی ہے۔ قبروں پر سبز چادریں بچھا دی گئی ہیں اور ان پر چھت بھی ڈال دی گئی ہے (اس کی کچھ تصاویر میں نے بھی دیکھیں ہیں)۔ یہ سب ہندوؤں کی شاہ صاحب کے بزرگوں سے عقیدت کی وجہ سے ہوا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شاید ہی کسی مسلمان بادشاہ کی قبر کے ساتھ کوئی ہندو ایسی عقیدت رکھتا ہو!

### کابلی باغ مسجد: جسے بابر نے اپنی فتح کی یاد میں بنوایا

کابلی مسجد پانی پت ایک لحاظ سے مغلوں کی ہندوستان میں پہلی بڑی عمارت ہو سکتی ہے۔ شہنشاہ بابر نے اسے 1526ء میں سلطان ابراہیم لودھی کو پانی پت میں شکست دینے کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔ بعد ازاں جب بابر کے بیٹے ہمایوں نے پانی پت کے قریب شیر شاہ سوری کی اولاد کو شکست دی (جسے ایک چوترا بھی کہا جاسکتا ہے) اپنے والد کی پیروی کرتے ہوئے فتح کی خوشی میں اس عمارت میں ایک پلیٹ فارم بنوایا۔ اس کے علاوہ بھی یہاں کئی عمارتیں موجود ہیں۔ اس جگہ کو بابر کی اہلیہ کابلی بیگم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ (اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ بابر کی شادی کابل میں رہنے والے کسی خاندان میں ہوئی تھی)۔ اس مسجد کا فن تعمیر کسی حد تک سمرقند کی شاہی مساجد سے ملتا جلتا ہے۔ میں نے اس کی کئی وڈیوز دیکھیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دیچ بھال کیلئے مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

## ابراہیم لودھی کا مقبرہ

پانی پت میں ایک اور اہم تاریخی جگہ ابراہیم لودھی کا مقبرہ بھی ہے۔ ابراہیم ایک پشتون تھا، اس نے اپنے والد سکندر کی وفات پر تخت سنبھالا تھا۔ ایک اہم سوال ہمیشہ سے میرے ذہن میں رہا ہے کہ بابر ہندوستان کیوں آیا تھا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ ابراہیم لودھی کی وفات کے بعد اس کا بھائی تخت کا دعویدار تھا، لیکن وہ اس کے حصول میں ناکام رہا۔ اس کے علاوہ جب ابراہیم نے پرانے اور سینئر کمانڈروں کی جگہ کم عمر افراد کو اہمیت دینا شروع کی تو ابراہیم کے چچا نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ پانی پت کی جنگ میں بابر نے ابراہیم کی بہت بڑی فوج کو شکست دی۔ ابراہیم جنگ میں مارا گیا۔ اس کا مقبرہ پانی پت میں تحصیل آفس اور صوفی بزرگ بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ کے قریب واقع ہے۔ یہ اونچے پلیٹ فارم پر بنائی گئی ایک خوبصورت عمارت ہے۔ انگریزوں کے دور میں جی ٹی روڈ کی تعمیر کی وجہ سے مقبرے کی جگہ کو تبدیل کرنا پڑا۔

ہم وقت کی قلت کی وجہ سے ان تمام مقامات کو تو نہ دیکھ سکے۔ بہر حال ایک ایسا شہر ضرور دیکھنے کا موقع ملا جو تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ نقشے سے معلوم ہوا کہ اس علاقے میں مزید کئی بھی اہم شہر موجود ہیں۔ جن میں دیوبند کے ساتھ ساتھ کرناٹ، سہارنپور وغیرہ شامل ہیں۔ پانی پت کے کھانے بھی ایک مخصوص ذائقہ رکھتے ہیں، جن میں مرچ مسالوں کی بہتات تا دیر یاد رہتی ہے۔ مجھے ایک مدت بعد باجرے، جوار کی روٹی کھانے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ لاپرواہ جاٹوں کی بھی بڑی تعداد کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی ترجیح حقہ اور محفل ہی ہوتی ہے۔

بچپن میں، میں نے بھی اپنے بزرگوں کو بھی ان اشیاء کا رسیا پایا تھا۔ آخر کار وہ بھی جٹ تھے اور اسی علاقے کے باسی تھے۔ دھرم ہی مختلف تھا، بودو باش تو ایک جیسی ہی تھی۔

اب حقہ بھی ختم ہو گیا اور ایسی مجالس بھی۔ وقت بدل گیا اور لوگ بھی بدل گئے۔۔۔ جو نہیں بدلے انھیں زمانے نے بھلا دیا۔



Kabuly Mosque Panipat Photo Credit:  
<https://www.cntraveller.in>



Tomb of Bu-Ali Shah Kalandar Photo Credit:  
<https://www.tripadvisor.com>



Tomb of Ibrahim Lodi Photo Credit:  
<https://www.pinterest.com>



Amb memorial Battle field of war between Maratha and  
Ahmed Shah Abdali Photo Credit:  
<https://www.tribuneindia.com>

## سفیدون : جہاں پانچ صدیاں قبل سلاطین دلی نے نہر بنائی تھی

جب ہم پانی پت سے نکلے تو میں نے ارد گرد دیکھا کہ دور دور تک میدانی علاقے ہیں۔ اس وقت اگست کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، گرمی اور جس دونوں ہی زوروں پر تھے۔ پنجاب کے مختلف علاقوں میں جولائی اور اگست کا موسم نسبتاً خوبصورت مانا جاتا ہے۔ ان مہینوں میں مون سون کی وجہ سے کافی بارش ہوتی ہے۔ ان بارشوں کے بارے میں بہت سے گیت بھی گائے جاتے ہیں لیکن دوسری طرف اس موسم میں شدید جس بھی ہوتا ہے جو کہ ہر لحاظ سے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی ہمارے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ شدید جس کی وجہ سے لوگ قمیضیں اتارے درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ یہ آج سے بیس سال پرانی بات ہے۔ اس وقت تک ایئر کنڈیشنر اتنا عام نہیں تھا۔ لوگ قدرتی طور پر میسر سہولیت سے ہی فائدہ اٹھاتے تھے۔ ہماری گاڑی میں بھی ایئر کنڈیشنر نہیں تھا جس کی وجہ سے ہمیں بھی موسم کی سختی برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔

اس علاقے سے گزرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ جوں جوں ہم پنجاب کے قریب ہوتے رہے ہیں سکھ آبادی میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ پانی پت کے علاقے میں تقریباً دس فیصد کے قریب سکھ آباد ہیں۔ ایک جگہ پر ہم پانی کے لیے رکے تو میں نے محسوس کیا کہ کچھ دکانداروں کا لہجہ ہمارے سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے لہجے سے ملتا جلتا تھا۔ میں نے پوچھا تو پتہ چلا کہ تقسیم ہند کے بعد یہاں بڑی تعداد میں وہ لوگ آئے جو گوجرانوالہ سیالکوٹ اور گجرات کے رہنے والے تھے اور ان کی اکثریت جاٹ تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر پاکستان سے آکر ہندوؤں اور سکھوں کی ایک بڑی تعداد اس علاقے میں آباد ہو تو اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے بھی بہت سے لوگ پاکستان چلے گئے ہوں گے۔ مقامی لوگوں نے میری اس بات کی تصدیق بھی کی۔



عام طور پر تقسیم ہند کے وقت ایسا ہی ہوا۔ پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو انہی علاقوں میں بسایا گیا تھا جو یہاں سے مسلمانوں کے جانے کی وجہ سے خالی ہوئے تھے۔ پاکستان میں بھی یہی صورت حال تھی۔ اس کی ایک مثال ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی ہے۔ مسلمان ایک بڑی تعداد میں بھارتی پنجاب سے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آکر آباد ہوئے۔ ان کو اس علاقے میں بسانے کی وجہ یہی تھی کہ یہاں سے سکھوں اور ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد بھارت چلی گئی تھی۔

ایک گاڑی ہندوستان سے چلی اور سرہند میں زندہ بچ جانے والے مسلمانوں کو لے کر ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچی (جس میں میرے والدین بھی تھے) اور دوسری گاڑی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے زندہ بچ جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کو لے کر مشرقی پنجاب گئی۔ وہ لوگ مشرقی پنجاب کے کس علاقے میں آباد ہوئے، اس کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں ہے۔

ان ہی خیالات میں گم ہم اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے کہ مجھے نقشے سے معلوم ہوا کہ ہمارے بائیں طرف پانی پت سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا قصبہ موجود ہے جس کا نام سفیدون ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یہاں پر ایک قلعہ بھی واقع ہے۔ اس علاقے کی تاریخ سے اندازہ ہوا کہ یہ سلاطین دہلی کے دور سے ہی مسلمانوں کے قبضے میں تھے یہ ایسی بات تھی جو میرے لیے نہایت ہی اہم تھی۔

اس سے پہلے کہ میں آگے آنے والے شہروں سے متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا کہ ہمارے بائیں طرف دس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود سفیدون کے بارے میں چند معلومات آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔ یقیناً یہ سب آپ کے لیے انتہائی دلچسپ ہو گی۔ میں ایک ایسی بات کی تفصیل بھی بتاؤں گا جس کا ذکر تاریخ میں کم ملتا ہے بالکل نہیں ملتا۔

سفیدون کے قریب کئی جگہوں کی کھدائی سے معلوم ہوا کہ قدیم زمانوں میں یہ علاقے ہڑپہ تہذیب کا ایک نمایاں حصہ تھے۔ اس علاقے میں تغلق خاندان کے فیروز شاہ تغلق کی بنائی ہوئی کئی نہروں کی موجودگی بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ میں نے اپنی اس کتاب میں کئی جگہوں پر سلاطین دہلی کے بارے میں لکھا ہے۔ ان لوگوں کے مختلف واقعات مشہور ہیں۔ اب ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے یہ بھی دلی کے قریب اور پشاور سے دلی جانے والے صدیوں قدیم راستے پر موجود ہونے کی وجہ سے ان علاقوں میں شامل ہے جن پر سلاطین دلی نے نا صرف سب سے پہلے قبضہ کیا بلکہ دیر تک حکومت بھی کی۔ اسی وجہ سے پانی پت کے آس پاس ان کی کئی نشانیاں بھی موجود ہیں، جن میں سے ایک بوعلی قلندر کا مزار بھی ہے۔ جو ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔

فیروز شاہ تغلق نے چودھویں صدی کے وسط میں یہاں حکومت کی اور کچھ ایسے لازوال کام کیے جو اب تک یاد کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔

فیروز شاہ نے سفیدون کے علاقے میں کئی انتظامی تبدیلیاں بھی کیں اور موجودہ ضلع کے پورے علاقے کو اپنے ایک قابل اعتماد شخص کے ماتحت کر دیا۔ اس نے ایک دیرینہ روایت برقرار رکھتے ہوئے اس علاقے کا پرانا نام سفیدون ختم کر کے تغلق پور رکھ دیا۔ جسے بعد میں مقامی لوگوں کے نام منظور کرنے سے پرانا نام بحال کر دیا گیا۔

تیمور نے پنجاب سے ہریانہ میں داخل ہوتے ہوئے شمالی ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس نے ضلع جند میں موجود، سفیدون قلعہ جلا دیا۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سفیدون ایک اہم شہر تھا اور اس کی حفاظت کے لیے یہاں پر ایک قلعہ بھی موجود تھا۔

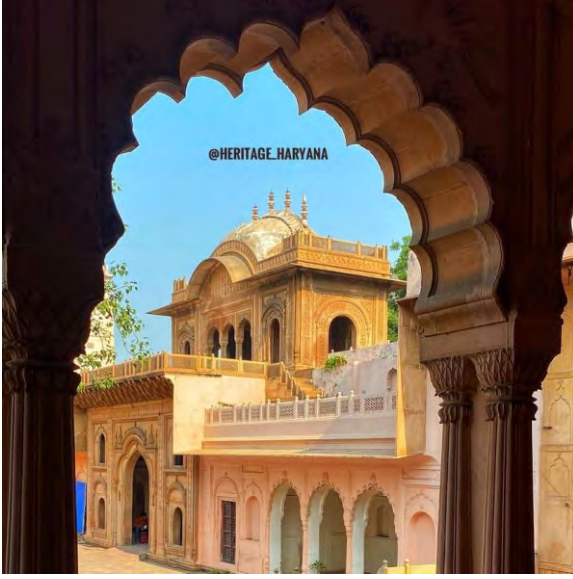
یاد رہے جب اٹھارہویں صدی میں سکھوں کی بارہ مثلوں (جتھوں) نے مغلیہ سلطنت کے خلاف جنگ شروع کی تھی تو اس وقت سفیدون ایک اہم مثل، پھولکیان کا صدر مقام بھی تھا۔ اس کے بانی پھول کے ایک پوتے گچیت سنگھ نے 1763ء میں صوبہ سرہند پر سکھوں کے حملے میں حصہ لیا تھا اس حملے میں اس صوبے کا افغان گورنر زین خان مارا گیا تھا۔ سفیدون بنیادی طور پر جاٹ سکھوں کی سرزمین ہے۔

سفیدون میں واقع یہ تاریخی قلعہ ریاست جند کے حکمرانوں نے اٹھارویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ جند ریاست کی بنیاد 1763ء میں رکھی گئی جب مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ یہ قلعہ جند ریاست کے حکمرانوں کا تعمیر کیا ہوا پہلا قلعہ تھا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سفیدون کا تعلق مہابھارت کی کہانی سے ہے۔ اس کہانی کے مطابق یہاں پر سانپ کی قربانی کی رسم ادا کی گئی تھی۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کا سفیدون سے ایک گہرا تعلق رہا ہے جو تغلق خاندان کا ایک مسلمان حکمران تھا، اس نے 1351ء سے 1388ء تک سلطنت دلی پر حکومت کی۔ اس کے والد کا نام رجب تھا جب کہ ان کی والدہ نانکہ دیپالپور کی بھٹی راجپوت راجماری تھیں جو رانا مل کی بیٹی تھیں (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل حکمرانوں سے قبل بھی مسلمان حکمران مقامی ہندو خواتین سے شادی کرتے تھے)۔ اس کے باوجود کہ سلطان فیروز شاہ تغلق کی والدہ ایک ہندو عورت تھی، وہ ناصرف مذہبی رجحان رکھتا تھا بلکہ اس نے اسلام کی ترویج کے لیے کئی اہم کام بھی کیے۔

فیروز شاہ تغلق نے بنگال، گجرات، پنجاب اور وسطی ہندوستان سمیت ایک وسیع علاقے پر حکومت کی۔ اس نے ہندوستان میں نہروں، سرائوں اور ہسپتالوں کی تعمیر، آبی ذخائر کا قیام اور لاتعداد کنویں بھی بنوائے۔ اس کے ساتھ ساتھ، دہلی کے آس پاس

کے متعدد شہر جن میں جون پور، فیروز پور، حصار، فیروز آباد اور فتح آباد کی آباد کاری کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔



Safidon Fort Photo Credit:Heritage Haryana

اب تک اس کے بارے میں جو کچھ میں نے جانا ہے اس کے مطابق فیروز باقی حکمرانوں سے کئی لحاظ سے مختلف تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے اپنی ریاست کی توسیع نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور جو کچھ موجود تھا اسے ہی بہتر بنانے میں لگا رہا۔ اس کے دور میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کی حوصلہ افزائی کے لیے متعدد مدرسے کھولے گئے، غریبوں کے مفت علاج کے لیے ہسپتال قائم کیے گئے اور یونانی طب کی ترقی میں بے حد اہم کردار ادا کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس نے دیوانِ خیرات کے محکمے کے تحت غریب خاندانوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی شادی کے لیے رقم فراہم کی گئی۔ دلی میں بہت سی سرکاری عمارتوں کی تعمیر کا آغاز بھی اسی کے دور میں ہوا۔

سفیدوں کے علاقے میں اس نے پانچ بڑی نہریں بنوائیں۔ ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے وہاں پر تھوی راج چوہان نے بارہویں صدی میں ایک نہر بنوائی تھی جو ختم ہو گئی تھی۔ فیروز شاہ کے دور میں (چودھویں صدی میں) اسے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ بعد ازاں انگریزوں نے اسے توسیع بھی دی۔ اب یہ نہر ویسٹرن جمنائیکینال کہلاتی ہے۔ اس علاقے کی خوشحالی میں اس نہر نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی ہمیں انگریزوں کی آمد سے قبل بنائی جانے والی نہروں کا ذکر ملتا ہے۔ جن میں سے پانچ تو صرف تغلق شاہ نے ہی بنوائیں تھیں۔ جمنائیکینال کا آغاز بھی پر تھوی راج چوہان کے دور میں ہوا۔ پر تھوی راج بارہویں صدی کے آخری دور میں اس علاقے کا حکمران تھا اس کی وفات بارہویں صدی کے آخری عشرہ میں ہوئی۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان میں نہروں کی تعمیر کا آغاز انگریزوں نے نہیں کیا بلکہ دریاؤں سے نہر نکالنے کے کام کا آغاز ان کی آمد سے صدیوں قبل ہو چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں نے اس کام کو پہلے سے زیادہ وسیع اور بہتر کیا۔

فیروز شاہ تغلق کو تاریخ میں بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔

دی پرنٹ اخبار نے ان کے کارناموں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے۔

How Feroze Shah, father of irrigation system in India, created the largest 'baoli' in Delhi

فیروز شاہ تغلق نے کئی نئے شہر بھی بسائے، جن میں فیروز پور (پنجاب)، فیروز پور اتر پردیش، فیروزہ حصار، فیروز آباد دہلی، جوینپور اتر پردیش۔ اس کے علاوہ اس کا

نہروں کا بنانا ایک ایسا کام ہے جس نے اس زمانے کی معیشت پر بے حد اثر ڈالا، کسان خوشحال ہوا، بھوک کا خاتمہ ہوا۔

میرے ذاتی خیال میں سلاطین دہلی میں فیروز شاہ کا ایک اہم مقام ہے۔ ان کے بارے کم ہی منفی بات سننے کو ملتی ہے۔ جو بھی لوگوں کی بھلائی کے کام کرے گا اس کا نام تو باقی رہے گا۔ یہ میرا ایمان ہے۔

یہ سب کچھ اس وقت یاد آیا جب ہم کرنال سے پہلے اس قدیم نہر پر سے گزر رہے تھے جس کا آغاز بارہویں صدی میں پر تھوی راج نے کیا، اور فیروز شاہ نے اسے دوبارہ فعال کیا اور انگریزوں نے مزید سنوارا۔

یہ علاقے جہاں تیرہویں صدی سے تقسیم ہند تک مسلمانوں کی کثیر تعداد آباد تھی اب دو فیصد سے بھی کم ہے۔ اس کے نتیجے میں دیہاتوں میں موجود بے شمار چھوٹی مساجد بے آباد ہو گئیں۔ البتہ بڑے قصبوں اور شہروں میں ایسا نہیں ہوا۔

پچھلے چند سالوں میں کئی لوگوں نے اس موضوع پر بے شمار وڈیوز بنائیں ہیں۔ جنہیں دیکھ کر باآسانی اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ ہریانہ اور بھارتی پنجاب میں لا تعداد ایسی مساجد موجود ہیں جو اب بے آباد ہیں۔ انھیں مقامی لوگوں نے گرایا تو نہیں لیکن اب وہاں جانور باندھے جاتے ہیں یا چارہ رکھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں نے پاکستانی پنجاب میں ایسے کئی گاؤں دیکھے ہیں جہاں کبھی سکھ یا ہندو آباد تھے لیکن ان کے جانے کے بعد ان کی عبادت گاہوں کا استعمال بھی ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا کہ بھارت میں مساجد کا ہو رہا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ ایسا گر جا گھروں کے ساتھ نہیں ہوا، کیونکہ عیسائیوں نے کوئی نقل مکانی نہیں کی!

## کرنا ل: نادر شاہ اور مغلوں کی ایک اہم جنگ کا مقام

کرنا ل کس قدر قدیم شہر ہے، اس بات کا اندازہ اس شہر کے نام سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجا کے ہیر و کرنا کی وجہ سے اس شہر کا نام کرنا ل رکھا گیا تھا۔ ابھی حال ہی میں کرنا ل میں کرنا کا ایک بہت بڑا مجسمہ بھی بنایا گیا ہے۔ اس شہر میں موجود ٹاؤن گیٹ کو بھی کرنا گیٹ ہی کہا جاتا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اس علاقہ پر تھانسیس کے حکمران وردھانوں کا قبضہ تھا۔ ساتویں صدی تک اس علاقے میں بدھ مذہب کے ماننے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ اس کے بعد ہندومت کا سنگا کے میدانی علاقوں میں اثر و رسوخ بڑھنا شروع ہو گیا اور تیرہویں صدی تک اس علاقے میں ہندوؤں کی بالادستی رہی۔ انگریزوں کی آمد سے قبل یہ علاقے مسلمان حکمرانوں کے زیرِ تحت رہے۔ تحریک آزادی ہند کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج نے اسے بطور پناہ گاہ بھی استعمال کیا۔ 1731ء میں ایران سے تعلق رکھنے والے نادر شاہ اور مغل سلطنت کے مابین ایک اہم جنگ بھی اسی شہر میں ہوئی تھی۔

کرنا ل کی شہرت کی ایک وجہ یہاں پر اعلیٰ قسم کے باسنتی چاول کی پیداوار بھی ہے۔ اسی وجہ سے اسے "رائس باؤل آف انڈیا یعنی ہندوستان کے چاول کا پیالہ" بھی کہا جاتا جاتا ہے۔ حالیہ سروے کے مطابق کرنا ل، ہریانہ کا سب سے صاف ستھرا شہر ہے۔ کئی لوگ اسے ہریانہ کا پیرس بھی کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بلدیاتی اداروں میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والی ریاستوں میں اسے دوسری پوزیشن بھی حاصل کیا۔ ان سب باتوں سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کرنا ل کیسا شہر ہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ نویں صدی کے وسط میں ہریانہ سمیت ایک بڑے علاقے پر تومارا خاندان کی حکومت تھی۔ اسی خاندان کے ایک راجہ انگپال تومر نے دلی شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دار الحکومت بنایا تھا۔ (یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے قبل یہ شہر ایک چھوٹی سی آبادی ہو اور انگپال نے اسے ایک شہر کی صورت دی ہو)۔ بعد ازاں چوہانوں کے ہاتھوں اس ریاست کا خاتمہ ہوا۔ تومارا کے دور میں ستلج اور جمنکا درمیانی علاقہ امن وامان اور خوشحالی کی وجہ سے بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ تومارا خاندان نے لڑائی پر امن کو ترجیح دی۔ محمود غزنوی کے حملوں کے وقت اس علاقے میں ایک اہم جنگ ہوئی۔ انگپال تومر کے دور میں ہی دہلی کے قریب لال کوٹ قلعہ تعمیر کیا گیا۔ یہ اس علاقے میں ہندوؤں کی آخر ریاست تھی۔ غوری کی آمد کے بعد یہ تمام علاقے صدیوں تک مسلمان حکمرانوں (جن میں سلاطین دلی اور مغل سب شامل ہیں) کے ماتحت رہے۔

ہم اس وقت کرنال سے گزر رہے تھے جہاں نادر شاہ اور مغلوں کے درمیان ایک اہم معرکہ ہوا اور جس کے نتیجے میں دلی پر وہ ظلم برپا ہوا جس کی مثال بھی ملنا مشکل ہے۔ میں آپ کے سامنے اس جنگ کی ایک مختصر روداد رکھنا چاہتا ہوں۔

شہر تو سبھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں لیکن ان میں ہونے والے واقعات انہیں اہم بنادیتے ہیں۔

نادر شاہ افشار، جسے نادر قلی بیگ بھی کہا جاتا ہے، 1736ء سے 1747ء تک ایران کا بادشاہ رہا وہ خاندان افشار کی حکومت کا بانی بھی تھا۔ اپنی عسکری صلاحیتوں کے باعث مورخین اسے ایشیاء کا نپولین اور سکندر ثانی بھی کہتے ہیں۔ اس کی فتوحات کا دائرہ بھی بے حد وسیع ہے۔



1738ء میں نادر شاہ نے کندھار پر فتح حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے شمالی ہندوستان کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا اور ابتداء میں کوہ ہند و کش (جو مغلیہ سلطنت کا حصہ تھا) کے پار چھاپے مارنا شروع کر دیئے۔ یاد رہے کہ اورنگزیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور تو ضرور ہو گئی تھی مگر ابھی بھی ہندوستان کا ایک بڑا علاقہ اس کے ماتحت تھا۔ اس وقت صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مراٹھوں نے وسطی اور شمالی ہندوستان کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کئی مقامی گورنروں نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس وقت کے مغل بادشاہ محمد شاہ اپنی سلطنت بچانے میں ناکام نظر آ رہے تھے۔ شمال مغربی سرحد پر پشتونوں نے بغاوت کر دی تھی، اس سب کے باوجود ہندوستان ایک انتہائی متمول ملک تھا۔ اسی خوشحالی کی وجہ سے نادر شاہ سمیت بہت سے لوگ ہندوستان پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ جن میں ایرانیوں، افغانوں کے ساتھ ساتھ یورپین بھی پیش پیش تھے۔ سب کو کوئی ناکوئی بہانہ چاہیے تھا۔ کسی کو تجارت کا تو کسی کو اپنے باغیوں کی واپسی کا۔ نادر نے بھی ایسا ہی ایک بہانہ ڈھونڈا اور ہندوستان پر حملہ آور ہو گیا۔

واقعہ کچھ یوں ہوا کہ نادر نے جب کندھار پر قبضہ کیا تو کچھ لوگوں نے ڈر کے مارے بھاگ کر کابل میں پناہ لے لی۔ کابل اس وقت مغلیہ سلطنت کا حصہ تھا۔ نادر نے ان باغیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جو مغل حکمرانوں نے پورا نہ کیا۔ نادر نے اسے جنگ کا بہانہ بنا کر کابل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے جلال آباد کو فتح کیا اور لوٹ مار کے بعد ایک ہستے ہستے شہر کو تباہ کر ڈالا۔ اس کا اگلا ہدف پشاور تھا۔ مقامی قبائل نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے۔ پھر ایک دن وہ پشاور میں بطور فاتح داخل ہوا اور جو تباہی کر سکتا تھا وہ اس نے کی۔ اب اس کی نظریں لاہور پر تھیں۔ پھر ایک دن اس نے لاہور کو بھی فتح کر لیا۔ اس کی اگلی منزل دلی شہر تھا جہاں سے وہ ایک بڑا خزانہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مغل بادشاہ اس کے باغی واپس نہیں کر رہا اس لیے وہ ہندوستان پر

حملہ کر رہا ہے، لیکن اصل مقصد لوٹ مار اور مغلوں کو سزا دینا تھا۔ (میرا خیال ہے کہ وہ مغلوں اور عثمانیوں کو ایک ہی سمجھتا تھا۔ اس لیے وہ مغلوں کو بھی سزا دینا چاہتا تھا۔)

24 فروری 1739ء کو کرناٹ کی لڑائی ہونا تھی کہ اس سے قبل ہی محمد شاہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور پھر فاتح اور مفتوح دونوں ہی ایک ساتھ دہلی میں داخل ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صرف تین گھنٹے ہی لڑائی ہوئی اور اتنے مختصر وقت میں جنگ کا فیصلہ ہونا جنگ نہ ہونے کے برابر ہی سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نادر کرناٹ سے ہی واپس چلا جاتا تھا لیکن محمد شاہ کے ایک جرنیل نے اسے دلی پر حملے کے لیے آمادہ کیا اور اسے بتایا کہ دلی میں اسے بے شمار مال و متاع مل سکتا ہے۔ اور پھر اس بنیاد پر اس نے دلی کا رخ کر لیا۔

ایسے لوگ ہی مغلیہ سلطنت کی تباہی کا سبب بنے۔

پھر ایک دن آیا کہ نادر ایک فاتح کی حیثیت سے دلی میں داخل ہوا۔ شہر کی چابیاں اس کے حوالے کر دی گئیں۔ اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ پھر اس نے مغل بادشاہوں کی طرح دلی میں ایک عظیم دربار منعقد کیا۔ اس دربار میں مغلیہ سلطنت کا وارث محمد شاہ بھی موجود تھا۔ (یہ وہی محمد شاہ ہے جسے رنگیلا بادشاہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔)۔ نادر نے کرناٹ تک پہنچنے کے لیے اڑھائی ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور وقت سے پہلے پہنچ گیا جبکہ محمد شاہ نے صرف دلی سے کرناٹ تک 110 کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اسے تمام تر مقامی لوگوں کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن اس کے باوجود فتح نادر کو ہوئی۔

رنگیلے رنگ لیاں تو مناسکتے ہیں جنگ ان کے بس کی بات نہیں ہوتی!

اس دوران دلی کچھ لوگوں نے نادر کے فوجیوں سے تنگ آ کر کچھ فوجیوں کو قتل کر دیا۔ جس پر نادر نے طیش میں آ کر اپنی فوجوں کو قتل عام اور لوٹ مار کا حکم دے

دیا (اجازت نہیں حکم)۔ پھر آسمان نے دیکھا کہ دلی میں بسنے والا مسلمان اور ہندو، کوئی بھی محفوظ نہ رہا۔ لوگوں نے اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تاکہ وہ غلام نہ بنائی جاسکیں۔ حملہ آور بھی مسلمان تھا شکست خوردہ بادشاہ بھی مسلمان تھا اور عوام میں مسلمان اور ہندو سبھی شامل تھے۔

نادر نے تلوار لہرا کر حملے کا حکم دیا۔۔۔۔۔ وہ قتل و غارت دیکھتا رہا اور جب اس کا دل بھر گیا تو پھر اس نے تلوار لہرائی اور قتل عام رک گیا۔

صرف ایک دن میں ایرانی فوجیوں نے بیس ہزار سے زائد بے گناہ عام شہری قتل کر دیے اور دس ہزار کے قریب خواتین اور بچوں کو غلام بنا کر ساتھ لے گئے۔  
محمد شاہ مسلسل رحم کی بھیک مانگتا رہا جو بلا آخر اسے دے دی گئی۔

اس کے بدلے میں نادر شاہ نے خزانے کی چابیاں حاصل کیں اور جو کچھ موجود تھا (جس میں تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا) اسے لوٹ لیا۔ اس لوٹ مار کی کتنی مالیت تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس مال و دولت کو 700 ہاتھیوں، 4000 اونٹوں اور 12000 گھوڑوں پر لادایا گیا تھا۔ جہاں عام ایرانی سپاہیوں نے بے شمار عورتوں کو اغوا کیا وہیں نادر مغل بادشاہ کی ایک بیٹی جہاں افروز بانو بیگم کو اپنے چھوٹے بیٹے کی دلہن بنا کر ہندوستان سے روانہ ہوا۔

میں اسے بھی خراج کی ایک قسم ہی سمجھتا ہوں۔ ایسا کرنے سے دلی پر برپا کی گئی قیامت کا خاتمہ ہوا!!

میں سمجھتا ہوں کہ اس جنگ میں مغلوں کی شکست نے مغلیہ سلطنت کے مستقبل اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مستقبل کا بھی فیصلہ کر دیا۔ اس جنگ کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی۔ مقامی حکمران آزادی کا اعلان کرتے گئے۔

اس جنگ کے بعد بھی مغلیہ سلطنت تقریباً 120 سال تک کسی نا کسی حالت میں قائم رہی۔ حتیٰ کہ 1857ء کو اس کے آخری حکمران کو ہندوستان سے باہر بھیج دیا گیا۔



Photo Credit: <https://www.facebook.com/ImperialMuslims>

یاد رہے کہ احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ کی فوج میں ایک جرنیل تھا۔ ابدالی نے 1747ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانوں کو متحد کیا اور افغانستان کی بنیاد رکھ کر اس کا بادشاہ بن گیا۔ اسی لیے اسے جدید افغانستان کا بانی بھی مانا جاتا ہے۔ نادر شاہ کو ہندوستان سے مال و دولت لوٹ کر لے جاتے دیکھ کر ابدالی نے بھی ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ ان حملوں کے نتیجے میں وہ بھی ہندوستان سے ایک کثیر مقدار میں مال و دولت لے جانے میں کامیاب ہوا۔

مغلیہ سلطنت کی کمزوری کے بعد ہندوستان بھر میں کوئی بھی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ جو کہ ہندوستان پر غیر ملکی تسلط کی ایک اہم وجہ ہے۔

کرناٹ کو زراعت کا ایک اہم مرکز بھی مانا جاتا ہے جس کی وجہ یہاں پر زراعت کے دفاتر اور اداروں کی موجودگی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے دوائیوں کا شہر بھی کہتے ہیں کیونکہ یہاں پر فارماسیو ٹیکل انڈسٹریز کی بڑی تعداد میں موجود ہے۔

عام طور پر کرناٹ میں ہونے والی ایک مشہور جنگ (جونادر شاہ اور مغلوں کے درمیان ہوئی) کا ہی ذکر کیا جاتا ہے لیکن اس علاقے میں اس کے علاوہ بھی تین بڑی جنگیں ہوئیں ہیں۔ پہلی جنگ 1191ء میں غوری اور پرتھوی راج چوہان کے درمیان ہوئی اور اس جنگ میں غوری کو شکست ہوئی تھی۔ ایک سال بعد اسی میدان میں غوری اور چوہان کے درمیان 1192ء میں دوبارہ جنگ ہوئی جس میں غوری کی جیت ہوئی تھی۔ اس جنگ میں فتح کے بعد غوری نے ہندوستان میں اپنی ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ دونوں جنگیں کرناٹ سے شمال مغرب کی جانب پچاس کلومیٹر کے فاصلہ پر ترائین کے مقام پر ہوئیں۔ ترائین کو اب تراوڑی کہا جاتا ہے۔ چوتھی جنگ بھی اسی علاقے میں اس وقت لڑی گئی تھی جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس وقت دہلی کے حاکم نصیر الدین محمود نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ ناکام رہا۔ اس کے نتیجے میں تیمور نے دلی کو لوٹا اور مال و دولت کے ساتھ ساتھ بے شمار عورتوں کو بھی غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان بھر میں اس جنگ میں سب سے زیادہ قتل و غارت ہوئی تھی۔ کرناٹ کے قریب ایک قصبے میں ماما بھانجا سرائے بھی ہے جسے شاہجہاں کے جرنیل خان فیروز نے بنوایا تھا وہ اب تک قائم ہے اور کافی مشہور ہے۔

## انگریز جند کور مہارانی اور مہاراجہ رنبیر سنگھ

کوری ینگر آسٹریلیا کی رہنے والی ایک خاتون نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام

Wicked Women of The Taj سے۔ اس کتاب میں انھوں نے ایسی بیس خواتین کی کہانیاں لکھی ہیں جنہوں نے ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ تعلقات قائم کیے۔ ان میں سے ایک خاتون Olive Monolescue ہے جس نے جند کے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ساتھ شادی کی۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے جس میں ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا گیا ہے جس کا مجھے اس سے پہلے کچھ علم نہیں تھا۔ اس کہانی کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔



Ranbeer Singh Mahraja of Jind with his wife

Photo Credit <https://www.facebook.com>

جند کا مہاراجہ رنبیر سنگھ ایک عیاش شخص تھا۔ اس نے کئی قسم کے شوق پال رکھے تھے۔ وہ کوتوں سے دلچسپی رکھتا تھا اور اس نے ہندوستان میں بہترین کتے پال رکھے تھے۔ Olive Monolescue کی شادی رومانیہ کے ایک باربر سے ہوئی تھی جس کی دکان ممبئی میں تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کو اولیو پسند آگئی اور اس نے اسے حاصل

کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ رنبیر سنگھ کی پہلے ہی دو سٹھ بیویاں (دھیلما اور گورچرن کور تھیں)۔ مہاراجہ نے اولیو کی ماں کو پچاس ہزار روپے دیئے اور اولیو سے سنگرور کے شاہی محل میں شادی کر لی۔ اولیو نے سکھ مذہب اختیار کر لیا اور اسے جسونت کور کا نام دیا گیا۔

اس وقت لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے تھا، اسے یہ شادی پسند نہیں تھی۔ اس نے حکم دیا کہ اولیو کو کبھی بھی جند کی مہارانی کا خطاب نہیں ملے گا، اور ایسا ہی ہوا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ انگریز اس شادی کو (جو پچاس ہزار روپے کے بدلے ہوئی تھی) اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ 1901ء میں راجا اور اولیو شملہ میں ایک پولو ٹورنامنٹ اور دیگر کھیلوں میں شرکت کے لیے جانا چاہتے تھے لیکن انھیں شملہ جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ رنبیر سنگھ کے لیے سخت پیغام تھا کہ انگریزوں کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد اولیو کو کبھی بھی کسی سرکاری تقریب میں مدعو نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ شملہ میں مقیم برطانوی خواتین بھی اس کے ساتھ ملنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

اولیو نے کچھ عرصے تک تو یہ سلوک برداشت کیا لیکن ایک وقت آیا جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے 1928ء میں رنبیر سنگھ سے طلاق لے لی اور لندن واپس چلی گئی۔ اس کتاب میں اور بھی کئی خواتین کی کہانیاں لکھی ہوئیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی راج کے دوران ایسی خواتین کو ہمدردی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جب یہ عورتیں واپس انگلینڈ جاتیں تو انھیں Returned Empty کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ تھی ایک سکھ مہاراجہ کی کہانی۔۔۔ جو ناکامی کی شکل میں آج بھی تاریخی اوراق میں محفوظ ہے۔

## بابر کی 1528ء میں تعمیر کردہ بابری مسجد کرنال

کرنال اس علاقے میں واقع ہے جو مغرب سے ہندوستان آنے والے لوگوں کی گزرگاہ تھا۔ بابر بھی اسی راستے سے آیا تھا۔ 1526ء میں اس نے کرنال میں لودھی کو شکست دینے کے بعد فتح کی خوشی ایک بڑی اور انتہائی خوبصورت مسجد تعمیر کروائی جس کا نام بابری مسجد ہے۔ اس مسجد کی تعمیر 1527ء میں شروع ہوئی اور 1528ء میں مکمل ہوئی۔ ہندوستان میں یہ مغلوں کی پہلی بڑی عمارت ہے۔ یہ مسجد ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے اس کے ساتھ ایک باغ بھی تھا جو اب نظر نہیں آتا۔ مسجد کا ہال کافی کھلا ہے۔ میں نے اسکی کئی تصاویر دیکھیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک شاندار عمارت ہوگی۔ اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد کالم ہونا اس کی خستہ حالی کا سبب ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ شروع میں یہاں ایک گہرا کنواں بھی تھا، جو اب نہیں ہے۔ یہ مسجد کرنال شہر کے وسط میں واقع ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسجد بنی اور پھر بعد میں اس کے ارد گرد شہر بستا چلا گیا۔

اللہ کا گھر ہے اسے تو قائم ہی رہنا ہے۔ انشاء اللہ

## گوردوارہ منجی صاحب: جہاں گورونانک جی نے ایک رات گزاری

کرنال میں ایک تاریخی گوردوارہ بھی موجود ہے جس کا نام گوردوارہ منجی صاحب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گورونانک دیو جی نے ایک سفر کے دوران کرنال میں کچھ دنوں کے لیے قیام بھی کیا تھا۔ یہ 1515ء کی بات ہے، اس وقت کرنال میں کئی

مسلمان پیر پہلے سے ہی موجود تھے۔ لوگوں میں ایک کہانی مشہور ہے کہ پہلے سے موجود پیروں کو ان کا آنا اچھا نہ لگا اور ابو علی شاہ قلندر ایک دیوار پر سوار ہو کر ان



کے پاس آئے لیکن جیسے ہی دیواران کے قریب آئی تو وہ رک گئی۔ جس پر مسلمان پیر نے معافی مانگی۔ یہ واقعہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ان دونوں لوگوں کے درمیان تین سو سال کا فرق ہے۔ گورونانک جی نے ایک چارپائی پر آرام کیا تھا، جسے پنجابی میں "منجی" کہتے ہیں۔ جہاں انھوں نے قیام کیا وہیں پر ایک گوردوارہ بنایا گیا۔ اس لیے اس گوردوارے کا نام گوردوارہ منجی صاحب پڑ گیا۔ سکھوں کے چھٹے گرو، گرو رکتھ صاحب جی نے بھی دہلی جاتے ہوئے اس جگہ کا دورہ کیا۔ 1709ء میں بابا بندہ سنگھ بہادر نے کرنال پر قبضہ کیا اور یہاں سکھ راج قائم کر کے گوردوارے کو توسیع دی۔ یہ گوردوارہ سکھوں کے نزدیک نہایت ہی مقدس سمجھا جاتا ہے۔

### سید محمد الیاس میراں: ایک عظیم صوفی بزرگ

کرنال میں میراں صاحب کا مقبرہ بھی بہت مشہور ہے۔ مجھے ان کے بارے میں جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ ان کے کارنامے اور انسانیت کی خدمت کا پڑھ کر محسوس ہوا کہ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام عام ہوا۔ انھوں نے ذات پات اور مذہبی بنیاد پر کیے جانے والے سلوک کی شدید مخالفت کی۔ وہ غریب اور پسماندہ افراد کو اپنے قریب رکھتے اور ان کی بے حد خدمت کرتے تھے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی ایک بادشاہ نے ایک مقامی برہمن لڑکی کو یرغمال بنالیا۔ میراں صاحب نے اسے بازیاب کروانے کا فیصلہ کیا اور ایک بڑی رقم ادا کر کے لڑکی کو بازیاب کروایا۔ جس کا پھر چا آج تک کیا جاتا ہے۔ وہ ایک جنگ میں مارے گئے۔ ان کی لاش مظفر نگر میں سپرد خاک کی گئی، جبکہ ان کا سر کرنال لایا گیا۔ ان کا سر اس مقبرے میں دفن ہے۔ مقبرے کے پاس ایک شاندار مسجد بھی ہے۔ ان کے مزار پر ہر مذہب کے لوگ آتے ہیں۔

کرنال میں کئی تاریخی مندر، انگریزوں کے دور کا چرچ بھی موجود ہے۔ ہم کرنال سے گزر کے آگے جا رہے تھے۔ کرنال کا ذکر لیاقت علی خان صاحب کے تذکرے کے بغیر ادھورا ہے۔

محمد لیاقت علی خان 1895ء میں اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک نہایت ہی معزز اور خداترس خاندان سے تھا۔ ان کے خاندان کا نسب نوشیرواں عادل سے ملتا ہے۔ ان کے دادا نواب احمد علی خان کرنال میں آباد ہو گئے اور انھوں نے فارسی کو چھوڑ کر اردو زبان کو اپنا لیا (میرے خیال میں ایسا عام تھا۔ مغلوں کے گھروں میں بھی پہلے فارسی یا ترکی ہی بھولی جاتی اور بعد میں وہاں بھی اردو کا رواج ہو گیا)۔ اس طرح لیاقت علی خان کے خاندان کی مادری زبان اردو ہو گئی۔

نواب احمد علی خان کے انگریزوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ انگریزوں نے انھیں رکن الدولہ، شمشیر جنگ اور نواب بہادر جیسے القابات دے رکھے تھے۔ ان کے پاس ایک بڑی جاگیر بھی تھی۔ لیاقت علی خان کا خاندان سید احمد خان سے بہت متاثر تھا۔ اس وجہ سے ان کے والد کی خواہش تھی کہ لیاقت علی خان بھی انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ اس بناء پر لیاقت علی خان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھیج دیا گیا، جہاں انھوں نے قانون اور سیاسیات کی ڈگری حاصل کی۔

وہ اپنے والد کی وفات کے بعد، وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے اور وہاں سے لاء اینڈ جسٹس کی ڈگری لی۔ آکسفورڈ میں انھوں نے ناصر ہندوستانی مسلم طلباء کی قیادت بھی کی بلکہ ان کے حقوق کے لیے جدوجہد بھی کی۔ ہندوستان واپس آ کر انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ آغاز میں وہ کانگریس کے حامی تھے لیکن بعد میں انھوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور پھر مرتے دم تک مسلم لیگ میں ہی رہے۔ تحریک پاکستان سے قیام پاکستان اور پھر استحکام پاکستان تک

ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آج ہم اس شہر سے گزر رہے تھے جہاں لیاقت علی خان صاحب کی زندگی کا ایک اہم حصہ گزر اور جہاں وہ ایک وسیع جائیداد چھوڑ کر پاکستان گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کا انھیں بہترین صلہ عطا فرمائے۔ امین۔

## کلپنا چاولہ : بھارت کی پہلی خلا باز خاتون

کلپنا چاولہ کا تعلق بھی کرناٹک سے ہی ہے۔ کلپنا کی پیدائش 1962ء میں کرناٹک کے ارور خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک جاٹ قبیلے (چاولہ) میں ہوئی۔ آپ نے خلا بازی کی تربیت حاصل کی اور ناسا کے تحت ایک خلائی مشن پر روانہ ہوئیں۔ چاولہ ان سات لوگوں میں شامل تھیں جو 2003ء میں شٹل کی واپسی کے موقع پر ایک حادثے میں مارے گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت کے بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ نے خلا میں کلپنا سے پنجابی زبان میں بات بھی کی تھی۔ پنجابی بولنے والے لوگوں نے اس بات کی بے حد تشہیر بھی کی۔ اسے بھارت میں ایک ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔ جس وقت ہم اس علاقے میں سفر کر رہے تھے اس وقت تک یہ واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اب جب میں 2021ء میں یہ سفر نامہ لکھ رہا ہوں تو مجھے یاد آیا کہ میں بھی کبھی کلپنا کی جنم بھومی سے کبھی گزرا تھا۔

## دیوبند: ایک علمی دسگاہ اور تحریک آزادی ہند کا مرکز

جب ہم کرناٹک سے گزر رہے تھے تو میں نے نقشے میں دیکھا کہ کرناٹک سے اسی کلومیٹر شمال مشرق کی جانب دیوبند واقع ہے۔ دیوبند کا خیال آتے ہی مجھے اس سے جڑے بے شمار واقعات، کئی نامور شخصیات اور ایک ایسی تحریک یاد آئی جس کے چلانے والوں کو مالٹا جیسے جزیروں میں بھیجا گیا، جسے عرف عام میں کالا پانی کہا جاتا ہے

ہم دیوبند کا دورہ نہ کر سکے (جس کا افسوس رہے گا۔) اس سے جڑے واقعات، شخصیات اور تحریکوں کا ایک مختصر ذکر پیش خدمت ہے۔

دیوبند ایک قدیم قصبہ ہے جس کی تاریخ کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہ مل سکیں۔ البتہ یہ ضرور پتہ چلا کہ ہندوؤں کے ایک گوروا کا بچپن یہاں گزرا ہے۔ اس شہر کا ذکر اکبر نامہ میں بھی ملتا ہے۔ اب یہ شہر دیوبند میں واقع دارالعلوم دیوبند کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے ساتھیوں نے 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔



Darul Aloom Deoband Photo Credit:  
<https://pdfbooksfree.pk>

یہ بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے بعد پادریوں نے بھی ہندوستان کا رخ کیا۔ تعلیم اور خدمت کے نام پر ادارے بنائے گئے اور معاشرے کے پسے ہوئے افراد کو عیسائی بنانا شروع کیا گیا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے مسلمان علماء نے مدارس کے کام کو تیز کرنا شروع کر دیا اور اس طرح کے کئی مدارس بنائے گئے۔ ان میں سے ایک اہم دارالعلوم دیوبند ہے۔

دیوبند مدرسہ نے ناصرف ہندوستان اور کئی قریبی ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی فکری راہ نمائی میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ اس کی فکر کے حامل لوگ دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں۔ دیوبندی فکر کے حامل لوگوں نے لاکھوں کی تعداد میں دنیا بھر میں مدرسے بنائے ہیں۔ آغاز میں ان لوگوں کو دیوبندی کہا جاتا تھا جو اس مدرسہ سے تعلیم حاصل کر کے گئے تھے۔ اب یہ لفظ ایک مکتبہ فکری کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس فکر سے متاثر ہونے والے افراد کو دیوبندی کہا جاتا ہے۔ یہ سنی مسلمانوں کا بہت ہی اہم مسلک ہے۔

## تحریک آزادی ہند اور دیوبند

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبندی کی بنیاد رکھنے سے دس سال پہلے 1857ء میں ہی حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے پیروکاروں، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور دیگر علماء انگریزوں سے ہندوستان کو آزادی دلوانے کے لیے سرگرم عمل تھے۔ یاد رہے اس وقت تک کوئی بھی سیاسی جماعت ہندوستان میں قائم نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ مسلمان عالم تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔ ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھانہ بھون تھا۔ ان ہی لوگوں نے انگریزوں کے خلاف ایک تحریک، ریشمی رومال کے نام سے بھی چلائی تھی۔ جس کی قیادت مولانا قاسم نانوتوی صاحب کے شاگرد مولانا محمود الحسن صاحب کر رہے تھے۔ انھیں اسی جرم کی پاداش میں ان کے ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے مالٹا میں جلاوطن کر دیا گیا (مالٹا ایک دور دراز جزیرہ ویران تھا)۔ دیوبند کے علماء کی اکثریت نے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔ ان لوگوں نے مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہند کی مخالفت کی جو مسلم لیگ کا موقف تھا۔ وہ مذہبی آزادیوں اور رواداری کے ساتھ جمہوری حکومت کے حق میں تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو پاکستان کے قیام کے حق میں تھے۔ یہ ایک نظریاتی اختلاف تھا جو ہمیں کسی کے اخلاص پر شک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

## روڑکی: جہاں پہلا ریل کا انجن چلایا گیا

مجھے کئی سال پہلے ایک صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا جو ریل کے شعبہ میں بطور انجینئر کام کرتے تھے۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ روڑکی میں واقع ہندوستان کے پہلے انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل ہیں۔ انھوں نے اس کالج کے بارے میں مجھے بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔ اب جب ہم اس علاقے سے گزر رہے تھے تو میں نے ایک صاحب سے روڑکی سے متعلق پوچھا جس پر انھوں نے بتایا کہ روڑکی، کرنال سے ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر شمال مشرق میں واقع ایک شہر ہے۔ اس شہر سے متعلق ایک کہانی انجینئرنگ کے طلبہ کے لیے بے حد دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہ شہر کئی حوالوں سے مشہور ہے۔

میں نے ممبئی کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ بات لکھی تھی کہ ہندوستان میں پہلی ریل گاڑی ممبئی ہی میں چلائی گئی تھی۔ یہ بات ایک لحاظ سے تو درست ہے کہ 1853ء میں پہلی مسافر گاڑی ممبئی میں چلائی گئی تھی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ریل کا پہلا انجن روڑکی میں 1851ء میں چلایا گیا تھا۔

اس ریل کی کہانی کچھ یوں ہے کہ شمالی ہندوستان کے یہ علاقے خشک سالی کی وجہ سے کافی مشکلات کا شکار تھے۔ اور تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 1838ء میں قحط کی وجہ سے قریباً دس لاکھ لوگ بھوک سے مر گئے تھے۔ علاقے کا کنٹرول برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس تھا۔ خشک سالی کی وجہ سے انگریزوں کو کم محصول وصول ہونا شروع ہو گیا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے انھوں نے دریائے گنگا سے کئی نہریں نکالنے کا منصوبہ بنایا

تاکہ گنگا اور جمنہ کے درمیان دو آبہ کی زراعت کے لیے پانی مہیا کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے لوئر گنگا نہر بنانے کا فیصلہ ہوا۔ یہ نہر روڑ کی شہر کے درمیان سے گزرتی تھی۔ اس نہر کی مٹی لانے کے لیے ہندوستان میں ریل کی پہلی پٹری بچھائی گئی اور پہلی مرتبہ ہی ہندوستان کی سرزمین پر انگریزوں سے ایک سٹیم انجن منگوا لیا گیا۔ 1851ء میں روڑ کی اور پیراں کلیار کے درمیان آٹھ کلومیٹر طویل ٹریک پر مال برادر ریل چلائی گئی جو نہر کی تعمیر کے لیے مٹی لانے کا کام کرتی تھی۔ (اب وہ انجن اور دو بوگیوں پر مشتمل ریل گاڑی، روڑ کی ریلوے سٹیشن پر نمائش کے لیے کھڑے ہیں)۔

اس نہر کی تعمیر میں برطانوی فوج کے ایک افسر، کاٹلی نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ انجینئرنگ کی دنیا میں یہ نہر اب ایک عظیم نہر کے طور پر جانی جاتی ہے۔ اس نہر کی تعمیر 1853ء میں ہوئی جبکہ 1854ء میں اس میں پانی چھوڑا گیا۔ گنگا کنارے اس منصوبے نے شمالی ہندوستان میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس کے بعد کبھی بھی ان علاقوں میں قحط نہیں پڑا، بلکہ اب تو یہ علاقے ہندوستان بھر کو اناج مہیا کرتے ہیں۔ ہم سب کو اس انگریز افسر کا شکر گزار ہونا چاہیے جس نے اس دور میں یہ عظیم منصوبہ سوچا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

روڑ کی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ہندوستان کا پہلا انجینئرنگ کالج بھی اسی شہر میں کھولا گیا۔ اس ادارہ کی بنیاد 1845ء میں رکھی گئی۔ یاد رہے 1849ء گجرات میں سکھوں کے ساتھ آخری لڑائی میں انگریزوں کی جیت کے بعد پنجاب پر مکمل قبضہ ہوا تھا اور اس کالج کا قیام اس سے بھی چار سال قبل ہو چکا تھا۔ روڑ کی میں سول انجینئرنگ کا محکمہ 1847ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کالج کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس وقت کے ایفینینٹ گورنر جیمز تھامسن کے نام پر رکھا گیا۔ رائے بہادر کنیا لال اس کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ اب یہ ساتواں ہندوستانی انسٹی ٹیوٹ آف

ٹیکنالوجی ہے، اور اب اس کا نام بدل کر انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی روڑ کی رکھ دیا گیا ہے۔ جیمز تھامسن کے نام کو بدلنے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی، معلوم نہیں۔ نام تو بدل دیا گیا لیکن تاریخ تو نہیں بدلی جاسکتی، بانی تو وہی کھلائے گا۔

روڑ کی ان علاقوں میں شامل ہے جہاں مسلمان آبادی کا پچیس فیصد سے بھی زائد ہیں اور ان میں سے اکثریت کی مادری زبان اردو ہے۔ روڑ کی میں انگریزوں نے 1853ء میں اپنی ایک چھاؤنی بنائی جس نے جنگ آزادی کے مجاہدین کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ چھاؤنی اب ایک قدیم ترین چھاؤنی ہے جو بھارتی فوج کے کنٹرول میں ہے۔ اب ہم کرنال سے آگے آگئے تھے۔ اس موقع پر شاہ صاحب نے کرنال سے تعلق رکھنے والے ایک مشہور نعت گو شاعر عاصی کرنالی کا ذکر بھی کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ابتداء میں ان کا شمار غزل گو شعراء میں ہوتا تھا لیکن بعد میں انھوں نے نعت لکھنا شروع کی اور اب ان کی وجہ شہرت نعت ہی ہے۔ انھوں نے حمد بھی کہی۔ ان کہی ہوئی حمد اور نعت کے چند اشعار:

نقش ترا فزوں فزوں، نام ترارواں رواں

مدحت ری سخن سخن، وصف ترا بیاں بیاں

کام مرا خطا خطا، شان تری عطاء عطاء

میرے خدا کرم کرم، میرے کریم اماں اماں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے:



جب دشنہ دشنہ --- دشنہ خزاں تیز تھا

جب شعلہ شعلہ --- شعلہ برق ستیز تھا

جب خیمہ خیمہ --- خیمہ مرگ و فساد تھا

جب قریہ قریہ --- قریہ کفر و عناد تھا

جب فتنہ فتنہ --- فتنہ شدادِ وقت تھا

جب نالہ نالہ --- نالہ بی دادِ وقت تھا

جب عقدہ عقدہ --- عقدہ تقصیرِ فہم تھا

جب حلقہ حلقہ --- حلقہ زنجیر و ہم تھا

جب گوشہ گوشہ --- گوشہ صد انبساط تھا

جب بندہ بندہ --- بندہ عیش و نشاط تھا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد

اب پردہ پردہ --- پردہ سازِ جمال ہے

اب بادہ بادہ --- بادہ عرفانِ حال ہے

اب جرعه جرعه۔۔۔ جرعه جام الست ہے

اب ذرہ ذرہ۔۔۔ ذرہ خورشیدِ مست ہے

اب قطرہ قطرہ۔۔۔ قطرہ اشکِ نیاز ہے

اب توبہ توبہ۔۔۔ توبہ سوز و گداز ہے

اب غنچہ غنچہ۔۔۔ غنچہ زلفِ نگار ہے

اب لالہ لالہ۔۔۔ لالہ رخسارِ یار ہے

اب جلوہ جلوہ۔۔۔ جلوہ سرو سمن ہوا

اب خندہ خندہ۔۔۔ خندہ صبحِ چمن ہوا

اب نعرہ نعرہ۔۔۔ نعرہ توحید بن گیا

اب سجدہ سجدہ۔۔۔ سجدہ امید بن گیا

مجموعہ کلام : مدحت

اس علاقے میں اردو بولنے والوں کی ایک واضح تعداد کے سبب یہاں کے لوگ ہندی میں بھی زیادہ تر اردو کے الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ جس سے ہندی سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

## تھانہ بھون: مولانا اشرف علی تھانوی کا شہر

کرناٹ سے تیس کلومیٹر مغرب کی طرف دیوبند سے پہلے تھانہ بھون کا ایک قصبہ موجود ہے۔ ملت اسلامیہ کے ایک اہم راہ نما مولانا اشرف علی تھانوی کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ہم ایک ایسے قصبے کے قریب سے گزر رہے ہیں جہاں ایک عالم باعمل نے اپنی زندگی گزاری۔ یہ جاننے کے بعد میں نے ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں۔ ایک عظیم ہستی کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے جن کے امت مسلمہ پر بے حد احسان ہیں۔

تھانا بھون اتر پردیش کے شمالی ضلع کا ایک چھوٹا قصبہ ہے۔ جس کی آبادی چالیس ہزار کے قریب ہے۔ یہاں پچاس فیصد سے بھی زائد مسلمان ہیں۔ میرے علم کے مطابق یہ شمالی ہندوستان کا وہ واحد شہر ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تھانہ بھون کا نام دیوبی بھون مندر کی مناسبت سے ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ 120 کلومیٹر ہے۔ قدیم دیوبی بھون مندر کے علاوہ بھی اس شہر میں کئی اور مندر بھی موجود ہیں۔ اس قصبے میں مولانا اشرف علی تھانوی کا گھرانہ کی قبر اور مسجد، مدرسہ اور کتب خانہ، اہم مقامات میں سے ایک ہیں۔



A Road in Thana Bhawan

Photo Credit: @mfarookkazi Twitter

مولانا اشرف علی تھانوی کا نام ذہن میں آتے ہی ان کی کتاب بہشتی زیور کی طرف دھیان جاتا ہے جو مولانا کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ آپ 1863ء میں پیدا ہوئے اور قیام پاکستان سے قبل (جس کے لیے وہ عمر بھر کوشش کرتے رہے) 1943ء میں وفات پا گئے۔ انھوں نے تفسیر بیان القرآن بھی لکھی جو ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی مسلم لیگ کے ایک متحرک قائد تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح سمیت آل انڈیا مسلم لیگ کے کئی لوگوں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے قائد اعظم کو مذہبی مشورے اور نصیحتیں دینے کے لیے علمائے کرام کے وفد بھی بھیجے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے شاگردوں نے بھی ان کے ہمراہ قیام پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جبکہ دیوبند کے کئی علماء کانگریس کے حمایتی تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی محمد شفیع اور مولانا شبیر احمد عثمانی سمیت دیوبند کے کچھ سرکردہ علماء مسلم لیگ کے حق میں بھی تھے۔ اسی بناء پر تھانوی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی انتظامی کمیٹی سے استعفیٰ بھی دیا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب پاکستان آزاد ہوا تو علامہ شبیر احمد عثمانی نے مغربی پاکستان میں اس کا پہلا پرچم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کی

موجودگی میں بلند کیا جبکہ مشرقی پاکستان میں یہ فریضہ علامہ ظفر احمد عثمانی نے خواجہ ناظم الدین کی موجودگی میں ادا کیا تھا۔

## گنگوہ: مولانا رشید احمد گنگوہی کا شہر

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گنگوہ ایک قدیم شہر ہے۔ اس کی بنیاد ایک مشہور ہندو راجہ گینگ نے رکھی تھی۔ اس شہر کے دو حصے ہیں؛ ایک قدیم اور ایک جدید۔ جدید علاقے میں ایک مشہور صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس نے اپنا ڈیرہ جمایا۔ ان کا مقبرہ بھی وہیں پر موجود ہے۔ 1537ء میں ہمایوں نے ان کا مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا (اسی لیے گنگوہی ان کے نام کا حصہ ہے۔ پہلے یہ رواج عام تھا کہ لوگ اپنے نام کے ساتھ اپنے شہر کا نام لکھتے تھے، اب ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے) آپ نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اس شہر نے جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ جنگ آزادی کے دوران یہاں کے مقامی گجروں (گوجروں) نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر کے راجہ فتحوا کو اپنا راجہ تسلیم کر لیا۔ انگریزوں کو یہ کیسے گوارہ ہوتا۔ لہذا انھوں نے اس شہر پر ایک بھرپور حملہ کر کے انھیں مکمل طور پر شکست دے دی۔ گنگوہ شہر میں تین قدیم مساجد ہیں، جن میں سے دو کی تعمیر اکبر اور جہانگیر کی نگرانی میں ہوئی۔

اکبر کے دور میں گنگوہ سہارنپور سرکار کے زیرِ تحت تھا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر میں ترک بھی آباد تھے، جن کی ذمہ داری مغلوں کی مدد کرنا تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے ساتھ ساتھ ترک بھی ہندوستان میں آکر آباد ہوئے۔ عبدالقدوس گنگوہی (جن کا مزار اسی شہر میں ہے) فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ایک عظیم صوفی شاعر تھے اور چشتیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مکتوبات

عبدالقدوس گنگوہی کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں بھی ملتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد بھی ان کے مزار پر آتی ہے۔ ان کے بارے میں بہت ہی خوبصورت باتیں بھی جاننے کو ملتی ہیں۔

اس شہر کی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کی تعداد ستر فیصد سے بھی زائد ہے۔ میرے علم کے مطابق مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہندوستان بھر میں شاید ہی کسی اور شہر میں ہو۔



Madrisa in Gangoh Photo Credit: <https://jamiat.org.za>

## تقسیم ہند، لاکھوں لوگوں کا قتل، ہجرت اور نقل مکانی ذمہ دار کون: بھارت ایک مسلمان کی نگاہ میں

اب شام ڈھل رہی تھی لیکن ابھی بھی ہماری منزل دور تھی۔ سفر کی تھکان اور گرمی کی شدت کم کرنے کے لیے ہم کئی بار رکے۔ شاہ صاحب بھی بار بار رکنا پسند فرماتے تھے۔ اس سے انھیں مقامی لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ ہریانہ ان کا آبائی گاؤں ہونے کی وجہ سے بھی وہ خود کو اپنے علاقے میں ہی محسوس کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب چائے مل جاتی تو وہ مجھے شعر بھی سناتے تھے۔ مجھے اپنے آبائی گھر پہنچنے کے لیے ایک دن کا مزید انتظار کرنا تھا لیکن میرے جذبات

اور احساسات کا انھیں بھی اندازہ تھا لہذا انھوں نے آبائی وطن کی محبت میں کئی اشعار کہے۔

سفر تو کٹ ہی رہا تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہم بہت سست روی سے چل رہے ہیں، حالانکہ ایسا انھیں تھا۔ مجھے منزل تک پہنچنے کی جلدی تھی اسی وجہ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

میری منزل تو میرے والد اور والدہ کے گھر تھے جہاں ان کی پیدائش ہوئی، جہاں ان کا بچپن گزرا، جہاں میرے آباؤ اجداد کی قبریں ہیں، جہاں ان کو دھرم بدل کر جان بچانا پڑی، جہاں میری سوتیلی والدہ اغوا کی گئیں، جہاں میرے نزرگوں کا قتل عام ہوا، جہاں وہ ایک بادشاہ کی زندگی گزار رہے تھے، جہاں سے میرا صدیوں پرانا رشتہ تھا، جو علاقہ میری پہچان تھا۔۔۔ وہ پہچان آج بھی ہے۔۔۔ آج کئی دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی لوگ ہمیں سرہندی کہہ کر پکارتے ہیں جہاں وہ ہستی مدفن ہے جن کے ہاتھوں ہم مسلمان ہوئے۔۔۔ یہ سب دیکھنے کے لیے میں مسلسل اپنے مغرب کی جانب دیکھ رہا تھا۔۔۔ جہاں سورج غروب ہو رہا تھا۔۔۔ وہیں میرا ماضی بھی دفن ہے۔۔۔ اس لیے وقت بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔۔۔ ایک دن بھی اب ایک صدی جتنا طویل لگ رہا تھا۔۔۔ لیکن گھڑی کے توجذبات نہیں ہوتے، اسے تو اپنی رفتار سے ہی چلنا ہوتا ہے۔۔۔ اسے تو سبھی کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔۔۔

جب ہم کرناں سے آگے نکلے تو میں نے نقشے میں دیکھا کہ ہمارے ایک طرف تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر گنگوہہ شہر اور ہمارے بائیں طرف چالیس کلومیٹر سے زائد فاصلے پر کیتھل شہر موجود تھا۔ دونوں شہروں کے درمیان ایک سب سے بڑے فرق نے مجھے حیران کر دیا، جو مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کا تھا۔ گنگوہہ

شہر میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ جبکہ کیتھل شہر میں مسلمانوں کی تعداد ایک فیصد سے بھی کم ہے۔

میں یہ بات آج تک سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کسی قصبے سے مسلمانوں کو ہجرت پر اس قدر مجبور کیا گیا کہ آج اس شہر میں مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں رضیہ سلطانہ کے مقبرے کے ساتھ کئی مشہور صوفی بزرگوں کے مزارات بھی ہیں۔ ان میں ایک بزرگ جناب شیخ طیب بھی ہیں جن کا اصل نام لالہ میدنی مل تھا ان کے ساتھ ساتھ شاہ کمال قادری اور شاہ سکندر قادری بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ ان کے مزاروں پر ہندو اور سکھ بھی آتے ہیں۔ پھر یہ اتنا فرق کیوں ہوا کہ گنگوہ شہر کے لوگوں نے بالکل ہی ہجرت نہیں کی یا بہت کم لوگوں نے ہجرت کی اور کیتھل شہر سے تمام مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ میں اس بات کی کھوج میں لگا رہا۔ اتفاق سے ہم ایک جگہ رکے اور مجھے ایک مقامی مسلمان سے بات چیت کرنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے میرے سوال کے جواب میں جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ حاضر خدمت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا جواب میری عمومی سوچ سے کافی مختلف تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ بٹوارے (میرے بزرگ بھی تقسیم ہند کو بٹوارے کا نام دیتے تھے اور ہلے کا نام بھی دیتے تھے، یہ لفظ ہلہ بولنا سے نکلا ہوا ہے) کے وقت پاکستان اور بھارت میں خوف و ہراس کی ایک ایسی فضا قائم ہو گئی تھی کہ مسلمان بھارتی پنجاب میں رہنا نہیں چاہ رہے تھے کیونکہ ان کو یہ باور کروا دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان ہے اور بھارت غیر محفوظ جگہ ہے۔ آپ کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کو بھی یہ سمجھ آ رہی تھی کہ بھارت ہی ان کا اصل وطن ہے۔

میں نے پوچھا ایسا کس نہ کیا؟ تقسیم ہند کی بات تو عرصے سے چل رہی تھی۔ یہ تو سب کو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ بٹوارا ہو کر رہے گا لیکن ہجرت اور نقل مکانی بھی ہو گی یہ



تو شاید کسی نے بھی سوچا نہ ہوگا۔ اس پر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ان کے علم کے مطابق پاکستان کے موجودہ علاقوں میں کئی ایسے قصبے اور گاؤں موجود تھے جہاں ہندوؤں یا سکھوں کی اکثریت تھی، کیا اب بھی پاکستان میں کوئی ایسا قصبہ یا گاؤں موجود ہے جہاں ہندوؤں اور سکھوں کی ایک قابل ذکر آبادی ہو؟ میں نے کہا پنجاب، صوبہ سرحد (موجودہ کے پی کے) اور بلوچستان میں تو ایسا بالکل نہیں ہے البتہ سندھ کے علاقے تھر پار کر میں ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد آباد ہے۔ وہاں سے ہندو ہی اسمبلیوں کے انتخابات بھی جیتتے ہیں۔ یہ سب جان کر انھوں نے کہا کہ اس کا مطلب ہوا کہ سندھ کو چھوڑ کر سب جگہوں سے ہندوؤں اور سکھوں کا بالکل صفایا کر دیا گیا۔

انھوں نے مزید بتایا کہ جیسے آپ لاہور سے ہیں، لاہور کا اکثر کاروبار ہندوؤں اور سکھوں کے پاس تھا۔ لاہور شہر کی تعمیر میں ہندوؤں اور سکھوں نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے وہاں بڑے بڑے رہائشی ادارے بھی بنائے۔ سرنگارام ہسپتال، گلاب دیوی ہسپتال، دیال سنگھ کالج اور لائبریری کے علاوہ بھی کئی ادارے موجود ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ تقسیم ہند سے قبل لاہور کی بنائی ہوئی تاریخی عمارتوں میں سے کوئی ایک بھی مسلمانوں کی ڈیزائن کردہ نہیں ہیں؟ آپ کی یونیورسٹیوں میں ہندو اور سکھ اساتذہ کی اکثریت تھی، آپ کا مال روڈ، انارکلی انھی لوگوں سے بھرا پڑا تھا، انھوں نے ہی پہلی مرتبہ لاہور کی چار دیواری کے باہر، سنت نگر، کرشن نگر، ماڈل ٹاؤن جیسے علاقے آباد کیے تھے۔ یہ سب بتانے کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ اب لاہور شہر میں کتنے ہندو اور سکھ رہتے ہیں؟ کتنی دکانیں ان لوگوں کی ہیں؟۔ آج پاکستان میں کوئی بھی شہر ایسا نہیں ہے (حتیٰ کہ نکانہ صاحب بھی نہیں جو سکھوں کا ایک متبرک مقام ہے) جہاں کبھی ہندو یا سکھ اکثریت میں تھے۔ یہ سب آخر کیوں ہوا؟

ان کی طرف سے ایسی گفتگو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ میں کوئی جواب نہ دے پایا۔ کچھ وقفے کے بعد میں نے پھر پوچھا کہ میرا سوال تو ابھی تک آپ کے جواب کا منتظر ہے۔ اس پر بھی کچھ کہیے۔ میری بات سن کر انھوں نے کہا کہ حقیقت کو کہیں چھپا دیا گیا ہے۔ دونوں طرف کے تاریخ دانوں نے ایسا کیا ہے اور انھوں نے ایسا اُس وقت اور موجودہ وقت کی سیاسی، فوجی اور مذہبی قیادت کے کہنے پر کیا ہے۔ میں نے بغیر کسی توقف کے کہا کہ تاریخ کے ساتھ ایسا کھلاڑ کون کر سکتا ہے اور کتنی دیر کر سکتا ہے؟ واقعات تو واقعات ہیں، کبھی نہ کبھی تو کھل کر سامنے آئیں گے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن اب تک تو سرحد کے دونوں طرف سچ کو کامیابی سے ہی چھپایا گیا ہے اور ایسا کب تک ہوگا معلوم نہیں۔

یہ سب کہنے کے بعد وہ گویا ہوئے کہ اب میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ بھارت سے مسلمانوں کی ہجرت کی تین بڑی وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ جن علاقوں میں مسلمان کمزور تھے اور ہندوؤں اور سکھوں کی حکومت تھی، وہاں مسلمانوں پر زندگی تنگ کر دی گئی اور اس قدر قتل و غارت کی گئی کہ مسلمان ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ ایسا زیادہ تر ان علاقوں میں ہوا جہاں سکھوں کی حکمرانی تھی، جیسا کہ ریاست پٹیالہ، ریاست بھرت پور اور پنجاب میں واقع دیگر ریاستیں۔ ایسا بالکل نہیں ہے کہ ہندوؤں کی ریاستوں میں ایسا انھیں ہوا لیکن میرے خیال میں وہاں دوسروں کی نسبت کم ہوا ہے۔ اس لیے ایسے علاقوں کے مسلمانوں کے لیے بے سرو سامانی کی حالت میں گھربار چھوڑنا مجبوری بن گیا۔ یہ سب کچھ مقامی ہندو اور سکھ حکمرانوں کے آشیر باد سے ہوا، وہ چاہتے تو اسے روک سکتے تھے۔

انھوں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ کیا ریاست پٹیلہ کا حکمران ان فساد یوں کے سامنے بے بس تھا؟ ایسا ہر گز نہیں تھا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کی ریاستوں سے مسلمانوں کا انخلاء ان کی اپنی خواہش تھی۔ میرے لیے ان کی یہ بات حیران کر دینے والی تھی۔ میں نے اسی حیرانی سے پوچھا کہ ایسا کرنے میں ان کا کیا فائدہ تھا؟ جواب میں انھوں نے بس اتنا کہا کہ اپنے ہم مذہبوں پر حکمرانی آسان ہوتی ہے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ نہ کوئی مسلمان ہو اور نہ ہی انھیں اقتدار میں شریک کرنا پڑے گا۔

میں نے پوچھا کیا اس کے پیچھے اسلام دشمنی تو نہیں تھی؟ ان کا جواب بڑا معنی خیز تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میرے خیال میں اسلام دشمنی نہیں بلکہ مسلمان دشمنی کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ ہندوستان میں بسنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ساتھ چند نادان مسلمان حکمرانوں کا کردار بھی ہے اس کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی رہنماؤں کی پھیلائی ہوئی غلط باتیں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

دوسرے وہ علاقے تھے جہاں مسلمانوں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور وہ بہت اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ ایک مناسب افرادی قوت بھی رکھتے تھے۔ فسادات کے دوران انھوں نے فساد یوں کا مقابلہ بھی کیا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ جیسے ہی حالات نارمل ہوئے تو ان میں سے کچھ لوگوں نے ہجرت بھی کی جبکہ ایک بڑی تعداد نے بھارت میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ ان میں گنگوہ، مظفر نگر، دیوبند، سہارنپور اور لکھنؤ وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔

ہجرت کی دوسری وجہ نظریہ پاکستان اور اسلام سے محبت تھی۔ تقسیم ہند سے قبل مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مسلم لیگ کے ساتھ تھی۔ مسلم لیگ کا نعرہ یہ تھا کہ پاکستان اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رہیں۔ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنائیں اور دنیا کے سامنے ایک نمونہ پیش کریں۔

بے شمار لوگ اس بات کے حامی تھے۔ جن میں علماء کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ ساتھ یوپی اور سی پی میں رہنے والے وہ لوگ بھی تھے جو کبھی بھی پاکستان کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔ ان لوگوں نے اسی سوچ کے ساتھ پاکستان ہجرت کی۔ ان نامی گرامی لوگوں میں علماء کے علاوہ بے شمار امراء بھی تھے۔ مولانا مودودی کامرکز پٹھان کوٹ میں تھا (جو کہ گرداس پور کے علاقے میں واقع تھا اور مسلمان صدیوں سے اس علاقے پر حکمرانی کرتے آ رہے تھے) اس کا نام بھی راجپوتوں کے قبیلے پٹھانیا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہاں نورپور کے نام سے ایک مسلمان ریاست بھی موجود تھی۔ یہ شہر پنجاب کا آخری شہر ہے۔ میرے علم کے مطابق مولانا مودودی اور ان کے ساتھی بغیر کوئی نقصان اٹھائے پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ انھوں نے پاکستان کو بھارت پر ترجیح کیوں دی؟ اس کی وجہ سوائے اسلام سے محبت کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانی اور مفتی شفیع عثمانی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ایسے بے شمار لوگ ہیں جنہوں نے نظریہ پاکستان کو سامنے رکھ کر ہجرت کی۔

ہجرت کی تیسری وجہ کاروبار یا خاندان کو تقسیم ہونے سے بچانا تھا۔ گو کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن تھی ضرور۔ تقسیم ہند سے قبل ایسے کئی خاندان تھے جو ان علاقوں میں رہتے تھے جو تقسیم ہند کے نتیجے میں پاکستان یا بھارت کا حصہ بن گئے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں ان کا آپس میں میل ملاپ مشکل ہو جائے گا اس لیے انھیں پاکستان ہجرت کر جانی چاہیے۔

مجھے میرے ٹیکسٹائل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر فیض احمد بھٹی صاحب نے بھی ایک بات بتائی تھی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ تقسیم سے پہلے ایف سی کالج کے انگریزی کے ایک استاد بھارت چلے گئے تھے کیونکہ ان کا سارا خاندان ان علاقوں میں تھا جو بھارت کا حصہ بن گئے۔ اس سے بھی مختلف ایک واقعہ مجھے پی سی ہوٹل کراچی میں ایک

ہندو ڈرائیور نے سنایا تھا۔ اس نے بتایا کہ تقسیم ہند کے وقت ان کے خاندان کے کچھ لوگ بھارت میں اور کچھ کراچی میں تھے۔ ان سب نے مل کر پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ایک ہندو خاندان نے بھارت سے پاکستان میں نقل مکانی بھی کی۔

یہ سب کہہ کر انھوں نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی اور پھر بتایا کہ اسی وجہ سے ہم جہاں بیٹھے ہیں (یعنی جی ٹی روڈ پر اس کے شمال میں بڑی تعداد میں مسلمان بستے ہیں اور جنوب میں (جہاں پٹیلہ واقع ہے اور سکھوں کی اکثریت ہے) مسلمانوں کا نام و نشان بھی نہیں ملتا ہے۔ میں ان کے جواب سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ میں نے ان سے اجازت لینا چاہی لیکن انھوں نے کہا کہ ابھی نہیں۔ اب آپ کو میرے بھی کچھ سوالوں کا جواب دینا ہوگا۔ میں نے کہا حاضر جناب۔

ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں نے نقل مکانی کیوں کی اور پاکستان سے عیسائیوں نے نقل مکانی کیوں نہ کی؟ میرے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا۔ انھوں نے مجھے خاموش دیکھتے ہوئے کہا کہ تقسیم ہند سے پہلے ان علاقوں میں (جو پاکستان کا حصہ بنے) ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد بیس فیصد کے قریب تھی۔ کیا ان کی نقل مکانی کے پیچھے ہندو یا سکھ مذہب تھا یا کوئی وجہ تھی؟ میں نے بڑا سوچ کر جواب دیا کہ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک خوف کا عالم تھا۔ بھارتی علاقے میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کے ردِ عمل میں جو کچھ ان کا ساتھ ہو رہا تھا اس سے خوفزدہ ہو کر ان لوگوں نے بھارت جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ دوسری وجہ مذہب، کلچر، کاروبار یا خاندان کا یکجا ہونا بھی ہو سکتی ہے۔ میرے اس جواب سے وہ مطمئن نہ ہوئے اور جو کچھ انھوں نے کہا وہ بھی خاصا غیر متوقع تھا۔

انھوں نے کہا کہ ان کے نزدیک ہندوؤں اور سکھوں کی نقل مکانی ایک سیاسی اور معاشی مسئلہ تھا۔ تقسیم ہند کے وقت پاکستان کے پانچوں صوبوں (پنجاب، سندھ،

بلوچستان، صوبہ سرحد اور بنگال) سمیت کسی بھی صوبے میں مسلم لیگ کی حکومت نہیں تھی۔ مسلم لیگ کو 1937ء کے انتخابات میں بری طرح شکست ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان صوبوں میں کوئی بھی غیر مسلم حاکم نہیں تھا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ صوبہ سرحد میں کانگریس کی حکومت تھی جبکہ بنگال میں ایک اتحاد کی حکومت تھی جس کا کانگریس بھی حصہ تھی۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں مسلم لیگ نے ہی پاکستان کی ایک بڑی جماعت بننا تھا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں اگر ہندوؤں اور سکھوں نے نقل مکانی نہ کی تو ان کی بیس فیصد آبادی کو مسلم لیگ کے لیے نظر انداز کرنا ایک مشکل کام ہوگا۔

اس وقت صورتحال یہ تھی کہ کانگریس میں مسلمان، ہندو، سکھ غرض سبھی مذاہب کے شامل لوگ تھے جبکہ مسلم لیگ میں صرف مسلمان ہی تھے۔ ایسی صورتحال میں مسلم لیگ کے لیے مشکلات کا زیادہ امکان تھا۔ اس لیے ہندوؤں اور سکھوں کی نقل مکانی مسلم لیگ کے حق میں بہتر تھی۔ میں نے یہ سب سن کر کہا کہ ایسا نہیں ہے۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا مطلب تو یہ ہے نقل مکانی مسلم لیگ کی خواہش تھی۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہوا۔ ان کا جواب تھا کہ یہ ایک بحث ہے جو دیر سے چل رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ میں اور آپ اپنے اپنے موقف پر قائم رہیں گے۔ حقیقت کیا ہے شاید چند سال بعد اشکار ہو۔

آخر میں میں نے کہا کہ میں آپ کو یہ بھی یاد دلادوں کہ تقسیم ہند کے بعد قائد اعظم نے اپنی پہلی تقریر میں ہی یہ کہا تھا کہ اقلیتوں کو پاکستان میں ہر طرح کی مذہبی آزادی ہوگی اور وہ پاکستان میں برابر کے شہری ہوں گے۔ ان کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ مزید بحث سے بچنے کے لیے ہم نے اس موضوع پر بات ختم کر دی۔

ان کی دوسری بات یہ تھی کہ پاکستان کے موجودہ علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی مالی حیثیت مسلمانوں کی نسبت بہتر تھی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ کی غلہ منڈی میں کتنی دکانیں مسلمانوں کی تھیں؟ میں نے بتایا کہ صرف ایک یہ سن کر انھوں نے کہا کہ باقی لوگ یا تو ہندو تھے یا سکھ۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کی دکانوں پر کس نے قبضہ کیا؟ میں نے کہا کہ مقامی اور مہاجر مسلمانوں نے۔ نقصان کس کا ہوا؟ مسلمان کا یا غیر مسلم کا؟ فائدہ کس کو پہنچا؟ اب آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں کی نقل مکانی کس کے فائدے میں تھی۔ اس کے جواب میں، میں نے کہا کہ میرا خاندان بھی سرہند میں ایک وسیع اراضی کا مالک تھا جبکہ پاکستان میں جا کر سب لوگ مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ میرے خاندان کا بھی بے حد مالی نقصان ہوا۔ اس لیے یہ کہنا کہ ہندوؤں اور سکھوں کا ہی مالی نقصان ہوا، درست نہیں ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یوں تو کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کا کم اور ہندوؤں یا سکھوں کا زیادہ مالی نقصان ہوا تھا۔

انھیں یہ بھی معلوم تھا (جو مجھے بالکل یاد نہیں تھا) کہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں مسلمانوں کی آبادی 63 فیصد جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی تیس فیصد سے زائد تھی۔ اس شہر میں اب کتنے ہندو یا سکھ رہتے ہیں؟ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔ لاہور شہر میں کتنے مندر اور گردوارے تھے اور اب کتنے ہیں؟ نہ ہونے کے برابر۔ یہ سب کہاں گئے۔ مال پر چھوڑی ہوئی دکانیں اور بڑی بڑی جاگیریں کس کے قبضے میں ہیں؟ انھوں نے آخری بات کہہ کر بات ختم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ کبھی آپ نے سنا ہے کہ کسی ہندو یا سکھ نے کسی مسلمان ساہوکار سے قرضہ لیا ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے ایسا کبھی نہیں سنا۔ اس لیے کہ دولت تو ساری ہندوؤں کے پاس ہی تھی۔

میں نے ان کی بات کا جواب دیے بغیر ان سے یہ پوچھا کہ ہندو اور سکھوں کی نقل مکانی صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے علاقوں سے نسبتاً پر امن طور پر ہی ہوئی جبکہ پنجاب کے علاقوں سے ان کی نقل مکانی کے وقت کافی قتل و غارت ہوئی اسی طرح میرے علم کے مطابق بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں پر بھی سب سے زیادہ ظلم مشرقی پنجاب میں ہی ہوا تھا۔ جنوبی ہند، یوپی سی پی کے علاقوں سے مسلمان قدرے امن سے ہجرت کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پنجاب مشرقی ہو یا مغربی سب سے زیادہ قتل و غارت یہیں پر ہوئی تھی۔ زیادہ تر نقل مکانی بھی اسی علاقے کے لوگوں نے کی اور مالی نقصان بھی یہاں بسنے والوں کا ہی ہوا۔

آخر اس جرم کا قصور وار کون ہے؟ کئی لاکھ لوگوں کا قتل اور نقل مکانی اور لامحدود مالی نقصان کی وجہ سے صدیوں سے رہنے والوں اپنے چھوڑ کر جانا پڑا۔ کوئی تو ذمہ دار ہوگا؟ اس وقت ان علاقوں میں مسلم لیگ کی حکومت نہیں تھی اور انگریزوں کی مقامی حکومتیں قائم تھیں۔ کون تاریخ کے سب سے بڑے سانحہ کا ذمہ دار ہے؟ کس نے یہ سب کچھ کیا؟ کیا یہ سب کچھ روکا نہیں جاسکتا تھا؟

جب میں یہ ساری باتیں کر چکا تو انھوں نے کہا کہ اس کا ذمہ داری انھی پر عائد ہوتی ہے جو اس وقت حکمران تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وہ جو اس وقت سیاسی رہنما تھے۔ انگریزوں کو بھی اس سارے واقعے میں بے قصور نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ میں نے پوچھا کہ آج تک تاریخ دانوں نے بھی انھیں قصور وار نہیں ٹھہرایا؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ ان کا جواب میری آنکھیں کھول دینے کے مترادف تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میری یہ بات غلط نہیں ہے لیکن شاید ہی اسے کوئی قبول کرے، لیکن مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر آج لوگ اسے نہیں مانیں گے تو کل ضرور مانیں گے۔



ان کا کہنا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد اس ہجرت اور نقل مکانی میں قتل ہونے والوں کو ہمارے سیاسی، فوجی اور مذہبی رہنماؤں نے جدوجہد آزادی کا ہیرو بنا کر پیش کر کے اپنے اوپر آنے والی ذمہ داری کا رخ کسی اور طرف کر دیا۔ حالانکہ یہ تمام تر واقعات تقسیم ہند کے بعد ہوئے جب پاکستان بن چکا تھا اور بھارت بھی ایک آزاد ملک تھا۔ آزادی کی جدوجہد اپنے مقاصد حاصل کر چکی تھی۔ بعد ازاں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمان کا قتل عام ایک فساد تھا، افراتفری تھی، ایک بلوا اور لاقانونیت تھی۔

مشرقی پنجاب میں مسلمان آلو مولیٰ کی طرح کاٹے جا رہے تھے، مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام ہو رہا تھا، عورتوں کو اغوا کیا جا رہا تھا، لوگوں کو بے گھر کیا جا رہا تھا۔۔۔ یہ لوگ تو مظلوم تھے، انھیں کوئی نہ بچا سکا۔ بجائے اس کے کہ انھیں انصاف دلویا جاتا، فساد یوں کی گرفت ہوتی، ان مظلومین کو دونوں طرف مجاہدیں آزادی بنا کر، ان پر ہونے والے ظلم کو قربانی کا نام دے کر تاریخ کو اس طرح سے پیش کیا گیا کہ وہ ان لوگوں کو بچانے کی کوشش کی گئی جو ان تمام تر واقعات کے ذمہ دار تھے (جن میں انگریز بھی کسی سے کم نہ تھے)۔

اب ان کی بات میں جذبات کی شدت بھی شامل تھی۔ میرے لیے بھی وہ سب کچھ نیا تھا۔ جو تاریخ ہمیں پڑھائی گئی اس کے مطابق قتل ہو جانے والے مسلمانوں کو پاکستان کے قیام کی جدوجہد کا نام دے کر چپ کر دیا گیا۔ ایک طرف تاریخ کا پڑھا ہوا میرا وہ سبق تھا جس سے میں بے حد خوش تھا کہ جو کچھ میرے والدین کے ساتھ ہوا وہ قیام پاکستان کے لیے ان کی قربانی تھی جبکہ یہ صاحب کچھ اور کہہ رہے تھے۔ کیا سچ تھا اور کیا نہیں۔۔۔

یہ کون بتائے گا۔۔۔ میرے خیال میں وہی جو بچ بولنے کا حوصلہ رکھتا ہوگا اور جسے کسی کو بچانا نہیں ہوگا، جس کا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہوگا اور جو کسی کے کہنے پر تاریخ کے اوراق نہیں لکھے گا۔ کوئی تو ہوگا۔۔۔

وہ آپ بھی ہو سکتے ہیں اور میں بھی۔

اس گفتگو نے کئی اور سوالات کو بھی جنم دیا جن میں سے چند سوالات کچھ یوں

ہیں:

ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات کی اصل وجہ کیا تھی اور اس کا آغاز کہاں سے ہوا، کون سی ایسی اور مذہبی شخصیات تھیں جو فسادات کی آگ بھڑکانے میں شامل تھیں؟

کیا تقسیم ہند انگریزوں کی ایسی اسکیم تھی جس سے مسلمانوں کی طاقت کم کی جانی تھی اور یہ خیال آنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا کہ مسلم لیگ کی کوشش سے زیادہ ہندوؤں اور سکھوں کی ضد اور انانے قیام پاکستان کی راہ ہموار کی۔ اگر ایسا ہے تو انھوں نے ایسا کیوں کیا؟

ایک گروہ کا یہ بھی کہنا کہ انگریزوں کا راستہ روکنے کے لیے اس کے ہمسائے میں مسلمانوں کی ایک ریاست بنانا چاہتے تھے۔ اس کام کے لیے پاکستان کا قیام ضروری تھا۔ کیا یہ بات درست ہے؟

پاکستان میں بسنے والے سنی علماء اہلحدیث، بریلوی اور دیوبندی سمیت سبھی موجودہ بھارت میں موجود اپنے مسلک کے بزرگوں کی کتابوں اور باتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ وہ یہ سب نہایت عقیدت و احترام سے کرتے ہیں لیکن اگر ان

میں سے کسی نے تقسیم ہند پر ایک مختلف موقف اپنایا ہوا ہے تو اس پر اس قدر شدت سے تبصرے کیوں کیے جاتے ہیں؟ انھیں کانگریسی علماء کا خطاب بھی دیا جاتا ہے۔ ان تمام علماء کی مذہبی آراء کو تو بے حد اہمیت دی جاتی ہے جبکہ ان کی سیاسی سوچ کی وجہ سے ان کی سخت سرزنش کیوں کی جاتی ہے؟

میری خواہش تھی کہ میں یہ تمام سوالات بھی انھی صاحب سے لوں لیکن ہماری یہ نشست پہلے ہی کافی طویل ہو گئی تھی اور میرا سننے کا حوصلہ بھی ختم ہو تا جا رہا تھا۔ شاہ صاحب بھی جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ شام بھی ڈھل رہی تھی۔

میں نے اپنے ہم کلام سے اجازت چاہی اور دوبارہ سے اپنا سفر شروع کر دیا۔۔۔

میں نے اپنے تمام تر سوالات کو اس امید کے ساتھ سنبھال لیا کہ ابھی بہت سفر باقی ہے، کوئی نہ کوئی ایسا ضرور مل ہی جائے گا جس سے ان سوالوں کا جواب مل جائے گا۔

شام نے تو ڈھلنا ہی ہوتا ہے۔۔۔ جب وہ مسافر پر ڈھلتی ہے تو اسے ایک خوف دلاتی ہے کہ منزل سے پہلے شام اچھی نہیں ہوتی۔۔۔ شام منزل پر ہی ڈھلے تو اچھا ہوتا ہے۔۔۔

آج جب میں یہ تحریر لکھ رہا تھا تو میں نے اختر حسین سندھو صاحب کے مضمون دیکھے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق 1931ء میں لاہور کی آبادی ساڑھے چار لاکھ کے قریب تھی جس میں مسلمان ساڑھے فیصد کے قریب تھے، 33 فیصد ہندو تھے اور پانچ فیصد سکھ تھے۔ باقی، جین مت اور عیسائیت کے ماننے والے تھے۔ سندھو صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس وقت لاہور میں 97.97

تھے جن میں نوے کے مالک ہندو تھے صرف سات کے مالک مسلمان تھے۔ اسی طرح کل فیکٹریاں 218 تھیں جن میں سے مسلمانوں کی ملکیت صرف پینتالیس تھیں۔ کل 80 انشورنس کمپنیاں تھیں جن سے 78 کے مالک ہندو تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی مالی حالت کیسی تھی؟

اس وقت لاہور میں ہر تیسرا شخص ہندو تھا، اب لاہور میں شاید چند ہزار بھی ہندو نہ ہوں۔ یہ سب تقسیم ہند کا نتیجہ ہے۔ آزادی ہند تو ایک اعلیٰ مقصد تھا، اس کے لیے تو ہر ذات کے لوگوں نے قربانیاں دیں، لیکن تقسیم ہند کی بات کب شروع ہوئی، کیوں شروع ہوئی، یہ سب آزادی ہند سے چند سال قبل کی بات ہے۔

**کیٹھل: جہاں ہندوستان کی پہلی مسلمان حکمران خاتون رضیہ سلطانہ کا مقبرہ بھی ہے**

شام ڈھل رہی تھی اور ابھی خاصہ سفر بھی باقی تھا۔ گرمی اور جس کی وجہ سے سفر کی تلخی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی ایک مسلمان کی زبانی تقسیم ہند کی بات سن کر کئی خیالات بھی جنم لے رہے تھے۔ انھی خیالات میں گم سفر جاری تھا۔ کیٹھل شہر کے ذکر کے بغیر جہاں تیرہویں صدی میں ہونے والی ہندوستان کی پہلی مسلمان خاتون کا مقبرہ بھی ہے اور آپ کے ساتھ ساتھ کئی تاریخی عمارتیں بھی موجود ہیں آگے جانا آپ کے ساتھ نا انصافی ہوگا۔ کیٹھل کا ایک مختصر تعارف حاضر خدمت ہے۔

کیٹھل شہر کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مہابھارت کی نظم میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ ہندوؤں کے خیال میں یہ شہر بھگوان ہنومان کی جائے پیدائش بھی ہے۔ شہر میں ہنومان کا ایک بہت بڑا مجسمہ بھی لگا ہوا ہے۔ یہاں ان کی والدہ کے نام کا انجانی ٹیلہ بھی موجود ہے، یہ شہر جی ٹی روڈ سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب کی

طرف واقع ہے۔ اس کی مغربی سرحد ضلع پٹیالہ سے ملتی ہے۔ پنجاب کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کے راستے میں ہونے کی وجہ سے یہ شہر ہمیشہ ہی نشانے پر رہا ہے۔ ہر حملہ آور نے اس شہر کی بربادی میں کوئی کسر اٹھانا رکھی۔

دلی کے قریب اور دلی جانے والے راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے غوری کے دور سے ہی مسلمان اس علاقے پر قابض ہیں۔ بعد ازاں میں مغلوں نے اس علاقے پر قبضہ جمایا۔ مراٹھے بھی یہاں حکمرانی کرتے رہے۔ کئی سکھ حکمران بھی یہاں رہے۔ آخری حاکم انگریز تھا۔ اس شہر کی چند مشہور عمارتوں اور ان سے جڑے واقعات پیش خدمت ہیں۔

میں نے بارہا تاریخ میں رضیہ سلطانہ کا نام پڑھا اور جب مجھے یہ پتہ چلا کہ ہم اس شہر کے قریب سے گزر رہے ہیں جہاں اس کا مقبرہ موجود ہے تو خوشی ہوئی کہ ہم ایک ایسی خاتون کے علاقے میں سفر کر رہے ہیں جو نہایت ہی قابل اور بہادر عورت تھیں۔ وہ ہندوستان میں پہلی مسلمان حکمران تھیں۔ رضیہ سلطانہ، دلی کے سلطان التمش کی بیٹی تھی جو قطب الدین ایبک کے بعد دلی کا حاکم بنا تھا جبکہ اس کی ماں قطب الدین ایبک کی بیٹی تھی۔ رضیہ سلطانہ کا مقبرہ شہر سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ کچھ لوگوں کے بقول یہ عمارت توڑ پھوڑ کا شکار ہے (میں نے اب اس کی کچھ تصاویر دیکھی ہیں جن سے یہ لگتا ہے کہ اب اس کی حالت کافی بہتر ہے)۔ رضیہ سلطانہ نے تقریباً چار سال دلی پر حکمرانی کی۔ کہتے ہیں کہ وہ سلطانہ کلانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس لفظ سے یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی سلطان کی بیوی ہے۔ اس لیے اسے سلطان رضیہ کہا جائے لیکن تاریخ میں عام طور سے رضیہ سلطانہ ہی لکھا ہوا ہے۔ دلی کی اس حکمران کو اس علاقے کے جاٹوں نے اس کے خاوند سمیت قتل کر دیا تھا۔

رضیہ سلطانہ نے 1236ء سے 1240ء تک دلی پر حکمرانی کی۔ رضیہ کے والد مملوک سلطان شمس الدین التمش نے اپنے بڑے بیٹے کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اس کی اچانک وفات کے بعد اس نے اپنی بیٹی رضیہ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا، لیکن یہ سب کچھ رضیہ کے سوتیلے بھائی، رکن الدین فیروز کو قبول نہ تھا اور وہ تخت کا وارث بن بیٹھا۔ اس پر ان دونوں کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں رضیہ جیت گئی اور تخت کی وارث بن گئی۔ اس نے چار سال تک حکومت کی لیکن دربار سے وابستہ دیگر افراد کو ان کی حکمرانی زیادہ دیر تک راس نہ آئی اور انھوں نے اس کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی اور اسے تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے اس نے باغیوں کے ایک سردار اختیار الدین التوینا سے شادی بھی کی اور تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ ایک جنگ میں شکست کے بعد اسے اور اس کے خاوند کو کیتھل میں قتل کر دیا گیا۔ بعد ازاں اسی شہر میں اس کے سوتیلے بھائی بہرام خان نے اس کا مقبرہ بنوایا۔

ابن بطوطہ نے بھی اس مقبرے کا ذکر کیا ہے۔ اب ان کی قبر ایک خانقاہ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ان کی قبر پر ایک گنبد بنایا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس جگہ رضیہ کی قبر ہے وہاں ایک صوفی بزرگ شاہ ترکمان بیابانی کی خانقاہ تھی اور رضیہ ان کی مرید بھی تھی۔ رضیہ سلطانہ پر بھارت میں کئی فلمیں اور ٹی وی سیریل بھی بنے ہیں۔ ہندوستان میں خاموش فلموں کے دور میں بھی ان پر ایک فلم بنائی گئی اور یہ سب ان کی بہادری کے واقعات کو زندہ رکھنے کے لیے کیا گیا۔ ہمیں ان کا مزار دیکھنے کی سعادت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن یہ ضرور معلوم ہوا کہ اہل ہند پر اس دور میں باہر سے آ کر ایک خاندان غلاماں کی بہادر بیٹی نے بھی حکومت کی تھی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کا دور کئی لحاظ سے ایک بہترین دور گنا جاتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے ہمیشہ کوشاں رہتی تھیں۔



## RAZIA SULTAN

(1205-1240)

THE FIRST AND LAST WOMAN RULER OF  
DELHI SULTANATE

#INDIANWOMENINHISTORY

Razia Sultana Photo Credit: <https://feminisminindia.com>

کیٹھل میں شیخ طیب کا مقبرہ بھی بے حد مشہور ہے۔ شاہ سکندر نے ان کے مقبرے کی تعمیر کروائی تھی شیخ طیب بابا شاہ جمال کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ ان کا اصل نام لالہ میدنی مل تھا۔ وہ اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ اسی دور میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی ہندو بیوی کی اولاد شہر میں واقع قانون گھٹے میں رہتی ہے۔ مدت سے ایک رسم چلی آرہی ہے کہ جب بھی اس محلے میں کسی کی شادی ہوتی ہے تو شیخ طیب کے مزار پر کھیر تقسیم کی جاتی ہے۔

## شاہ کمال قادری اور شاہ سکندر قادری کیٹھلی کا مزار

شاہ کمال قادری اور شاہ سکندر قادری کے مزارات، جنہیں عرف عام میں پیر بابا بھی کہا جاتا ہے، کیٹھل شہر کے وسط میں موجود ہیں یہ مزارات پچھلے ساڑھے چار سو سالوں سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ شاہ کمال قادری، مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں بغداد سے آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پیر عبدالقادر جیلانی کے حکم پر ہندوستان آئے تھے۔ ان کے بارے میں ایک عجیب و غریب واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ بہت سخت قحط پڑا۔ شاہ کمال قادری صاحب نے دلے کے دو بڑے برتن تیار کرنے کو کہا۔ ایک کو ایک مسلمان باورچی نے تیار کیا جبکہ دوسرا ایک ہندو رہمن

نے تیار کیا۔ اعلان کیا گیا کہ پورے شہر کے لوگ دن رات یہاں آکر کھانا کھا سکتے ہیں اور اس دلیے کو اپنے گھروں میں بھی لے جاسکتے ہیں۔ اس کھانے کے بارے میں مشہور ہے کہ جب تک قحط کی کیفیت برقرار رہی، دلیا ختم نہ ہوا۔ جب قحط ختم ہوا تو یہ کھانا بھی بند کر دیا گیا۔

ان کے مزار پر مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد آتی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہندو اور سکھ بھی ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور ان سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ اب بھی دلیے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ ہر سال ساون (برسات کے مہینے) کی چاروں جمعرات کو، ہر مذہب کے لوگ دلیا تیار کر کے اسے درگاہ بھیجتے ہیں، جو ضرورت مندوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

جس نے بھی اللہ تعالیٰ کے کنبے سے محبت کی اللہ تعالیٰ نے اس کے نام کو بھی بڑا اور محفوظ کیا۔ یہ روایت اس بات کی ایک زندہ مثال ہے!

## کیتھل میں بارہ سوسال پرانا مندر اور جاٹ حکمرانوں کا بنایا ہوا قلعہ

اس علاقے میں قائم جاٹوں کی ریاست کا نام بھائی ریاست تھا۔ ان کے دور میں یہاں پر کافی عمارتیں بنائی گئی تھیں اور ان میں سے صرف ایک قلعہ ہی کسی حد تک اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ یہ قلعہ کم ایک بہت بڑا باغ ہے جس میں بڑی بڑی عمارتیں موجود ہیں۔

انھی کے دور کی کیتھل میں ایک تین منزلہ باؤلی (ایک گہرا کنواں جس کے چاروں طرف سیڑھیاں ہوتی ہیں) بھی بنائی گئی جسے بھائی کی باؤلی کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر یہاں کے جاٹ راجہ کے حکم پر اٹھارہویں صدی میں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر کلیات کے نام سے ایک بہت بڑا مندر بھی موجود ہے۔ آٹھویں صدی میں یہاں



پر ہندوؤں کا ایک مشہور مفکر کاپلہ رہ کر گیا تھا اور اس کی یاد میں یہاں پر اسی کے نام پر کلیات مندر بنایا گیا۔

اس شہر کے قریب ہی ایک جگہ ہے جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مہا بھارت کی لڑائی کے دوران یہاں پر موجود ایک گاؤں تھا جسے تباہ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ یہاں سے بہت ہی پرانے سکے اور برتن بھی ملے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ شہر زمانہ قدیم سے آباد ہے۔

اس شہر کی ایک منفرد بات یہ بھی ہے کہ پنجاب (جو کہ ایک ایسا صوبہ ہے جہاں بڑی تعداد میں سکھ رہتے ہیں) کے پاس ہونے کے باوجود یہاں پر سکھوں کی تعداد آٹھ فیصد بھی نہیں ہے اور مسلمان تو ایک فیصد سے بھی کم ہیں جبکہ اس کے ساتھ پنجاب کے ضلع پٹیالہ میں سکھوں کی تعداد ساٹھ فیصد سے بھی زائد ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ علاقہ سکھ اور ہندو ریاست کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ پنجاب سے ہندو اکثریت کا علاقہ الگ کر کے ہریانہ صوبہ بنانے کی وجہ ہندوؤں اور سکھوں کو علیحدہ علیحدہ علاقے میں بسانے کی ایک زندہ مثال ہے۔

کیا اسے بھی ہندو اور سکھ مذہب کی بنیاد پر دو قومی نظریہ کہا جاسکتا ہے، جس کی تقسیم ہند کے وقت ہندوؤں اور سکھوں نے سخت مخالفت کی تھی؟

**سہارن پور: مدرسہ مظاہر العلوم عظیم دینی درس گاہ اور تحریک آزادی ہند کے مجاہد**

ہم ابھی اپنی منزل (چندی گڑھ) سے کافی دور تھے۔ میں نے شاہ صاحب کو بتایا کہ ہمارے دائیں طرف پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر سہارن پور شہر واقع ہے۔ یہ

جان کرا انھیں بے حد خوشی ہوئی۔ سہارن پور کی شہرت کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ شہرت یہاں پر ایک بہت بڑے دینی مدرسے کا ہونا بھی ہے اس کا نام مدرسہ مظاہر العلوم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی تحریک آزادی ہند میں خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ جماعت اسلامی کے ایک بہت بڑے عالم اور رہنما مولانا گلزار احمد مظاہری صاحب نے بھی اسی مدرسہ سے تعلیم حاصل کی۔ ان کے نام کا لاحقہ ، مظاہری لفظ بھی اسی مدرسے کی وجہ سے ہی ہے۔ اس شہر کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

ہندوستان میں یہ شہر ان شہروں میں سے ایک ہے جس کا نام کسی بزرگ کے نام پر رکھا گیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ ہارون چشتی، جو اس علاقے کے ایک مشہور صوفی بزرگ تھے کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کی بنیاد ایک چین مت کے عالم نے رکھی تھی۔ شاید اسی وجہ سے بھی اس کا نام سہارن پور ہے لیکن زیادہ تر یہی مشہور ہے کہ شاہ ہارون چشتی صاحب کی وجہ سے اس شہر کا نام سہارن پور ہے۔ سہارن پور اتر پردیش کا ایک شہر اور ضلع سہارن پور کا انتظامی صدر مقام بھی ہے۔ دارالعلوم دیوبند بھی ضلع سہارن پور میں ہی واقع ہے۔

مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد اس علاقے پر نجیب الدولہ کی حکومت تھی۔ مراٹھا حکمرانوں، رگھوناتھ راؤ اور ہولکر راؤ نے مل کر اس پر حملہ کیا، جس کے نتیجے میں سہارن پور مراٹھوں کے قبضے میں آگیا۔ بعد ازاں روہیلوں اور مراٹھوں کے درمیان ایک اور جنگ ہوئی، جس کے نتیجے میں نجیب الدولہ کا پوتا غلام قادر گرفتار ہو گیا۔ سہارن پور شہر ایک قلعہ کی صورت میں میں نواب غلام قادر کی نشانی اب بھی موجود ہے۔ غلام قادر کی شکست کے بعد سہارن پور میں روہیلہ ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور یہ علاقہ مراٹھا سلطنت کا ایک اہم حصہ بن گیا۔ پھر وقت بدلہ اور دوسری اینگلو مراٹھا جنگ میں

مراٹھوں کو شکست ہو گئی یوں اٹھارویں صدی کے وسط میں سہارن پور ایسٹ انڈیا کمپنی کا حصہ بن گیا۔

تحریک آزادی ہند کے دوران انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں سہارن پور اور موجودہ مظفر نگر کے لوگوں نے مسلمان علماء کی قیادت میں زبردست کردار ادا کیا۔ انھوں نے انگریزوں کو کئی مقامات پر شکست بھی دی۔ تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے مقامی مسلمانوں کو ناقابل بیان سزائیں دیں۔ اس تحریک میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی پیش پیش تھے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تحریک آزادی کی مسلح جدوجہد کی ناکامی کے بعد ایک نئی سوچ نے جنم لیا۔ مسلمان رہنماؤں نے سوچا کہ مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی پہچان کو بچانے کے لیے ایک نئے انداز سے کام کیا جائے۔ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے 1867ء میں دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا اور سرسید احمد نے 1875ء میں علی گڑھ میں ایک ادارے کی بنیاد رکھی۔ ان سب کا مقصد پر امن طریقوں سے مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی شعور بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کو تیار کرنا تھا جو اس مشکل دور میں مسلمانوں کی راہ نمائی بھی کر سکیں۔ یہ ایک نہایت ہی درست فیصلہ تھا۔ دونوں طرح کے اداروں نے مسلمانوں کی بے حد خدمت کی۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی سہارن پور کا مدرسہ مظاہر العلوم بھی ہے۔

مدرسہ مظاہر العلوم کی بنیاد دارالعلوم دیوبند کے قیام کے چھ ماہ بعد نومبر 1866ء کو احمد علی سہارن پوری، مظہر علی نانوتوی اور سعادت علی صاحب نے رکھی۔ آغاز میں اس کی سرپرستی مولانا رشید احمد گنگوہی نے کی جبکہ بعد ازاں خلیل احمد سہارن پوری کے زمانے میں اس کی شہرت میں بے حد اضافہ ہوا۔

تقسیم ہند سے قبل، دیوبند فکر کے حامل مدرسوں کے علاوہ، بریلوی اور الحمدیث مسلک کے اہم ترین مدارس بھی علاقوں میں موجود تھے جو تقسیم کے بعد بھارت کا حصہ بنے۔ اس دور میں موجودہ پاکستان کے علاقوں میں اس پائے کا کوئی بھی قابل ذکر مدرسہ نہیں تھا۔ اسی لیے لوگ دور دراز سے انھی مراکز میں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیم ہند سے قبل کے اکثر علماء کا تعلق، خواہ کسی بھی مسلک سے ہو وہ انھی مراکز کے تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور یوں دینی تعلیم کا کام بھی متاثر ہوا۔

پاکستان میں دینی تعلیم کت لیے از سر نو دینی مراکز قائم کرنے کا کام شروع ہوا اب پاکستان بھر میں دینی مدارس کی ایک بڑی تعداد موجود ہیں۔ تقسیم کے نتیجے میں پاکستان کے لوگ صدیوں سے قائم ان مدارس کا فیض اٹھانے سے محروم رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے مدارس میں بھی وہی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو بھارت کے مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ دونوں جگہ کے اکابرین ایک ہی ہیں۔ وہ سب قابل احترام ہیں، مدرسہ بھارت میں ہو یا پاکستان میں، مسلک، فکر اور سوچ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق تو صرف سیاسی سوچ میں جس کی بنیاد جغرافیائی تقسیم تھی۔ تقسیم کا ایک نتیجہ تو یہ بھی ہوا کہ پاکستان میں بسنے والے لوگ ان تعلیمی مراکز سے فیض اٹھانے سے محروم ہو گئے۔

سہارنپور کے پاس ہی نو گزہ پیر کے نام کی اک درگاہ بھی ہے۔ جس سے متعلق کئی عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پیر صاحب کا قد نو گز تھا اسی لیے یہ قبر بھی نو گز لمبی ہے۔ پیر صاحب کا اصل نام سید ابراہیم بادشاہ تھا جو عرب سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ اس مزار کے ساتھ ہی ایک مندر بھی ہے۔ لوگوں کی کثیر تعداد زیارت کیلئے یہاں پر آتی ہے۔

اس شہر میں فرحت بخش نامی ایک قدیم باغ بھی موجود ہے جو اٹھارویں صدی میں بنایا گیا۔ ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا بوٹنی کل گارڈن تھا۔ 1817ء میں اس باغ کو انگریزوں نے ایک مقامی مسلمان سردار انتظام اللہ سے حاصل کیا تھا اور اسے مزید فروغ دیا۔ اب اس باغ کا نام کمپنی گارڈن ہے۔ ایک انگریز نے اس باغ سے متعلق یہ کہا تھا کہ چین سے چائے کے پودے لا کر اس باغ میں کاشت کیے گئے تھے۔ اسی وجہ سے چائے کے کاروبار کا ایک بڑا حصہ سہارنپور کے لوگوں کے پاس تھا۔ آج بھی یہ باغ بھارت اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

یوں تو ہمالیہ سہارنپور سے سینکڑوں کلو میٹر دور ہے لیکن صاف موسم میں اس شہر سے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ شہر ایک مشہور سیاحتی مقام ہے۔ اس کی ایک وجہ شہرت لکڑی پر نقش و نگار کر کے بہترین فرنیچر بنانے کی صنعت بھی ہے۔ پاکستان میں سہارنی آم بھی اسی علاقے کی وجہ سے سہارنی کہلاتے ہیں۔

ہم سہارنپور میں واقع اس عظیم درگاہ کو تو نہ دیکھ سکے لیکن اس کی خوشبو سے ہمیں محسوس ہوا جیسے انھی بزرگوں کی محنت کی وجہ سے ہی آج بھی اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی چالیس فیصد سے زائد ہے جبکہ وہ جہاں اس طرح کے دینی مراکز موجود نہیں تھے، مسلمان ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سہارنپور میں مسلمانوں کو اس قدر خوف و ہراس کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ ہجرت پر مجبور ہوئے، اس لیے ان کی یہاں ایک اچھی تعداد موجود رہی۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بھارت کی طرف سے مسلمانوں کی ہجرت اور پاکستان سے ہندوؤں اور سکھوں کی نقل مکانی کا اصل سبب وہ خوف و ہراس تھا جو ہر طرف پھیل چکا تھا، وہ قتل و غارت تھی جو ہر طرف ہو رہی تھی، بد معاش، چوروں، ڈاکوؤں کا راج تھا، سب سے بڑھ کر مسلمان، ہندو، سکھ اور انگریزوں لیڈروں

اور حکمرانوں، کی طرف سے خاموشی اس سارے سانحہ کو بھڑکانے میں شامل تھی۔ حکومت نام کی کئی چیز نہیں تھی، ہر طرف اندھیرا تھا، روشنی صرف یہی تھی کہ ہندو اور سکھ بھارت میں محفوظ ہیں اور مسلمان پاکستان میں، یہی وہ سوچ تھی جسے جان بوجھ کر پیدا کی گیا اور عام لوگ اسی سوچ کو لے کر چل رہے تھے۔

سازشی کامیاب ٹھہرے، بیس لاکھ بے گناہ مارے گئے، ڈیڑھ کروڑ لوگ گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے، صدیوں کا رہن سہن، تہذیب و تمدن تباہ ہوا، دو ملک غربت اور جہالت کو ختم کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے میزائل اور ایٹم بم کی دوڑ میں لگ گئے، نتیجہ یہ ہے کہ پونے دو ارب کی آبادی، ان کی، جو اس سازش میں پیش پیش تھے، ہمیشہ کے لیے محتاج ہو گئی۔

کون جیتا، کون ہارا، یہ سب جانتے ہیں!

اور ایک ہم ہیں کہ ابھی تک یہ مجھنے سے قاصر ہیں، کہ ہمسایہ نہیں بدلا جاسکتا، اسے برداشت ہی کرنا پڑتا ہے، چاہے خوشی سے چاہے مجبوری سے!

ہمارے راستے میں ایک تاریخی شہر، کوروشیترا آ رہا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں مہابھارت کی جنگ ہوئی اور یہاں سے ہی ہندو مذہب کا آغاز بھی ہوا۔ مجھے اس شہر کو دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔

**کوروشیترا: جہاں مہابھارت کی جنگ ہوئی اور یہاں سے ہی ہندو مت نے جنم لیا**

تاریخ کی کتابوں کے مطابق کوروشیترا وہ علاقہ ہے جہاں کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان ایک بڑی جنگ ہوئی تھی۔ اس شہر کا نام بھی کوروؤں کے بادشاہ کورو کے نام پر رکھا گیا۔ اس بات کے ثبوت کے طور پر بے شمار دلائل بھی دیے جاتے ہیں اور

اکثر تاریخ دان اس بات سے متفق بھی ہیں لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کسی شہر کا نام نہیں تھا بلکہ اس پورے علاقے کو کوروشیتر کہتے تھے۔ یہ علاقہ مشرق کی طرف سہارنپور اور جمناندی تک، مغرب کی طرف سرہند، جنوب کی سمت دہلی اور میوات جبکہ شمال کی طرف ہمالیہ کے پہاڑوں تک پھیلا ہوا تھا۔



Jyotisa, The Birth Place of Gita Photo Credit:  
<https://kurukshetra.gov.in>

کوروشیتر، ہندوؤں کے نزدیک ایک انتہائی مقدس مقام مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کوروبادشاہ نے آٹھ بہترین انسانی خوبیوں کو پروان چڑھانے کے لیے دریائے سرسوتی کے کنارے ایک قطعہ زمین کا انتخاب کیا۔ ان آٹھ خوبیوں کے نام کچھ یوں ہیں: سادگی (تپاس) (سچائی) (ستیتہ) (معافی) (کشمہ) (مہربانی) (دیا) (پاکیزگی) (شودھ) (صدقہ) (دان) (عقیدت) (بیجنا) (اور طرز عمل) (برہماچاریہ)۔ ہندو مذہب کی بنیاد بھی انھی آٹھ خوبیوں پر رکھی گئی ہے۔ اس پر کوئی عمل کتنا کرتا ہے وہ اس کا ذاتی معاملہ۔ اس جگہ کے متعلق ہندوؤں کا یہ ماننا ہے کہ جو بھی اس سرزمین پر مرے گا وہ جنت

میں جائے گا (ہندوؤں میں بھی کامیابی کے انعام کے طور پر اگلی زندگی میں ملنے والے مقام کو جنت ہی کہتے ہیں)۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک چینی سیاح سوآنزنگ نے بھی اس علاقے کا دورہ کیا تھا۔ یہ علاقہ چوتھی صدی قبل مسیح میں مور یہ سلطنت کا حصہ بھی تھا۔ اس کے نتیجے میں یہاں بدھ مت کو عروج ملا۔ یہ ایک طویل تاریخ ہے کہ کس طرح مور یہ خاندان، گپتا خاندان اور ایشیو بھوتی خاندان کے علاوہ بھی کئی لوگوں نے اس علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے کتنی جنگیں کیں۔ تاریخ کے مطابق محمود غزنی نے 1014ء میں اس علاقے پر حملہ کر کے یہاں موجود ہندو ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ غوری کے بعد ایک کے دور میں یہ علاقہ دہلی سلطنت کا ایک اہم حصہ بن گیا۔



Ruth Statue in Kurushetra

Photo Credit: Divine India

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب تیمور نے اس شہر پر حملہ کیا اور حسب معمول لوٹنے کے بعد اسے تہہ و بالا کر دیا۔ تیمور صاحب جہاں بھی گئے انھوں نے ایسا ہی کیا لیکن



اس کے جانے کے بعد اس کے تباہ کیے ہوئے علاقے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ ایسا ہی کوروشیتر کے ساتھ بھی ہوا۔ سلاطین دلی کی کمزوری کے باعث ایک سید خاندان نے بھی اس علاقے پر حکومت کی۔ لودھی بھی اس علاقے کا حاکم رہا۔ 1526ء میں بابر کی فتح کے بعد کوروشیتر مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔ اکبر کے دور میں اسے بے حد عروج حاصل ہوا۔ اس وقت کوروشیتر صرف ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں سمیت سب کے لیے ایک روحانی مرکز بن گیا تھا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب یہ علاقہ مراٹھوں کی سلطنت کا حصہ بنا۔ اس علاقے کے آخری حکمران انگریز تھے۔ تقسیم ہند کے بعد اس علاقے نے بھی آزادی حاصل کی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقامی ہندو راجہ کی ریاست کے خاتمے کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک یہاں پر مسلمان، مراٹھے، اور انگریز حاکم رہے۔

یہ شہر ہندوؤں کے نزدیک نہایت ہی مقدس مقام مانا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال حال ہی میں حکومت کا یہ اعلان ہے کہ اس شہر کی میونسپل کارپوریشن کی حدود میں گوشت کی خرید و فروخت پر مکمل پابندی ہے۔



Braham Sarovar Photo Credit: <https://kurukshetra.gov.in>

کوروشیتر میں ہندوؤں کے کئی مقدس مقامات ہیں۔ جن میں سے سب سے اہم، برہما سرور (تالاب) ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایشیاء کا سب سے بڑا تالاب ہے۔ ہر سال لاکھوں ہندو اس تالاب میں مقدس غسل لینے آتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس تالاب میں نہانے سے ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور تالاب بھی موجود ہے جسے سنیہت سرور کہتے ہیں۔ یہاں پر جیوتی سر کا ایک مشہور مقام بھی موجود ہے جس کے بارے میں ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس جگہ پر گیتا کو رجن کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس شہر کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہاں 85 فیصد سے زائد ہندو بستے ہیں۔ حالانکہ یہ علاقہ پنجاب سے منسلک ہے جہاں سکھوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ اس شہر میں مسلمان آبادی کا صرف دو فیصد ہیں، جو کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

2019ء میں کوروشیتر کے نام سے ایک فلم بھی بنائی گئی۔ اس فلم کو بے کے بھاروی نے لکھا اور ناگنا نے اسکی ہدایت کاری کی۔ یہ فلم مہاکاوی پر مبنی ہے۔ اس فلم میں مہابھارت میں بیان کی جانے والی جنگ کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اسے کئی زبانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ مذہبی کہانی ہونے کی وجہ سے اس فلم کو کافی شہرت ملی۔

## تھانیسیر: ایک تاریخی قصبہ

ہم کوروشیتر سے گزر رہے تھے تو نقشہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے بائیں طرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھانیسیر نامی ایک تاریخی قصبہ موجود ہے۔ تھانیسیر کا نام سن کر مجھے ایک عظیم عالم کی یاد آئی جنہیں جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی، ان کا نام مولانا محمد جعفر تھانیسیری تھا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ میں اس قصبے کے پاس سے گزر رہا تھا۔ مجھے اس کی تاریخ کو مزید جاننے کا شوق پیدا ہوا میں نے

جو کچھ اس قصبہ اور مولانا محمد جعفر تھانیسری کے بارے میں جانا، اس کا ایک مختصر احوال پیش خدمت ہے۔

تھانیسر، ہریانہ میں دریائے سرسوتی کے کنارے واقع ہندوؤں کا ایک مقدس قصبہ ہے۔ یہ شہر دہلی سے 160 کلومیٹر شمال مغرب میں واقع کورو شیترا ضلع میں واقع ہے۔ اب ایک طرح سے یہ کورو شیترا شہر کا ہی حصہ بن گیا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک ہندو راجہ پر بھاکروردھن ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں تھانیسر کا حکمران تھا۔ شیخ چلی کا مقبرہ بھی اسی علاقے میں ہے۔ تھانیسر کا موجودہ قصبہ ایک قدیم ٹیلے پر واقع ہے۔ اس ٹیلے کے پاس ساتویں صدی عیسوی میں بنائی گئی کچھ عمارتوں کے کھنڈرات بھی ملتے ہیں۔ ٹیلے سے ملنے والے آثار قدیمہ کو دیکھ کر ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ علاقہ گپتا دور میں بھی آباد تھا۔ مسلمانوں کی آمد تک اس علاقے پر کئی ہندو راجاؤں نے حکومت کی اور محمود غزنوی نے 1011ء میں اس ہندو ریاست کا خاتمہ کر دیا۔

اس علاقے کی ایک اہم جنگ 1567ء میں مغل بادشاہ اکبر اور راجپوتوں کے درمیان دریائے سرسوتی کے کنارے تھانیسر کے قریب لڑی گئی۔ یہ اس وقت کی ایک بڑی جنگ مانی جاتی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد تھانیسر مراٹھوں کے قبضے میں آگیا۔

مراٹھوں کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور اسے برٹش انڈیا کا حصہ بنالیا۔ تقسیم ہند سے قبل تھانیسر ایک معمولی سا گاؤں تھا۔ تقسیم ہند کے بعد یہاں ایک بہت بڑا مہاجر کیمپ لگایا گیا جہاں پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو رکھا گیا۔ اس طرح یہ گاؤں ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ اس شہر میں مغل دور کی عمارتوں کے نشانات بھی پائے جاتے ہیں۔

اس شہر سے متعلق دو اہم تاریخی واقعات بھی بے حد مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس علاقے میں سکھوں کے چار گوردوارہ کرچکے ہیں جن کی یاد میں یہاں چار گوردوارے بھی بنائے گئے ہیں۔ دوسرا اس علاقے کے لوگوں کا تحریک آزادی ہند میں حصہ لینا ہے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد بغاوت کے جرم میں انگریزوں نے یہاں کے کئی سوافراد کو سرعام پھانسی دی۔ اس کے علاوہ بہت سوں کو ملک بدر بھی کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ علاقے کے چودھریوں کی جائیدادیں بھی ضبط کی گئیں۔ جن لوگوں کو کالے پانی کی سزا دی گئی ان میں مولانا محمد جعفر تھانیسری بھی شامل تھے۔ اس شہر میں ہندوؤں کی آبادی نوے فیصد سے بھی زیادہ ہے جبکہ سکھ آبادی کاچھ فیصد اور مسلمان صرف ایک فیصد ہیں۔

## مولانا محمد جعفر تھانیسری: ایک عظیم عالم، جنگ آزادی کا مجاہد، کالے پانی کا قیدی

1838ء میں مولانا محمد جعفر، تھانیسری میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں آپ کے والد محترم وفات پا گئے۔ چند سالوں کی تعلیم کے بعد آپ نے عرائض نویسی شروع کر دی اور اس میں بے حد مہارت حاصل کی۔ آپ نے تحریک آزادی ہند میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انبالہ سازش کیس میں آپ پر مقدمہ چلا۔

1864ء میں جب آپ کی عمر صرف 26 سال تھی تو انگریزوں نے آپ کو سزائے موت سنائی۔ آپ نے جج سے کہا کہ موت اور زندگی کا فیصلہ تو اللہ کے اختیار میں ہے کون جانتا ہے کہ موت کسے پہلے آئے گی؟ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جج کی موت واقع ہو گئی۔ ایک اور عدالت نے مولانا کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی اور آپ کو کالا پانی بھیج دیا گیا جہاں آپ نے زندگی کے اٹھارہ سال قید کی حالت میں گزارے۔ آپ نے قید کے دوران گزارے دن رات پر مبنی اپنی آپ بیتی بھی لکھی۔ جو اردو زبان میں

ایک پہلی اہم آپ بیتی ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کی خاطر کن کن لوگوں نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں۔ آپ نے کئی کتابیں بھی تحریر کیں جن میں سب سے مشہور آپ کی آپ بیتی " کالا پانی تواریخ عجیب " ہے۔

یہ تھے وہ لوگ جو اس قصبے سے تعلق رکھتے تھے جہاں سے ہم آج گزر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

مولانا نے جس کالے پانی میں قید کاٹی اس کا مختصر تعارف یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

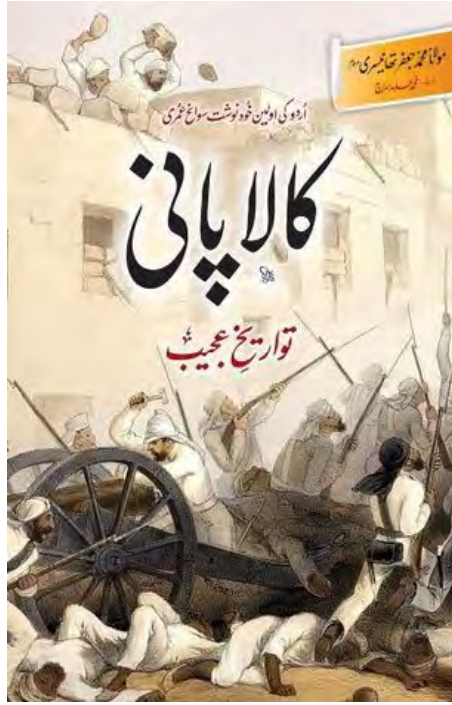
## جزائر انڈمان عرف کالا پانی

تاریخی کتب میں یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ انگریزوں کے دور میں جب بھی کسی مجاہد آزادی یا کسی اور جرم میں ملوث شخص کو عمر قید کی سزا دی جاتی تو اسے کالا پانی بھیج دیا جاتا۔ ان جزائر کا نام نکو بار اور انڈمان تھا لیکن عرف عام میں اسے کالا پانی کے نام سے ہی جانا جاتا تھا۔ یہ جزائر خلیج بنگال میں چنائی سے 1350 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔ برما سے بھی ان کا فاصلہ کافی زیادہ ہے۔ یہاں پر ایک جیل بنائی گئی تھی اور ان جیلوں میں ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک سے بھی عمر قید پانے والے لوگوں کو لا کر رکھا جاتا تھا۔

جب میں مولانا جعفر تھانویسری کے بارے میں پڑھ رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ انھیں بھی اسی کالا پانی میں لا کر ایک جیل میں رکھا گیا تھا۔ انگریزوں نے 1782ء میں اس جزیرے پر قبضہ کر کے یہاں پر کچھ تعمیرات بھی کیں۔ اس کے بعد 1857ء میں نے اسے انتظامی طور پر بھی استعمال کیا گیا اور بہت سارے دفاتر بھی بنائے گئے۔ اب اس جزیرے کا نام جنگ آزادی کے ایک مشہور نینتا جی سبھاش چندر بوس کے نام پر رکھا گیا یہاں پر ایک پھانسی گھاٹ بھی موجود ہے۔

ایک مرتبہ وائس آف ہند لارڈ میوان جزیروں پر آیا۔ جب وہ جانے لگا تو ایک قیدی، جس کا نام شیر علی آفریدی تھا نے موقع پا کر خنجر کے وار کر کے اسے قتل کر دیا۔ شیر علی، جو انگریزوں کی پولیس میں ملازمت کرتا تھا کا تعلق خیر ایجنسی کے علاقے تیرہ سے تھا اور وہ پشاور کے انگریز کمشنر کے ساتھ بھی کام کرتا رہا تھا۔ شیر علی کی بہادری اور جانثاری کی وجہ سے اسے بہت سے انعامات سے بھی نوازا گیا۔ اس نے خاندانی دشمنی کی بناء اپنے ایک رشتہ دار کو قتل کر دیا تھا جس پر اسے موت کی سزائے گئی جو بعد میں عمر قید میں بدل دی گئی اور اسے کالا پانی بھیج دیا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس جزیرے پر صرف سیاسی قیدی ہی نہیں بلکہ عام مجرم بھی رکھے جاتے تھے۔

میں نے حال ہی میں کچھ ویڈیوز دیکھی ہیں جن میں اس جگہ کا تفصیلی تعارف کروایا گیا ہے اور وہاں موجود ایک عجائب گھر بھی دکھایا گیا ہے جس میں ان تمام لوگوں کی تصاویر لگی ہوئی ہیں جنہیں جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں سزائے موت پر اس جگہ پر بھیجا گیا تھا۔ ان لوگوں میں جعفر تھانسیری صاحب کے علاوہ بھی کئی دیگر نامی گرامی علماء بھی شامل ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ آزادی میں علماء ہند نے بہت اہم کردار ادا کیا۔



Book title Maulana Jaffar Thanestry Photo Credit:  
<https://www.goodreads.com>

## شیخ صوفی عبدالرزاق عرف شیخ چلی

بچپن سے ہی ہم شیخ چلی کے بارے میں سنتے آئے ہیں۔ خاص طور پر بچوں کے لیے شیخ چلی کی کہانیاں بہت ہی مشہور ہیں۔ وہ ہوائی قلعے بنانے، خیالی پلاؤ پکانے اور اپنی بے وقوفانہ حرکتوں کی وجہ سے بچوں میں بہت مشہور تھا۔ میں بھی بچپن میں اس کی کہانیاں سنا کرتا تھا۔ شاید ہی کوئی بچہ ایسا ہو جس نے اس کی کہانی نہ سن رکھی ہوں۔ بچے اس کی باتوں سے بے حد محظوظ ہوتے تھے۔

ابھی ہم کوروشیتر میں ہی تھے کہ مجھے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ تھانیسر میں جو کوروشیتر کے قریب ہی واقع ایک قصبہ ہے میں شیخ چلی کا مقبرہ بھی ہے وہ اپنے وقت کے ایک بڑے عالم تھے۔ یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ ہم جسے شیخ چلی سمجھتے تھے اس کا تعلق تو کہیں وسط ایشیاء سے محسوس ہوتا تھا کیونکہ اس کا لباس اور باتیں ہی کچھ ایسی تھیں اور مجھے یہ بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ کوئی بزرگ تھے لیکن جب میں نے مزید تفصیل جانی تو پتہ چلا کہ شیخ چلی تو ایک بہت بڑے بزرگ تھے اور وہ شہنشاہ، شاہ جہاں کے بڑے بیٹے مغل شہزادے دارا شکوہ کے استاد بھی مانے جانے تھے۔ کہتے ہیں کہ دارا شکوہ کے روحانی استاد تو میاں میر صاحب (جن کا مزار لاہور میں ہے) تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ شیخ چلی کے بھی چاہنے والے تھے۔

شیخ چلی کا اصل نام صوفی عبدالرحیم عبدالکریم عبدالرزاق تھا لیکن وہ شیخ چلی کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کا تعلق قادریہ سلسلے سے تھا۔ ان کی پہچان ان کا علم اور فراخ دلی تھی اس سب معلومات کے بعد میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان کے نام پر ایک مزاحیہ کردار کیسے بنا؟ باوجود کوشش کے مجھے یہ علم نہ ہو سکا۔

اس موقع پر مجھے یاد آیا کہ ہمارے سکول میں میرے اردو کے استاد محترم غلام رسول صاحب نے بتایا تھا کہ کچھ لوگوں نے اردو میں استعمال ہونے والی کئی اصطلاحوں کو بہت غلط طریقے سے بھی پیش کیا ہے۔ اس سے متعلق مولانا عبدالمجید دریابادی، جو کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم اور مذہبی شخص تھے نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ میں وہ کتاب مکمل پڑھ تو نہ سکا لیکن اس کتاب کی ایک دو باتیں مجھے اب بھی یاد ہیں۔ میرے استاد محترم جناب غلام رسول صاحب نے بتایا تھا کہ اردو میں وغیرہ وغیرہ لکھنے کے لیے زید و بکر کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح، لکھے موسیٰ پڑھے خدا کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک خدا کے پچھواڑے کی اصطلاح بھی ہے۔ میرا خیال ہے



کہ شیخ چلی ان کا لقب ہو گا لیکن اسے ایک مزاحیہ کردار کا نام دینا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو سکتا ہے۔

صوفی عبدالرحیم عبدالکریم عبدالرزاق کا مقبرہ فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ یہ مزار ایک بڑے احاطے پر مشتمل ہے۔ احاطے میں ایک اور مقبرہ بھی ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شیخ چلی کی اہلیہ کا ہے۔ اس مزار کے ساتھ ہی ایک مدرسہ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک ایسی مسجد بھی ہے جسے پتھروں والی مسجد کہا جاتا ہے جو سرخ رنگ کے پتھروں سے بنائی گئی ہے۔ اس مزار کی ایک اور خاص بات یہاں پر مغل باغات کا ہونا ہے۔ میں نے حال ہی میں اس کی کئی وڈیوز بھی دیکھی ہیں جس سے اس کی خوبصورتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت یہ مزار حکومت ہند کے زیر نگرانی ہے اور اسے آثار قدیمہ کی فہرست میں رکھا گیا ہے۔



Tomb of Sheikh Chilli

Photo Credit: Vineet Bhanwala/Sahapedia.org

**شاہ آباد: ایک شہر جس میں ایک مسجد کو گردوارے میں تبدیل کیا گیا**

ہم ابھی کوروشیترا کی باتیں کر رہے تھے کہ ہمیں ایک چھوٹے سے شہر سے گزرنا پڑا جس کا نام شاہ آباد تھا۔ شاہ آباد ریاست ہریانہ کے ضلع کوروشیترا میں واقع ہے۔ یہ دریائے مارکنڈاکے بائیں کنارے پر واقع ہے جو انبالہ چھاؤنی سے بیس کلومیٹر جنوب میں جبکہ کوروشیترا سے بائیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کو شہاب الدین غوری نے آباد کیا اور اسی کے نام پر اس کا نام شاہ آباد رکھا گیا تھا کیونکہ اس سے قبل اس شہر کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس شہر کی کوئی قدیم تاریخ نہیں ہے لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ شہر تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

پہلی یہ کہ غوری نے چوہان کے ساتھ دوسری جنگ اسی مقام پر کی تھی۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کی خوشی میں اس نے اس شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام بھی اپنے نام پر رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے ایک جرنیل قطب الدین ایبک کو اس علاقے میں ایک وسیع جاگیر بھی عطا کی۔ پھر ایک وقت آیا جب بابر نے لودھی کے ساتھ جنگ کی۔ اس جنگ میں شاہ آباد کے لوگوں نے ابراہیم لودھی کی حمایت کی اور بابر کے خلاف جنگ میں حصہ بھی لیا۔ بابر نے یہ جنگ جیتنے کے بعد اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ یہاں کے لوگوں کا جرم صرف یہ تھا کہ انھوں نے بابر کے مقابلے میں ابراہیم لودھی کی حمایت کی تھی۔ لودھی بھی ایک غیر ملکی مسلمان تھا جس نے یہاں پر آپریشن کی حکومت قائم کی جبکہ دوسرا مسلمان وسط ایشیاء سے آکر خود ہندوستان کا حکمران بننا چاہتا تھا۔ دونوں ہی مسلمان تھے اور دونوں ہی ہندوستان کے باہر سے آئے تھے۔ اس جنگ میں مقامی لوگوں نے ابراہیم لودھی کی حمایت کی جس کی انھیں بہت سخت سزا ملی۔ اس شہر کی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے مغل شہنشاہ بابر اور ہمایوں بھی کچھ عرصہ یہاں رہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس شہر میں مغلوں کے دور میں بھی مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں پر مغلوں کے دور کا ایک قلعہ بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعے پر بندہ سنگھ بہادر نے حملے کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ اس علاقے میں ایک تاریخی گوردوارے کے ساتھ ساتھ کئی اہم مندر بھی پائے جاتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تو جو بچ گئے وہ جان بچا کر پاکستان چلے گئے

اور اس شہر میں پاکستان سے نقل مکانی کر کے آنے والے پنجابی، سکھوں اور ہندوؤں کو آباد کیا گیا۔ اب اس شہر میں مسلمان آبادی کا صرف دو فیصد ہیں۔

تاج محل کی وجہ شاہجہاں کی شہرت بہت زیادہ ہے، جس سے یوں لگتا ہے کہ شاہجہاں نے صرف تاج محل ہی بنایا تھا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس نے بے شمار دیگر عمارات بھی بنوائیں۔ اس نے آگرہ کا قلعہ بھی بنوایا اور لال قلعہ دلی کی بنیاد بھی رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ہندوستان کے طول و عرض میں بے شمار مساجد بھی بنوائیں۔ شاہ آباد، مغلیہ سلطنت کا ایک اہم شہر تھا۔ لاہور کے راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے ان کا یہاں آنا جانا بھی تھا۔ اسی وجہ سے سترہویں صدی میں شاہجہاں نے یہاں پر ایک بڑی مسجد بھی تعمیر کروائی۔

جب 1757ء میں مغلوں کی سلطنت ختم ہوئی تو اس علاقے پر مراٹھوں کا قبضہ ہو گیا لیکن ان کا بھی جلد ہی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد مقامی سکھوں نے سراٹھایا اور ایک بہت بڑے علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ گوکہ مرکزی طور پر ان کی کوئی بہت بڑی ریاست نہیں تھی لہذا وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئے اور اس کے ساتھ ساتھ کئی آزاد گروہ اپنے طور پر لوٹ مار بھی کر رہے تھے۔

1770ء اور 1780ء کے درمیانی عرصے میں شاہ آباد میں واقع ایک شاندار پرانی مسجد جسے 1630ء میں مغل بادشاہ شاہجہاں نے تعمیر کیا تھا کو ایک گوردوارے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کام کے لیے سکھوں نے مسجد کے میناروں کو ہموار کر دیا اور باقی سب کچھ ویسا ہی رہنے دیا۔ اس گوردوارے کا نام مست گڑھ رکھا گیا۔

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر اس گوردوارے کا نام مست گڑھ رکھا جاتا جو مسجد کی جگہ پر بنایا جاتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسا بہت سی مساجد کے

ساتھ کیا گیا۔ گوردوارہ مست گڑھ قصبہ کے شمال مشرقی حصے میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ اس کے مرکزی گنبد کے نیچے واقع مین ہال کو سکھ اب اپنی عبادت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق پاکستان بھر میں کوئی ایسا گوردوارہ نہیں ہے جسے مسجد میں تبدیل کیا گیا ہو۔ میں کسی بھی ایسے واقعہ سے بھی لاعلم ہوں جس میں کسی مسجد کو مندر یا چرچ میں تبدیل کیا گیا ہو۔ ایسا صرف سکھوں نے ہی کیا ہے۔ جو کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔



Gurdawra Masat Garh, once it was a mosque Photo  
Credit: <https://www.worldgurudwaras.co>

میں نے ابھی حال ہی میں اس کی کچھ تصاویر دیکھی ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مینار مسمار کر دینے کے باوجود شکل و صورت سے یہ عمارت ابھی بھی ایک مسجد کی مانند لگتی ہے۔

یہ مسجد پچھلے ڈھائی سو سال سے ایک گوردوارہ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد تقسیم ہند سے قبل بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کیونکہ اگر مسلمان زیادہ تعداد میں ہوتے تو شاید وہ سکھوں کو ایسا کرنے سے روک سکتے

تھے۔ اس شہر میں مسلمانوں کی حالیہ تعداد دو فیصد سے بھی کم ہے۔ باقی جو لوگ بھی تھے یا تو وہ شہید کر دیے گئے یا پاکستان ہجرت پر مجبور ہو گئے۔

اس کے خلاف آج تک کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی۔ ابھی بھی کسی طرف سے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ اسے دوبارہ مسجد میں تبدیل کیا جائے۔ یاد رہے کہ جس وقت شاہجہاں نے یہ مسجد بنوائی تھی اس وقت سکھوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شاہجہاں نے کسی گوردوارے کو گرا کر مسجد بنائی۔ میں نے مزید تفصیلات جاننے کی کوشش کی تو علم ہوا کہ سکھوں نے اپنی ویب سائٹ پر بھی اس گردوارے کا ایسے ہی ذکر کیا ہوا ہے۔

ایک اور تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ جہاں بھی انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی وہاں کسی مسجد کو بھی مندر، گرجا یا گردوارے میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ یہ سب صرف اسی وقت ہوا جب وہاں سکھوں کی حکومت تھی۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب لاہور میں واقع شاہی مسجد پر بھی سکھوں کا قبضہ تھا لیکن انگریزوں کے آجانے کے بعد کسی مسجد پر کوئی بھی سکھ قابض نہ ہو سکے۔

میں یہ سب جان کر اداس بھی ہو گیا اور مجھے بے حد افسوس بھی ہوا۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے مسلمانوں سے بدلہ نہ لیا ہو۔ جب بھی کسی کو موقع ملا اس نے اپنا پرانا حساب ضرور چکاتا کیا۔ ایسا ہی شاہ آباد میں بھی ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمان پھر کبھی بھی اپنی کھوئی ہی عزت بحال نہ کر سکے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں کئی علاقے مسلمانوں سے بالکل ہی خالی ہو گئے۔ جس کی وجہ سے وہاں پر مساجد بھی ویران ہو گئیں۔ انھی سوچوں میں گم ہم اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

## انبالہ: ایک راجپوت کا بسایا ہوا شہر اور انگریزوں کی ایک بڑی چھاؤنی

اب شام ہو رہی تھی اور ہم انبالہ بھی پہنچنے ہی والے تھے۔ میری بس اتنی سی خواہش تھی کہ ہم سورج کی روشنی میں اس شہر کو دیکھ سکیں جس کا ادب، علم اور فلم کی دنیا میں ایک نام ہے اور جس کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تحریک آزادی ہند کی ابتدا بھی اسی شہر میں واقع چھاؤنی سے ہوئی تھی۔ یہ وہی مرکز تھا جہاں سے انگریزوں نے پنجاب اور سرحدی علاقوں کو فتح کر کے ان پر حکومت کی۔

انبالہ کا نام سنتے ہی چند اور نام بھی ذہن میں آتے ہیں۔ جن میں وقار انبالوی اور نذیر انبالوی سرفہرست ہیں۔ وقار انبالوی ایک مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ اردو کا یہ مشہور شعر جو بالعموم علامہ اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے، انھی کا کہا ہوا ہے:

اسلام کے دامن میں بس اس کے سوا کیا ہے

ایک ضرب ید اللہ، اک سجدہ شبیری

ان کے علاوہ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی بھی کئی اہم شخصیات کا تعلق اسی شہر سے جن میں جوہی چاولہ، اوم پوری اور پاکستانی اداکارہ زیبا محمد علی قابل ذکر ہیں۔ حال ہی میں وفات پانے والی بھارت کی وزیر خارجہ سشما سوراج کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔ ناصر کاظمی، جو ایک معروف شاعر تھے کی پیدائش بھی اسی شہر میں ہوئی تھی۔ ساغر صدیقی بھی اس شہر میں پیدا ہوئے۔ جب کسی شاعر کا ذکر آتا تو شاہ صاحب اس پر تبصرہ کرتے۔ ہم ان لوگوں باتیں کرتے کرتے انبالہ پہنچ گئے۔ اس قدیم اور اہم شہر کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کا نام امبا نامی راجپوت کے نام پر رکھا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا قیاس ہے کہ اس کا نام دیوی بھونی امبا کے نام پر پکارا جانے لگا تھا۔ ایک اور بات بھی مشہور ہے کہ اس علاقے میں آموں کی پیداوار کی کثرت کی وجہ اس کا نام انبالہ پڑ گیا۔ درست کیا ہے، معلوم نہیں۔

پہلی صدی عیسوی میں یہاں پر بدھ مت کے ماننے والے ایک راجہ کی حکومت تھی اسے سورن بادشاہی بھی کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کا ایک نام ہند پار تھیان بھی تھا۔ اس خاندان کی حکومت تیسری صدی تک قائم رہی۔ اس خاندان کے بارے میں پڑھتے ہوئے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات کا پتہ چلا کہ یہ خاندان ہندوستان کے علاوہ مشرقی ایران کے کچھ حصوں، افغانستان کے مختلف علاقوں اور برصغیر پاک و ہند کے شمال مغربی علاقوں، زیادہ تر موجودہ پاکستان اور شمال مغربی ہندوستان کے کچھ حصوں سمیت ایک بڑے علاقے پر حکمرانی کرتا رہا ہے۔ اس سے اس بات کی نفی ہوتی ہے کہ اہل ہند نے ہندوستان سے باہر نکل کر کبھی کسی جگہ حکومت نہیں کی۔

بامیان افغانستان میں بھی بدھ مت کے آثار اسی دور کے ہیں۔ اس کے علاوہ پشاور میں تخت بائی کے علاقے میں موجود بدھ مت کی عمارات بھی اسی دور کی ہیں۔ تیسری صدی عیسوی میں اسلام کا آغاز نہیں ہوا تھا اور عیسائیت بھی اتنی طاقتور نہیں تھی تو اس وقت دنیا میں تین مذاہب ہی طاقتور تھے؛ ہندو مت، بدھ مت اور جین مت۔ ان تینوں مذاہب کا تعلق ہندوستان سے ہی تھا۔ اس کے علاوہ یہودی مذہب بھی موجود تھا۔ لیکن شاید وہ بھی کوئی زیادہ طاقتور نہیں تھا۔

اس علاقے میں آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے کچھ ایسی اشیاء بھی ملی ہیں جن کی بناء پر ماہرین کا خیال ہے کہ کسی دور میں یہ علاقے کوشان سلطنت میں بھی شامل رہے تھے۔ چینی سیاح وین سانگ بھی یہاں ہی آیا تھا۔ محمود غزنوی بھی اس علاقے پر حملہ آور

ہوا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ 1192ء میں غوری نے دوسری جنگ میں پر تھوی راج چوہان کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک یہ علاقہ مسلمان حکمرانوں کے ماتحت رہا۔

یہ علاقہ تیمور کے حملے کی زد میں بھی آیا اور اس نے بھی اسے جی بھر کے لوٹا۔ کسی دور میں بہلول لودھی بھی یہاں کا گورنر رہا ہے۔ مغلوں نے انبالہ کے علاوہ سرہند میں بھی اپنے محلات بنوائے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس علاقے پر سکھوں کی حکومت قائم ہوئی۔ پھر انگریزوں نے اس علاقے کی باگ ڈور سنبھال کر اسے برٹش انڈیا کا حصہ بنا لیا۔ انھوں نے سکھوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کس کو ساتھی بنایا اور کس کی ریاست پر زبردستی قبضہ کیا وہ ایک طویل داستان ہے جو دلچسپ بھی ہی اور افسوس ناک بھی۔ پنجاب انگریزوں کی راہ میں آخری رکاوٹ تھا۔ پنجاب پر قبضے کے بعد وہ مکمل طور ہندوستان کے مالک اور کروڑوں لوگ ان کے غلام بن گئے۔

انبالہ کے لوگوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت انبالہ ایک اہم فوجی مرکز تھا۔ یہاں کے ہندوستانی فوجیوں نے مئی 1857ء کو علم بغاوت بلند کیا۔ انھیں کامیابی تو نہ ملی لیکن وہ ایک کوشش ضرور تھی۔ ہار کی صورت میں سخت ترین سزائیں، جن میں موت کی سزا بھی شامل تھی بھگتنی پڑی۔ سزا صرف فوجیوں کو ہی نہیں دی گئی بلکہ عام لوگوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔

بغاوت کرنے والے بھی ہندوستانی تھے اور بغاوت کچلنے والی بھی ہندوستانی ہی تھے !

حکم صرف انگریز کا تھا !

کچھ اس کے تنخوادار اور کچھ اس کے سزاوار۔



ابھی حال ہی میں بھارتی حکومت نے اس چھاؤنی کے ایک مقام پر جنگ آزادی کے شہیدوں کے لیے یادگار بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس کے نام، آزادی کی پہلی لڑائی کی یادگار سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبالہ کے لوگوں نے جنگ آزادی ہند میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

یہ ان کی یادگار بن رہی ہے جو اپنی جان پر کھیل گئے تھے تاکہ اہل ہند کو آزادی مل سکے۔

انبالہ میں لکھی شاہ اور تقوال شاہ نام کی دو مساجد ہیں۔ یہاں ان بزرگوں کے مزار بھی ہیں۔ وہ بزرگ کون تھے میں کوشش کے باوجود میں کچھ بھی نہ جان سکا۔ اس وقت انبالہ میں یہ ایک ایسی مشہور جگہ کی حیثیت رکھتی ہے جہاں ہر روز ہزاروں عقیدت مند آتے ہیں۔ لالہ مرلی دھر بھی اسی شہر کے باسی ہیں، جو بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں سے ایک اور کانگریس کے اہم عہدہ دار تھے۔

## انبالہ چھاؤنی اور افریقہ کے قیدی

انبالہ چھاؤنی کا قیام 1843ء میں عمل میں آیا۔ اس سے قبل انگریزوں نے کرنال میں ایک فوجی مرکز بنایا تھا۔ کرنال میں ملیریا کی بیماری کی وجہ سے انبالہ میں نیا فوجی مرکز بنایا گیا۔ اس وقت یہ بھارتی فوج کا اہم مرکز ہے۔ میں نے جب انبالہ چھاؤنی سے متعلق مزید پڑھا تو ایک نہایت ہی افسوس ناک بات کا علم ہوا۔

انبالہ چھاؤنی میں گوروں کا ایک قبرستان ہے جہاں جنگ عظیم اول میں مارے جانے والے لوگوں کی قبریں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قبریں بھی ہیں۔ اس قبرستان میں دولاکھ سے زائد قبریں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے انگریزوں کے نزدیک یہ ایک اہم قبرستان ہے۔ اس کی دیکھ بھال بھی

مناسب طور پر کی جاتی ہے۔ (لاہور میں جم خانہ اور جیل روڈ کے درمیان بھی گورا قبرستان ہے۔ میں بھی ایک مرتبہ اسے دیکھنے گیا تھا۔)

میں نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا کہ انیسویں صدی کے آغاز میں جنوبی افریقہ میں انگریزوں نے مقامی لوگوں کے ساتھ جنگ کی اور فتح حاصل کی تھی۔ اس جنگ کو بونر کی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پچاس ہزار سے زائد افریقی لوگوں کو جنگی قیدی بنایا گیا۔ انگریزوں نے جنگی قیدیوں پر ہونے والے خراجات اور حفاظتی نقطے کے پیش نظر پچیس ہزار کے قریب جنگی قیدیوں کے اپنے دیگر مفتوحہ علاقوں میں بکھوادیے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد ہندوستان بھی لائی گئی، جنہیں یہاں مختلف شہروں میں رکھا گیا کچھ کو انبالہ بھی لایا گیا۔ ان پچیس ہزار قیدیوں میں سے شاید ہی کسی کو واپس اپنے ملک جانا نصیب ہوا ہو۔



The Largest British Cemetery in Inida at Ambala

Photo Credit: <https://navrangindia.blogspot.com>

انبالہ کے گوراقبرستان میں جنوبی افریقہ کے جنگلی قیدیوں کی قبریں بھی موجود ہیں۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انھوں نے غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف جنگ کی اور وہ یہ جنگ ہار گئے تھے۔ میں نے جب یہ سب پڑھا تو مجھے بے حد افسوس ہوا کہ کس طرح پچیس ہزار لوگوں کو ان کے دیس سے دور دیار غیر میں لا کر ان سے مشقت کروائی گئی اور ان پر اپنے گھر واپس جانے کے تمام راستے مسدود کر دیے۔۔۔

اور وہ دیار غیر میں اپنوں سے دور، بے یار و مددگار موت کی وادی میں چلے گئے۔۔۔

یہ تھا ان کمزور لوگوں سے انگریزوں کا سلوک۔۔۔

انبالہ میں مسلمان آبادی کا صرف ایک فیصد ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل انبالہ میں مسلمان کافی تعداد میں بستے تھے، تقسیم ہند کے موقع پر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے ہجرت کی۔ ان میں سے بہت سے لوگ سرگودھا میں آئے۔ انھوں نے سرگودھا میں انبالہ مسلم کالج بھی بنایا۔ اس کے علاوہ کئی لوگوں نے اپنے کاروبار کے نام بھی اپنے شہر کے نام پر رکھے۔ انبالہ ان بد قسمت شہروں میں سے ایک ہے جہاں تقسیم ہند کے وقت مسلمانوں کا لہو پانی کی طرح بہا یا گیا۔

یہ خون کس نے کیا۔۔۔ کون تھا اس کا ذمہ دار۔۔۔ سب خاموش ہیں۔۔۔ لیکن کب تک۔۔۔ تاریخ ایک دن خود ہی بولے گی۔۔۔ انشاء اللہ

انھی سوچوں میں گم سفر جاری تھا اور شہر کو دکھ بھری نظروں سے دیکھتا رہا، جو کبھی مسلم تہذیب کا گڑھ تھا، اب وہاں ایک فیصد بھی مسلمان نہیں بستے، جہاں بے شمار مساجد ویران ہو گئیں، کوئی تو تھا جس کی وجہ سے اللہ کے گھر جو صدیوں سے آباد تھے،

ویران ہوئے، کس نے کیا کیا، اب یہ سب تاریخ کا حصہ ہے جو آہستہ آہستہ سامنے آ رہا ہے۔

اب شام ہو چکی تھی۔ ہماری منزل (چندی گڑھ) ابھی پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ تھکاوٹ، بھوک اور گرمی نے مل کر سفر کو مشکل بنا دیا تھا۔ یاد رہے اب تک ہم جی ٹی روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ جی ٹی روڈ انبالہ اور سرہند سے ہوتی ہوئی لدھیانہ، امرتسر اور لاہور جاتی ہے۔ انبالہ سے سرہند (جسے اب فنج گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہے) پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے یہ سیدھی سڑک چندی گڑھ جاتی ہے اور اس کا فاصلہ بھی تقریباً پچاس کلومیٹر ہے۔ یہی سڑک آگے ہشیار پور اور بٹھان کوٹ سے ہوتی ہوئی کشمیر کی طرف جاتی ہے۔ بھارت کی طرف سے کشمیر جانے کا یہ واحد راستہ ہے۔

منزل سامنے ہو تو تھکاوٹ کا احساس کم ہو جاتا ہے۔۔۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔

## چندی گڑھ: بھارت کا ایک نیا اور امیر شہر

اب شام ہو چکی تھی اور ہماری منزل بھی قریب ہی تھی۔ چندی گڑھ (جس سے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا) وہ بھی سامنے نظر آ رہا تھا۔ چندی گڑھ آنے کے لیے میں نے یہاں کے ایک مقامی شخص سے رابطہ کیا جو کیمیکلز کا کام کرتا تھا۔ میں انہی کی دعوت پر ان سے ملنے اور کچھ کاروباری معاملات طے کرنے کے لیے چندی گڑھ جا رہا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری اس شہر کو دیکھنے کی ایک دیرینہ خواہش بھی پوری ہو رہی تھی۔ شاہ صاحب بھی بہت پر جوش تھے لیکن پر مندر سنگھ مانگٹ بوریٹ محسوس کر رہا تھا۔ ہم صبح سے سفر پر نکلے ہوئے تھے اور ہر تھوڑی دیر بعد رک جاتے تھے تاکہ علاقے کو غور سے دیکھ

سکیں۔ وہ تو اپنے والد صاحب کے حکم پر ہماری مدد اور راہ نمائی کے لیے ہمارے ساتھ تھا۔ اس سفر سے اُسے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ہم شام ڈھلے چندی گڑھ پہنچ گئے۔

ہمارا جس علاقے میں ہوٹل تھا ہم وہاں چلے گئے۔ وہ ایک مناسب درجے کا ہوٹل تھا لیکن اس کی خاص بات یہ تھی کہ وہ اس علاقے میں واقع تھا جہاں ایشیاء کا سب سے بڑا گلابوں کا باغ تھا۔ اس باغ کا نام بھارت کے ایک صدر ذاکر حسین کے نام پر رکھا گیا۔ چندی گڑھ میں کیا دیکھا، اسے کیسا پایا اور اپنے میزبان مدن لال (جو نفاست اور سلیقہ میں اپنی مثال آپ تھے) سے ملاقات، پہلی اور شاید آخری مرتبہ تندوری مچھلی کھانے کا ایک منفرد تجربہ، رات کے وقت ہر چوراہے میں کھڑے گبر و سکھ نوجوانوں کو ٹھیٹ پنجابی لب و لہجے اور اونچی آواز میں باتیں کرتا دیکھنا، ایک ایسے شہر کی یاترا جہاں کوئی ٹریفک سنگٹن نہیں تھا اور اس کے ساتھ ساتھ کئی اہم عمارات کی سیر کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل میں چاہوں گا کہ آپ کو چندی گڑھ کی تاریخ، کس نے اس شہر کا سوچا، کیسے اسے بنایا گیا اور اب اس کی حالت سے متعلق کچھ عرض کروں۔

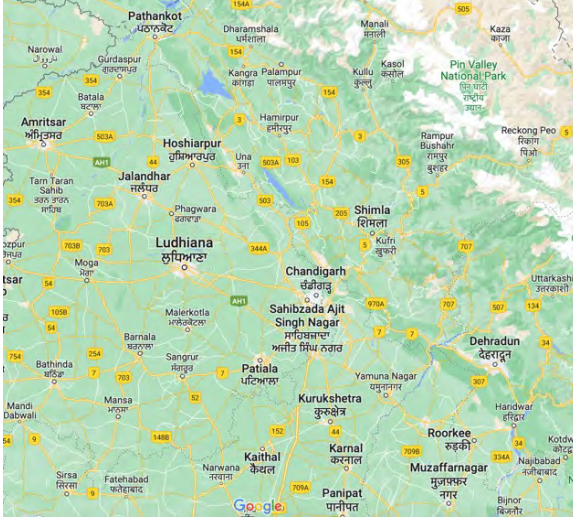
یاد رہے کہ میں نے چندی گڑھ کا دورہ 2000ء میں کیا تھا لیکن یہ تحریر میں 2021ء میں لکھ رہا ہوں۔ اس لیے میں نے یہ کوشش کی ہے کہ چندی گڑھ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی موجودہ حالت کے بارے میں بھی آپ کی معلومات میں اضافہ کیا جائے۔

چندی گڑھ کی سرحد شمال مغرب اور جنوب میں پنجاب اور مشرق میں ہریانہ کی ریاست سے ملتی ہے۔ یہ شہر ان دونوں ریاستوں کا حصہ نہیں ہے بلکہ بھارت کے وفاقی علاقوں کا حصہ ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ 260 کلومیٹر جبکہ امرتسر سے 229 کلومیٹر ہے۔ تقسیم ہند سے قبل اس علاقے میں کوئی خاص آبادی نہیں تھی۔ یہاں پر موجود چندی نامی ایک مندر کی وجہ سے اس شہر کا نام چندی گڑھ رکھا گیا۔

تقسیم ہند سے پہلے صوبہ پنجاب کا دار الحکومت لاہور تھا۔ اس لیے بھارت نے کو اپنے پنجاب کے لیے ایک شہر کی ضرورت محسوس ہوئی، جہاں وہ اس کا دار الحکومت بناسکے۔ پہلے سے موجود شہروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ کسی نئے علاقے میں نئے سرے سے ایک شہر بسایا جائے۔ اس کام کے لیے پوادی زبان بولنے والے لوگوں کے پچاس گاؤں کو شہر بنانے کے لیے حاصل کیا گیا۔ چندی گڑھ کی تعمیر 1960ء میں مکمل ہوئی اور اس وقت تک شملہ پنجاب کا عارضی دار الحکومت رہا۔ البتہ 1953ء میں تعمیر کا بہت سا کام باقی ہونے کے باوجود باقاعدہ طور پر چندی گڑھ کو دار الحکومت بنا دیا گیا۔ پھر جب 1966ء میں پنجاب کو تقسیم کر کے ایک نیا صوبہ ہریانہ بنایا گیا تو دونوں ریاستوں کا دار الحکومت چندی گڑھ ہی قرار پایا۔ اس طرح چندی گڑھ بھارت کا ایک ایسا شہر ہے جو دو ہمسایہ ریاستوں پنجاب اور ہریانہ کا صدر مقام ہے۔ چندی گڑھ کے قرب وجوار میں واقع کچھ پرانے گاؤں ابھی بھی موجود ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے پنجاب یونیورسٹی کئی دیہات کی زمینیں لے کر بنائی گئی۔ زمین تو لے لی گئی لیکن وہ حصہ جہاں لوگوں کے گھرتھے وہ ویسے ہی رہے اور اب تک ایسے ہی موجود ہیں۔

چندی گڑھ شمال مغربی ہندوستان میں ہمالیہ کے قریب واقع ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے 1053 فٹ بلند ہے جبکہ لاہور سطح سمندر سے تقریباً سات سو فٹ بلند ہے۔ چندی گڑھ کے ارد گرد کا بیشتر حصہ گھنے جنگلوں پر مشتمل ہیں۔ ان جنگلوں میں بے شمار اقسام کے پودے، پرندے اور جانور پائے جاتے ہیں۔ مجھے یہ ایک دلچسپ بات بھی جاننے کو ملی کہ سردیوں کے موسم میں چندی گڑھ میں واقع جھیل سائبیریا اور یورپ کے کچھ حصوں سے نقل مکانی کرنے والے پرندوں کی میزبانی بھی کرتی ہے۔ ایک اور بات بھی میرے لیے نئی تھی کہ چندی گڑھ میں سوسال پرانے درختوں کو قومی ورثہ قرار دے

کران کی بہترین حفاظت کی جاتی ہے۔ میں نے ایسا کسی دوسرے شہر کے بارے میں نہیں پڑھا۔ چندی گڑھ میں ایسے درختوں کی تعداد تیس سے بھی زائد ہے۔



Chandi Garh Map Photo Credit: Google map

چندی گڑھ میں واقع قابل دید مقامات کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ وسیع و عریض سکھنہ جھیل، راک گارڈن، جہاں ضائع شدہ اشیاء کو استعمال کر کے مختلف محسمے بنائے جاتے ہیں، ذاکر حسین روزگارڈن، جوائشیا کاسب سے بڑا گلاب کا باغ بھی ہے، گارڈن آف خوشبو، گارڈن آف پالمز، تتلی پارک، جانوروں کی وادی اور جاپانی گارڈن کے علاوہ ہر سیکٹر میں موجود بے شمار خوبصورت باغات نے اس شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا اس کے علاوہ میوزیم اور آرٹ گیلری نے بھی چندی گڑھ کی شان میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ چندی گڑھ میں ہندو آبادی کا اسی فیصد، سکھ تیرہ جبکہ مسلمان آبادی کا چار فیصد ہیں۔ کئی گوردواروں کے ساتھ چند پرانی مساجد بھی موجود ہیں۔

چندی گڑھ کو بھارت کے "دولت مند شہروں" میں شمار کیا جاتا ہے۔ آؤٹ سورسنگ اور آئی ٹی خدمات کے حوالے سے دنیا بھر کے پچاس شہروں میں چندی گڑھ چوتھے نمبر پر ہے۔ یہ شہر زیادہ تر تجارت، آئی ٹی اور مالیاتی معاملات کے اداروں کی وجہ سے بھی بھارت بھر میں جانا جاتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے 1952ء میں چندی گڑھ کے مجوزہ مقام کا دورہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

یہ شہر ہندوستان کی آزادی کی علامت ہو گا۔ یہ ایک ایسا شہر ہو گا جو ماضی کی روایات کا قیدی نہیں بلکہ مستقبل میں قوم کے اعتماد کا اظہار بنے گا۔

پنڈت جواہر لال نہرو صاحب کی اس بات کی تصدیق اس چیز سے ہوتی ہے کہ جتنا بھی میں نے اس شہر کو دیکھا اس میں شاید ہی کوئی عمارت مغل یا انگریزوں کے طرز تعمیر پر ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے پاکستان کے نئے شہر اسلام آباد کی عمارتوں میں ہمیں ہندوستانی انگریزی یا مغل طرز تعمیر کے ساتھ اسلامی طرز کی کوئی عمارت دکھائی نہیں دیتی۔ اکثر عمارتیں نئی طرز پر بنائی گئیں ہیں۔

جن کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا ان کے ساتھ پھر ایسا تو ہوتا ہی ہے،

جب وہ غروب ہو جائے پھر وہ چاہے مغلیہ سلطنت ہو یا سلطنت برطانیہ۔۔۔

پنڈت جواہر لال نہرو صاحب کی اس سوچ پر خاصی تنقید بھی ہوئی ہے۔ جس کے مطابق وہ بھارت کی روایتی سوچ سے الگ سوچ رکھتے تھے۔ چندی گڑھ پر تنقید کرنے والے کہتے ہیں کہ اس شہر کی تعمیر کرتے وقت بھارتی معاشرے کی ضروریات کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔ اسے جدید طرز پر بنا کر صدیوں سے قائم طرز تعمیر اور طرز معاشرت کو نظر انداز کیا گیا۔ یہی تنقید پاکستان میں اسلام آباد کے طرز تعمیر پر بھی کی جاتی ہے۔ ایسی



تفقد کا جواب یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ حالات اور تقاضے بدل گئے ہیں اس لیے طرزِ تعمیر بھی بدل گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس شہر کی پلاننگ کرتے وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ شہر میں ہر چوک اتنا بڑا اور اس قدر فلاحی اور بنائے جائیں گے کہ شہر میں کسی ٹریفک سگنل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس منصوبے میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ جب میں نے شہر کے مختلف حصوں میں گھوم کر دیکھا تو مجھے حقیقت بھی یہی لگی۔ چور راہے اس قدر کھلے ہیں کہ ٹریفک جام ہونے کا اندیشہ بہت کم ہوتا ہے۔ صفائی کے لحاظ سے بھارت میں یہ شہر پہلے بیس شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

## ذاکر حسین روزگار ڈن: گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا اور شاندار باغ

جب ہم ہوٹل پہنچے تو رات ہو چکی تھی اور تھکاوٹ بھی کافی تھی لہذا ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہوٹل کے ریسٹوران سے ہی کھانا کھایا جائے اور جلد آرام کیا جائے تاکہ اگلا دن ہم اچھے طریقے سے گزار سکیں۔ کھانے کے بعد جب سونے کی باری آئی تو مجھے اپنے ڈرائیور کا خیال آیا۔ عام طور پر میرا یہ طرزِ عمل ہوتا ہے کہ ڈرائیور کے لیے اپنے کمرے میں ہیں اگر بستر نہ ہو تو کوئی گداڑال لیتے ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا تھا کہ غالباً ہمارے ڈرائیور کا تعلق کسی نچلی ذات سے تھا جسے ہندو اور سکھ اپنے پاس نہیں بٹھاتے اور یہ لوگ خود بھی بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔

شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقام وہی ہے جو تقدیر کے قاضی نے ان کے لیے لکھ دیا ہے اور وہ اپنے جیسوں میں ہی بیٹھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہاں وہ سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔ کوئی کرسی پر اور کوئی زمین پر بیٹھا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے کے برابر ہی سمجھتے ہیں!

راستے میں بھی میں نے دیکھا کہ وہ کسی وقت بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر نہ کھانا کھاتا نا ہی چائے پیتا تھا میں اس کے پاس بھی بیٹھا لیکن اس نے ہمیشہ ہی دور بیٹھنا پسند کیا۔ ہم تین لوگ تھے اور ہم نے دو کمرے لے رکھے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی سو جائے گا لیکن نا جانے کیا بات ہوئی کہ اس نے کہا کہ میں آپ کے کمرے میں رات بسر نہیں کروں گا۔ آپ مجھے کمبل لے دیں میں گاڑی میں ہی رات گزار لوں گا۔ یہ سب مجھے اچھا تو نہ لگا لیکن ہمیں ایسا ہی کرنا پڑا۔۔۔

اس کے بغیر ہم چند ہی گڑھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔۔۔

سارا دن ہم اس کے ساتھ ایک ہی گاڑی میں سفر کرتے رہے۔۔۔

سونے کے وقت ہم اسے اپنے کمرے میں نہ سلا سکے۔۔۔

مجھے اب تک اس بات کا افسوس ہے!

ذاکر حسین روز گارڈن چندری گڑھ کے ماتھے کا جھومر ہے۔ یہ باغ تیس ایکڑ اراضی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس باغ میں دو ہزار اقسام کے قریبا پچاس ہزار گلاب کے پودے لگائے گئے ہیں۔ یہ باغ ہندوستان کے پہلے مسلمان صدر، جناب ذاکر حسین کے نام سے منسوب ہے۔ اس باغ کی بنیاد 1967ء میں اس وقت کے چیف کمشنر چندری گڑھ ڈاکٹر ایم ایس رندھاوا نے رکھی۔ اس باغ میں گلاب کے علاوہ بہت سے قیمتی اور نایاب پودے اور درخت بھی لگائے گئے ہیں۔ اس وجہ سے اس کی بوٹنی دنیا میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ باغ شہر کی بڑی تقریبات کے نہایت ہی موزوں ہے، جس طرح لاہور میں باغ جناح جس کا پرانا نام کمپنی باغ تھا۔

نئی چیز بنانے کی بجائے ہم لوگوں کی بنائی ہوئی چیزوں پر اپنا نام لکھ کر نہ جانے کیوں خوش ہوتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسا کرتے وقت قائدِ اعظم حیات ہوتے تو وہ کبھی اسے پسند نہ کرتے۔ وہ ایک اصول پسند اور انتہائی خوددار شخص تھے۔

اس کے علاوہ ذاکر روزگار ڈن میں فروری یا مارچ میں ایک میلہ بھی لگایا جاتا ہے جسے سالانہ گلاب فیسٹیول کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ذاکر حسین صاحب کون تھے، جن کے نام پر یہ باغ بنایا گیا؟ یہ جاننا آپ کے لیے انتہائی مفید ہو گا۔ وہ ایک ایسی ہستی ہیں جن کا امتِ مسلمہ پر ایک عظیم احسان ہے۔ ان کا مختصر احوالِ زندگی پیش خدمت ہے۔

### ذاکر حسین خان: بھارت کے تیسرے اور پہلے مسلمان صدر

ذاکر حسین خان صاحب کی پیدائش 1897ء میں ریاست حیدر آباد میں ہوئی۔ ان کا تعلق پشتونوں کے آفریدی قبیلے سے تھا۔ بعد ازاں ان کا خاندان فرخ آباد یوپی چلا گیا۔ تقسیم ہند کے موقع پر ان کے خاندان کے بیشتر لوگوں نے پاکستان ہجرت کی۔ آپ کے بھائی محمود حسین تقسیم سے کئی سال پہلے تحریک پاکستان میں شامل ہوئے اور انھیں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا ممبر بھی بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کے وزیر تعلیم اور امور کشمیر کے وزیر کی حیثیت سے بھی خدمات سر انجام دیتے رہے۔ ان کے ایک بھتیجے انور حسین پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کے ڈائریکٹر بھی رہے ہیں۔ ان کے ایک اور بھتیجے جنرل رحیم الدین خان، پاک فوج کی چیئر مین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی اور بلوچستان اور سندھ کے گورنر کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیتے رہے۔

ذاکر حسین خان صاحب اور ان کے خاندان کے کئی لوگوں نے بھارت میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا اور ان میں سے کئی افراد بھارت میں اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے جیسے کہ ان کے چھوٹے بھائی، یوسف حسین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ ان کا ایک بھتیجا مسعود حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وائس چانسلر تھا۔ ان کے ایک داماد

خورشید عالم خان کئی سال تک کرناٹک کے گورنر رہے کانگریس پارٹی کے سیاستدان مسلمان خورشید بھی من موہن سنگھ کے دور میں بھارت کے وزیر خارجہ بنے۔ ان سب سے آپ اس بات کا تصور کر سکتے ہیں کہ یہ خاندان کتنا بااثر تھا۔

ذاکر حسین خان صاحب نے 1926ء میں برلن یونیورسٹی سے معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ ملیہ کا قیام بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ 1920ء میں وہ جب صرف 23 سال کے تھے تو اس وقت انھوں نے اپنے ساتھی طلباء اور چند اساتذہ کے ساتھ مل کر علی گڑھ میں قومی مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں میں یہ ادارہ نئی دہلی منتقل ہو گیا۔ پھر 1935ء میں اسے جامعہ نگر منتقل کیا گیا اور اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔ اس یونیورسٹی کے قیام میں بہت سی مسلمان شخصیات کے ساتھ ساتھ مہاتما گاندھی کی کوشش بھی شامل ہے۔ یاد رہے اس یونیورسٹی کا سنگ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے رکھا۔ یہ یونیورسٹی اس وقت بھارت کی ایک اہم یونیورسٹی ہے۔ آج کے دن اس یونیورسٹی میں بیس ہزار کے قریب طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں جبکہ مرکزی یونیورسٹیوں کی فہرست میں یہ اول نمبر پر ہے۔

جب ذاکر صاحب جرمنی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے ہندوستان آئے تو آپ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سربراہ بنادیا گیا۔ انھوں نے اکیس سال تک اس عہدے پر کام کیا۔ ان کی علمی خدمات کی بدولت تعلیمی میدان میں انھیں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ جس کا اعتراف خود قائد اعظم محمد علی جناح صاحب نے بھی کیا۔

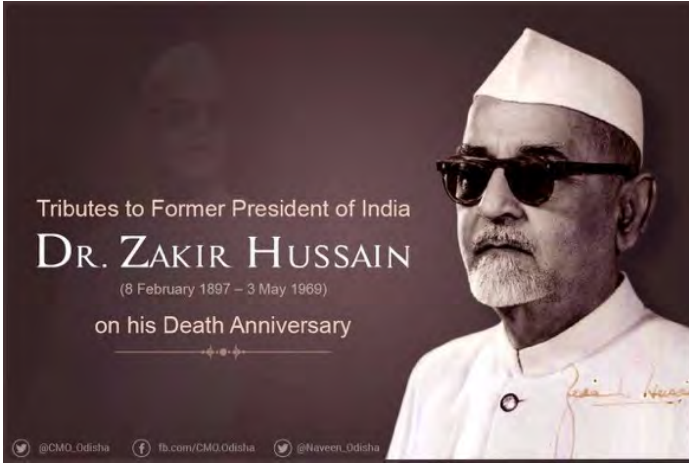
تقسیم ہند کے بعد ذاکر حسین خان صاحب کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنادیا گیا۔ وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنی مدت پوری کرنے کے بعد انھیں 1956ء میں بھارتی پارلیمنٹ کے ایوان بالا کا ممبر نامزد کیا گیا۔ بعد ازاں وہ عہدہ انھوں نے ریاست بہار کے گورنر بننے کے لیے خالی کر دیا تھا۔ وہ پانچ سال تک بہار کے گورنر کی

حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، پھر ایک دن آج 1962ء میں وہ بھارت کے نائب صدر بنے اور 1967ء میں انھیں بھارت کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس طرح وہ بھارت کے تیسرے اور پہلے مسلمان صدر بنے۔ ان کی وفات بھی صدارت کے دوران ہی ہوئی۔ انھیں ان کی اہلیہ کے ساتھ، جو کچھ سال بعد فوت ہو گئیں نئی دہلی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کیمپس میں سپرد خاک کیا گیا۔

بھارت بھر میں کئی اداروں کے نام ان کے نام پر رکھے گئے جن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا انجینئرنگ کالج بھی شامل ہے۔ ایشیاء کا سب سے بڑا گلاب کا باغ بھی انھی کے نام پر ہے، جس کی ہم سیر کر رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ ان کا تعلق اقلیت سے تھا، یہ سب ان کی خدمات کا بدلہ تھا۔ جس کے بارے میں مسلم لیگ کا خیال تھا کہ تقسیم ہند کے بعد جمہوریت کی وجہ سے مسلمانوں کو حکومتی معاملات میں مناسب مقام نہیں مل پائے گا، لیکن ذاکر حسین خان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

ایک سوال کا جواب میں ہمیشہ ڈھونڈتا رہا ہوں کہ کیا مسلم لیگ کے قائدین کا خدشہ درست تھا؟ یا پھر ہندو اور انگریز قیادت مسلمانوں کو تقسیم کر کے ان کی طاقت کمزور کرنا چاہتی تھی۔

کیا درست ہے کیا نہیں۔۔۔ سوال تو بہر حال کیا جاسکتا ہے۔۔۔



Dr. Zakr Hussain Photo Credit:  
Naveen\_Odisha , Twitter



Zakir Hussain Rose Garden Photo Credit:  
<https://www.shoutlo.com>

## مدن لال: ایک پڑھا لکھا ہندو جو مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا

میں نے چند ہی گڑھ پہنچنے سے پہلے ہی مدن لال صاحب سے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں صبح دس بجے کے قریب ان کے گھر چلا گیا۔ شاہ صاحب نے آرام کی غرض سے ہوٹل میں ہی رہنا پسند کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تقریباً دو تین گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا تو پھر ہم شہر کی سیر کے لیے چلیں گے۔

میں ان کے بتائے ہوئے پتہ پر مدن لال صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ محل وقوع سے لگتا تھا کہ وہ اپر مڈل کلاس کے لوگوں کا علاقہ تھا۔ مدن لال صاحب نے مجھے گھر بلایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اپنے دفتر بلوائیں گے، لیکن اس کی بجائے انھوں نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ جب کوئی آپ کو اپنے گھر بلائے تو اس کا واضح طور پر یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ شخص آپ کا بہت احترام کرتا ہے، آپ سے محبت کرتا ہے اور آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ کاروباری معاملات کے لیے دفتر بہترین جگہ ہوتی ہے۔

میں جب ان کے گھر پہنچا تو مدن لال صاحب نے گھر کے باہر میرا استقبال کیا۔ وہ تقریباً ساٹھ سال کی عمر اور درمیانے قد کا ٹھکے ایک انتہائی خوبصورت اور سمارٹ آدمی تھے۔ ان کا رنگ بھی صاف تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ پنجاب ہی کے کسی علاقے سے ہیں۔ وہ پنجابی بھی بہت اچھے طریقے سے بول رہے تھے۔ ان کا پنجابی لہجہ میرے لہجے جیسا ہی تھا۔ پٹیا لہ کے رہنے والے لوگ ایک خاص لہجے میں بات کرتے ہیں جسے پٹیا لہ شابی لہجہ کہا جاتا ہے۔ ہم زبان اور اوپر سے ایک جیسے لہجے نے ہمیں بے تکلف ہونے میں بے حد مدد دی۔

یہاں پر ایک بات واضح کرتا چلوں کہ بھارت میں عام بولی جانے والے ہندی اور اردو میں معمولی فرق ہوتا ہے لیکن اگر آپ ہندی میں خبریں سنیں یا کسی ایسے

صاحب سے ملیں جو صبح ہندی بول رہے ہوں تو آپ اردو اور ہندی میں کافی واضح محسوس کریں گے۔ اگر آپ عام بازار میں کسی سے بات کریں اور وہ یہ سمجھے کہ وہ ہندی بول رہا ہے اور آپ اردو بول رہے ہیں جو دونوں کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بھارتی فلمیں، جو ہندی زبان میں بنائی جاتی ہیں اگر آپ دیکھیں تو آپ کو ہندی اور اردو میں معمولی سا فرق بھی محسوس نہیں ہوگا، لیکن اگر آپ ٹی وی پر ہندی میں خبریں سنیں تو آپ کو بہت زیادہ فرق محسوس ہوگا۔ عام طور پر اسے سمجھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ دونوں کے طرزِ تحریر نے ایک دوسرے کو کافی دور کر دیا ہے۔

میری خواہش پر ہم دونوں نے پنجابی میں بات کی اور وہ بھی پٹیا لہ شاہی لہجے میں لیکن جب بھی مدن لال صاحب کوئی سنجیدہ بات کرنا چاہتے تو وہ آسان ہندی میں کرتے اور جب وہ تھوڑا کھل کر بات کرنا چاہتے تو پنجابی میں کرتے۔ اس کی وجہ معلوم نہیں، ہمارے ہاں پاکستان میں بھی سنجیدہ گفتگو کے لیے اردو بولی جاتی ہے اور غیر سنجیدہ بات کہنی ہو تو پنجابی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ میں تو اسے پنجابی زبان کی توہین سمجھتا ہوں۔ کچھ ہی دیر میں مدن لال صاحب کا بھتیجا بے، جو ان کا داماد بھی تھا اور اسمارٹ اور نفیس طبیعت کا مالک ایک نوجوان تھا بھی آگیا۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ مدن لال صاحب کا ڈرائنگ روم اتنا صاف ستھرا تھا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ہر چیز سے نفاست جھلکتی تھی مجھے ایسا لگا کہ کہیں چیزیں دیکھنے سے ہی میلی نہ ہو جائیں۔ اکثر اشیاء یا تو سفید تھیں یا ہلکے گلابی رنگ کی۔ کہیں کہیں ہلکا آسمانی رنگ بھی تھا۔ میں جس صوفے پر بیٹھا تھا، اس کا کپڑا اتنا پچمکدار اور سفید تھا کہ مجھے خوف محسوس ہوا کہ کہیں یہ میرے کپڑوں کی وجہ سے میلانہ ہو جائے۔ الماریوں میں کچھ ڈیکوریشن ہیں اور کچھ تصاویریں تھیں۔ بہت زیادہ قیمتی سامان تو نہیں تھا لیکن مجھے آج تک یاد ہے کہ میں نے شاید ہی اس سے زیادہ نفیس اور پر سلیقہ ڈرائنگ روم کبھی



دیکھا ہو۔ عام چیزوں کو اس انداز سے رکھنا اور سنبھالنا، یہ ذوق چند خاص لوگوں میں ہی ہوتا ہے۔

سلام دعا کے بعد انھوں نے مجھ سے چائے پانی کا پوچھا۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ چائے سے پہلے میں آپ کو ایک اور چیز پیش کرنا چاہتا ہوں جو میں نے خاص طور پر آپ کے لیے تیار کروائی ہے۔ ان کی اس بات نے مجھے ان کی ذات کے ایک اور پہلو یعنی مہمان نوازی سے بھی متعارف کروایا۔ یاد رہے ہندو مذہب میں انڈا کھانا منع ہے۔ جو ہندو مذہب کے جتنے زیادہ قریب ہوتے ہیں اتنی ہی احتیاط کرتے ہیں۔ مدن لال صاحب کا شمار بھی بہت زیادہ احتیاط کرنے والے لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس لیے مجھے ان سے بھی ایسی ہی توقع تھی۔

اتنی دیر میں ان کا بھتیجا حلوہ لے آیا۔ حلوہ بہت ہی خوب تھا لیکن اور ٹرے میں برتن بھی اتنے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے، جیسے سنار تھالی میں سونے کے زیور رکھتا ہے۔ حلوہ عام گھریلو طریقے سے سوچی سے ہی بنایا گیا تھا۔ مدن لال صاحب کا اپنا لباس بھی ایسے لگتا تھا، جیسے پہن کر استری کیا گیا ہے۔ کہیں بھی کوئی شکن نہ تھی۔ شرٹ، پیٹ، جوتے، جرابیں، ہاتھ کی گھڑی، سر کے بال ایک خاص انداز سے ترتیب دیے ہوئے ان کے چہرے کی چمک ان کی صحت کا راز بتا رہی تھی۔ وہ سب مجھے اب تک یاد ہے اور یاد بھی کیوں نہ ہو وہ سب کچھ تھا ہی ایسا۔ پھر اس کے بعد انھوں نے میرے لیے چائے بنوائی۔

بات چیت کا آغاز تعارف سے ہوا۔ ان کے لہجے سے محسوس ہوتا تھا کہ ان کی مادری زبان پنجابی ہے۔ جب انھیں یہ پتہ چلا کہ میرے آباؤ اجداد کا تعلق چندی گڑھ سے پچاس کلومیٹر دور سر ہند سے تھا تو وہ یہ جان کر بے حد خوش ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا تعلق پٹیالہ سے ہے جو سر ہند سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سن کر مجھے بھی

بہت خوشی ہوئی۔ ایک ہی علاقے سے تعلق ہونے کی وجہ سے ہماری پنجابی کالجہ بھی ایک جیسا ہی تھا، فیصل آبادی لہجہ ہم سے ملتا جلتا ہے۔

ہم نے گفتگو کا آغاز اپنی کاروباری بات چیت سے کیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کے خط کی وجہ سے مجھے چند گز کا ویزا ملا۔ جب کاروباری باتیں ختم ہو گئیں تو میں نے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں آپ سے کچھ اور باتیں بھی کروں جن کا تعلق عام معاشرتی چیزوں سے ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ڈرائنگ روم کی ایک الماری میں کافی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ جس سے مجھے یوں لگا جیسے وہ کتابیں پڑھنے کا ذوق رکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہوگی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں بھی آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔ میں نے جواب میں کہا کہ "حاضر جناب"۔ آخر میں نے اتنا مزید ار حلوہ کھایا ہے اور چائے بھی پی ہے۔۔۔ انکار کیسے کر سکتا ہوں۔ اس پر انھوں نے ایک تہقہ لگایا اور کہا کہ ہر بات سے کوئی ایسی بات نکالنا جس سے ہنسی آجائے یہ اس علاقے کے لوگوں کا وطیرہ ہے لگتا ہے کہ آپ میں بھی یہ عادت پائی جاتی ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ میرا شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ اور فیصل آباد اس کام میں بے حد مشہور ہیں۔ فیصل آباد سے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں جگتیں اگتی ہیں۔ ایک مختصر وقفے کے بعد ہم نے دوبارہ بات چیت کا آغاز کیا۔

میرے پاس ان سے پوچھنے کے لیے چند اہم سوالات تھے جو میں کئی دنوں سے لیے پھر رہا تھا کہ کہیں سے ان کا جواب مل جائے۔ مجھے لگا کہ آج موقع ہے اس لیے ہر سوال کر لیا جائے، سو میں نے کیا۔

میں نے مدن لال صاحب سے پوچھا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس وقت بھارت میں اقلیتوں کا کیا حال ہے اور خاص طور پر مسلمان، جو سب سے بڑی اقلیت ہیں، مالی اور معاشرتی طور پر اتنے کمزور کیوں ہیں؟ جبکہ ان کے ہم مذہب لوگوں نے تیرھویں

صدی سے انیسویں صدی تک پورے ہندوستان پر حکومت کی اور اس کے بعد بھی ہندوستان کے بہت سے علاقے ایسے تھے جہاں پر مسلمان حکمرانوں کی حکومت رہی۔ لیکن آج بھارت میں ہر میدان میں مسلمان سب سے پیچھے کیوں نظر آتے ہیں؟ ایسا کیسے ہو گیا؟

مدن لال صاحب نے کہا کہ آپ مجھے چند منٹ دیں میں ایک دو کتابیں اپنے پاس رکھ لوں تاکہ مجھے حوالہ دینے میں آسانی ہو۔ انھوں نے الماری سے کچھ کتابیں اٹھا کر اپنی میز پر رکھ لیں۔ ان میں سے کچھ ہندی میں تھیں اور کچھ انگلش میں۔ میں انگلش کی کتابوں کے عنوانات پڑھ سکا۔ جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ کتابیں ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ مدن لال صاحب نے مجھے کہا کہ پہلے میں آپ کو کچھ دیر کے لیے ماضی میں لے جاتا ہوں۔ تاکہ آپ کو موجودہ صورتِ حال سمجھنے میں آسانی ہو۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ مصدقہ تاریخ تو کوئی نہیں ہے کہ آج سے ہزار سال پہلے بھارت کی آبادی کتنی تھی لیکن تاریخ دانوں نے جو اندازہ لگایا اس سے یہ لگتا ہے کہ کہ سلاطین دہلی کے آنے سے قبل ہندوستان کی آبادی بہت کم تھی شاید چند کروڑ ہوگی۔ آبادی کا انحصار زراعت پر تھا۔ زراعت کی حالت بہت نازک تھی۔ اس لیے آبادی میں اضافہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اوسط عمر بھی کافی کم تھی۔ قحط کے ساتھ ساتھ جنگوں کی وجہ سے بھی آبادی نہیں بڑھ رہی تھی۔ سب تاریخ دان اس بات پر متفق ہیں کہ سلاطین دہلی کے بعد، خاص طور پر مغلیہ سلطنت کے قیام کے بعد زری اصلاحات اور مرکزی طور پر ایک بڑی حکومت ہونے کی وجہ سے آبادی میں بے حد اضافہ ہوا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مغلیہ دور میں آبادی میں اضافے کی شرح سب سے زیادہ رہی۔ اس سے ہندوستان کی کل آبادی میں بھی بے حد اضافہ ہوا۔

انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب سلاطین دہلی کے دور میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا، اس کے بعد اس کی اولاد ہی میں سے باہر نے بھی ہندوستان پر حملہ کیا۔ تیمور تو واپس چلا گیا لیکن مغل نہیں گئے۔ جب تک مغلیہ سلطنت کی طاقت برقرار رہی، اور نگزیب کی وفات تک تو کسی نے بھی افغانستان کی طرف سے ہندوستان پر حملہ نہیں کیا۔ اس دوران انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام نے بھی جنوبی ہندوستان کے ساحلی علاقوں تک محدود رہنے میں عافیت جانی، لیکن جیسے ہی مغلیہ سلطنت کمزور ہوئی، تو نادر شاہ نے حملہ کر دیا۔ نادر شاہ کے بعد اس کے ایک جرنیل احمد شاہ ابدالی نے بھی کئی حملے کیے۔ اور اس کے ساتھ ہی انگریز بھی جنوبی ہند سے آگے بڑھ کر شمالی ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ ان سب کا تذکرہ میں اس لیے کرنا چاہتا تھا کہ آپ کو یہ اندازہ ہوا جائے کہ صورت حال کیا تھی۔

اب ہم آبادی کی طرف آتے ہیں، مدن لال صاحب نے کہا کہ دستیاب ریکارڈ کے مطابق 1881ء میں، انگریزوں کے دور حکومت میں پہلی بار آبادی کے اعداد و شمار اکٹھے کیے گئے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق، ہندوستان، جس میں موجودہ پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے تمام علاقے شامل تھے، کی آبادی 24 کروڑ تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ تعداد 33 کروڑ ہو گئی۔ 1941ء میں کیے گئے سروے کے مطابق ہندوستان کی آبادی 39 کروڑ تھی۔ تقسیم کے بعد 1951ء میں بھارت کی آبادی 36 کروڑ، مشرقی پاکستان کی آبادی سوا چار کروڑ اور مغربی پاکستان کی آبادی سوا تین کروڑ تھی۔

مدن لال صاحب نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اب 2000ء میں بھارت کی آبادی ایک ارب ہے، یعنی پچھلے پچاس سال میں اس کی آبادی میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان، سابقہ مغربی پاکستان کی آبادی چودہ کروڑ ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو پاکستان کی آبادی میں تقریباً پانچ گنا اضافہ ہوا ہے۔ مدن لال صاحب کی بات

سن کر مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ پاکستان، جہاں پچانوے فیصد سے زائد مسلمان آباد ہیں کی آبادی میں پانچ گنا جبکہ بھارت، جہاں اسی فیصد ہندو آباد ہیں کی آبادی میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت 2021ء میں بھارت کی آبادی ایک ارب چالیس کروڑ پاکستان کی آبادی اکیس کروڑ ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ کہیں مدن لال صاحب آبادی میں اضافے کی شرح کو مذہب سے تو نہیں جوڑ رہے؟

مدن لال صاحب نے کہا کہ مشتاق جی میں ایک اور بات کی طرف آپ کی توجہ دلوانا چاہتا ہوں، بہت دلچسپ ہے۔

انھوں نے بتایا کہ تقسیم ہند کے بعد 1951ء کے سروے کے مطابق مسلمان بھارت میں آبادی کا دس فیصد سے بھی کم تھے جبکہ ہندو 84 فیصد سے زائد تھے اور 2000ء میں ہندو کم ہو کر 79 فیصد جبکہ مسلمان دس فیصد سے بڑھ کر پندرہ فیصد ہو گئے۔ ہندوؤں کو اس بات کا بھی خوف ہے کہ اگر مسلمانوں کی آبادی میں اسی طرح اضافہ ہوتا گیا تو ایک دن ان کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں پہلے سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ 2000ء کے اعداد و شمار کے مطابق بھارت میں ہندو 84 فیصد سے کم ہو کر 77 فیصد رہ گئے ہیں جبکہ مسلمان دس فیصد سے بڑھ کر 16 فیصد ہو گئے ہیں۔ بھارتی مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی آبادی کم ظاہر کی جاتی ہے لیکن حقیقتاً وہ آبادی کا بیس فیصد ہیں۔

میں نے یہ سب جان کے مدن لال صاحب سے پوچھا کہ اس سب کا مسلمانوں کی معاشی کمزوری سے کیا تعلق؟ جس پر انھوں نے کہا کہ جب پہلے ہی کھانے کو کچھ نہ ہو، تعلیم بھی نہ ہو اور مالی وسائل بھی کم ہوں تو بچوں کی زیادہ تعداد مزید غربت کی طرف لے جاتی ہے۔ مدن لال صاحب نے بات سمیٹتے ہوئے کہا کہ ان کے نزدیک مسلمان گھرانوں، خاص طور پر غریب گھرانوں میں بچوں کی پیدائش کی شرح مسلمانوں کو غربت سے باہر نہیں آنے دیتی لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کو بھی اس بات کا شدت

سے احساس ہونے لگا ہے۔ نئی نسل کے مسلمان نوجوان اب چھوٹے گھرانے کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ انھی دنوں میں نے بھارتی میڈیا پر ایک سلوگن بھی سنا کہ پہلا بچہ ابھی نہیں اور دوسرا بچہ کبھی نہیں۔ میں نے ان کی اس بات سے اتفاق کیا کہ آبادی میں اضافہ اگر ذاتی اور ملکی وسائل کے اضافے سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

مدن لال صاحب نے اپنی بات کے حق میں کئی مثالیں بھی دیں۔ انھوں نے کہا کہ 1950ء میں چین کی آبادی 55 کروڑ تھی 2000ء میں ایک ارب اور چھبیس کروڑ ہے، یعنی دو گنا سے کچھ زائد۔ جب کہ بھارت کی آبادی تقریباً تین گنا ہو گئی۔ 2020ء میں چین کی آبادی ایک ارب پنتالیس کروڑ ہے، ستر سالوں میں یہ اضافہ تقریباً تین گنا سے بھی کم ہے جب کہ بھارت میں یہ اضافہ چھتیس کروڑ سے ایک ارب چالیس کروڑ ہے، جو کہ تقریباً چار گنا کے قریب بنتا ہے۔ مدن لال صاحب نے بات سمیٹتے ہوئے کہا کہ غربت کی ایک وجہ آبادی میں زیادہ اضافہ بھی ہے۔ مسلمانوں میں یہ اضافہ دوسری قوموں کی نسبت بہت زیادہ ہے اس لیے ان کے ہاں غربت بھی زیادہ ہے۔

میں نے مدن لال صاحب سے پوچھا کہ یہ تو ایک بات ہوئی لیکن مسلمان تعلیم میں کیوں پیچھے ہیں؟ میرے سوال کو سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہنے لگے کہ میرا جواب آپ کو پسند نہیں آئے گا لیکن جو میں نے پڑھا ہے وہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

میں نے کہا فرمائیے!

انھوں نے بتایا کہ میرے علم اور میرے بہت سارے مسلمان دوستوں کے مطابق آپ کی مقدس کتاب کا پہلا فقرہ ہی پڑھنے سے متعلق ہے۔ میں نے آپ کی تاریخ میں بھی پڑھا ہے کہ آپ کے نبیؐ تعلیم کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے توجنگی قیدی بھی تعلیم کے بدلے چھوڑ دیے تھے اور بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک علم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی مذاہب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے ہر جگہ تعلیم کی اہمیت ہے لیکن پھر ایسا کیا ہوا کہ مسلمان نماز روزے کا اہتمام تو بڑے شوق سے کرتے ہیں لیکن تعلیم کی طرف راغب نہیں ہوتے؟ آج بھارت میں شرح خواندگی ستر فیصد ہے اور مسلمانوں میں یہ شرح چالیس فیصد سے بھی کم ہے۔ مسلمان اسلام کے لیے لڑنے مرنے کو بھی تیار ہوتے ہیں لیکن وہ تعلیم کے میدان میں پیچھے کیوں رہ گئے؟ کیا ایسا کسی کے مفاد میں تو نہیں تھا؟

انھوں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ان کے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ وہ لوگ ہیں جنہیں آپ اپنا بہت بڑا ہمدرد سمجھتے ہیں، جنہیں آپ اپنا ہیر ومانتے ہیں، جن کی حکمرانی کے لیے آپ نے جنگیں لڑی ہیں۔ میں نے پوچھا کون؟ تو جواب میں انھوں نے کہا کہ آپ کے حکمران، نواب، راجے، شہنشاہ۔۔۔

میں یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ مشتاق جی، تعلیم یافتہ قوم کسی بھی ڈکٹیٹر کو ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی۔ اسے جسمانی طور پر ایک طاقتور اور عقل سے عاری سپاہی چاہیے ہوتا ہے جو اس کی خاطر اپنی جان بھی دے دے تاکہ اس کا محل سلامت رہے۔ تعلیم تو انسان کو سوچنا سکھاتی ہے۔

انھوں نے مزید کہا کہ یہ معاملہ صرف مسلمانوں کے ساتھ ہی نہیں ہے، اس میں سب برابر کے شریک ہیں۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ

تقسیم ہند کے وقت بھارت میں شرح خواندگی کیا تھی؟ تو سنئے بھارت میں یہ شرح خواتین میں آٹھ فیصد، مردوں میں ستائیس فیصد اور اوسطاً اٹھارہ فیصد تھی۔ پاکستان میں عورتوں میں بارہ اور مردوں میں انیس فیصد جبکہ اوسط سولہ فیصد تھی۔ یہ کہہ کر مدن لال صاحب خاموش ہو گئے۔ اس میں کوئی بھی بے قصور نہیں ہے، نہ ہی ہندو، نہ ہی مسلمان اور نہ ہی دیگر مذاہب کے ماننے والے لوگ۔ انھوں نے بات سمیٹے ہوئے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے بیشتر علاقے ایسے تھے جہاں سدا ہندو ہی حاکم رہے۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں ہی عرب ہندوستان میں سندھ کے مقام پر حملہ آور ہوئے اور انھوں نے اپنی حکومت بھی قائم کی۔ اس وقت سے آج تک، پچھلے تیرہ سو سال سے سندھ میں صرف مسلمانوں کی حکومت ہے۔ پھر قصور وار کون ہے؟ صرف اور صرف حکمران۔

میں نے پوچھا کہ کوئی تو ہوگا جس نے تعلیم کو تھوڑا بہت پھیلا دیا ہوگا۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ آپ کے صوفیاء اکرام، آپ کے دینی رہنما، کچھ بھلائی کا کام کرنے اور درد دل رکھنے والے لوگ۔ میں نے اس کی مزید وضاحت چاہی تو انھوں نے کہا سینے مشتاق جی!

سب سے پہلے جیسے ہی مسلمان ہندوستان میں آئے تو ان میں بہت سارے صوفی بزرگ بھی تھے۔ انھوں نے یہاں آ کر اپنی خانقاہیں قائم کیں۔ وہ خانقاہ تین چیزوں پر مشتمل ہوتی تھی؛ ایک عبادت گاہ، جسے ہم مسجد کہہ سکتے ہیں، دوسرا لنگر خانہ، جہاں لوگوں کو مفت کھانا دیا جاتا تھا اور تیسرا ایک مدرسہ جہاں لوگوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ آج بھی آپ کسی بھی خانقاہ کو دیکھ لیں تو آپ کو یہ تینوں چیزیں وہاں پر ملیں گی۔ لاہور میں داتا صاحب، بہت مشہور صوفی کی خانقاہ ہے، یہاں دلی میں نظام الدین کی خانقاہ۔ غرض آپ کہیں بھی چلے جائیں آپ کو ایسے بے شمار مقامات ملیں گے۔ یہی وہ



مراکز تھے جہاں ہر مذہب کا ماننے والا جاتا تھا۔ انھی لوگوں کے کہنے پر یا ان سے متاثر ہو کر بے شمار ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔

میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ صوفی بزرگ روحانی تعلیم اور علاج کے ساتھ ساتھ جسمانی علاج بھی کرتے تھے۔ درحقیقت وہ خانقاہ ایک بہت بڑا کمپلیکس ہوتی تھی۔ اسی طرح کی بے شمار خانقاہیں آپ کو ہندوستان بھر میں ملیں گی۔ یہ وہ پہلا ذریعہ تھا جس سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان خانقاہوں میں زیادہ تر دینی تعلیم ہی دی جاتی تھی۔ وہ بھی ایک بہت بڑا کام تھا۔ اس کام کے لیے ان لوگوں کو بادشاہ کی سرپرستی کم ہی حاصل رہتی تھی۔ وہ خانقاہیں عام لوگوں کے چندے پر ہی قائم تھیں، یہ سب مدن لال صاحب نے بتایا۔

مدن لال صاحب نے کہا کہ دوسرا ذریعہ آپ کے دینی مدارس تھے۔ شاید آپ کے لیے یہ بات بہت ہی دلچسپ ہو کہ ہندوستان میں پہلا اسلامی تعلیم کا پہلا مدرسہ کسی مغل بادشاہ، شاہ یا سلاطین دہلی نے نہیں بلکہ ایک انگریز نے بنایا۔ آپ کے مسلمان بادشاہوں کے دور کی بہت بڑی بڑی عمارتیں نظر آئیں گے۔ جنہیں بنانا شاید آج بھی آسان نہ ہو۔ اس کے لیے ایک بڑی رقم کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی اور طویل مدت بھی درکار ہوگی۔ آپ کے مسلمان بادشاہوں نے تاج محل، آگرہ کا قلعہ، لال قلعہ دہلی، قطب مینار اور اس طرح کی بے شمار بلند و بالا عمارتیں بنائیں۔ ان سب کے لیے بہت عقل بھی استعمال کی گئی اور بے بہا پیسہ بھی خرچ کیا گیا لیکن آپ کو اس درجے کا کوئی بھی مدرسہ یا تعلیمی ادارہ نہیں مل پائے گا اس لیے یہ ترجیح نہیں تھا۔ مسجد کے ساتھ علماء کرام نے دین کی تبلیغ کے لیے چند کمروں میں تعلیم کا کام شروع کیا، جیسے جامع مسجد دہلی کے کچھ کمرے تعلیم کے لیے مختص ہیں۔

ہندوستان میں اسلام کی تعلیم کے لیے پہلا مدرسہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز نے 1780ء میں بنوایا اور اس کے پہلے سربراہ ایک معروف دینی عالم مولانا محمد ذین تھے۔ میں نے مدن لال صاحب سے کہا کہ میں اس درسگاہ کی تاریخ بھی جاننا چاہتا ہوں۔ میری درخواست پر انھوں نے اس قدیم درسگاہ کی ایک مختصر تاریخ بتائی جو کچھ یوں ہے۔

کلکتہ میں اس مدرسے کی ابتدا 1780ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی گورنر جنرل وارن ہسٹنگز (Warren Hastings) نے کی۔ اس وقت ایسٹ انڈیا صرف ہندوستان کے جنوبی علاقوں تک ہی محدود تھی۔ اس مدرسے کا پہلا نام مدرسہ عالیہ کلکتہ رکھا گیا۔ اس مدرسے کا شمار ہندوستان کی قدیم ترین اسلامی درسگاہوں میں ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب مغلیہ سلطنت کمزور ہو گئی تو بنگال کا انتظام و انصرام ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ آ گیا۔ انگریزوں کے دن بہ دن بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے بنگال کے مسلمانوں نے اپنی مذہبی اور معاشرتی روایات کو محفوظ کرنے کے لیے ایک دینی درسگاہ کے قیام کا سوچا لیکن اس کے لیے ان کے پاس وسائل نہیں تھے۔ ایک عظیم المرتبت علمی شخصیت مولانا محمد الدین، جو عرف عام میں مولوی مدن کے نام سے مشہور تھے، ان دنوں کلکتہ میں قیام پذیر تھے۔ ان کی قیادت میں ایک وفد وارن ہسٹنگز، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل سے ملا۔ گورنر جنرل نے مدرسہ قائم کرنے کی درخواست منظور کر لی اور یوں 1780ء میں مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس مدرسے کے پہلے سربراہ محمد الدین مقرر کیے گئے۔ اس کام کے لیے وارن ہسٹنگز نے اپنے ذاتی خرچ پر ایک جگہ خریدی اور وہاں ایک شاندار عمارت تعمیر کی۔ ابتدا میں اس مدرسے کے تعلیمی اخراجات بھی وارن ہسٹنگز نے خود برداشت کیے۔ اس کی بھی ایک طویل اور خوبصورت داستان ہے۔ یہ کہہ کر مدن لال صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔



Alia University New Campus Photo Credit:

[https://researchersjob.com /](https://researchersjob.com/)

میں نے جب اس درسگاہ سے متعلق جاننا چاہا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت، یعنی 2021ء میں یہ ادارہ، جس کی عمر 241 سال ہے، ایک بڑی یونیورسٹی کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اس کے تین بڑے کیمپس ہیں۔ بنگال کی وزیر اعلیٰ متا بنرجی نے 2011ء میں نیوٹاؤن میں عالیہ یونیورسٹی کیمپس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس یونیورسٹی میں پڑھنے والے طلباء کی تعداد دس ہزار سے بھی زائد ہے۔

مدن لال صاحب نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اس مدرسہ سے قیام کے سو برس بعد تک ہمیں کوئی نیا مدرسہ نظر نہیں آتا۔ جنگ آزادی، جس میں مسلم علماء نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، میں شکست کے بعد مسلمانوں نے یہ سوچا کہ ہمیں اپنی سماجی، سیاسی اور مذہبی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے مدارس قائم کرنے چاہیں۔ اس کے بعد دیوبند اور اس کے ساتھ ساتھ کئی دیگر مدارس کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں بریلی میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا۔ ان مدارس کے طلبہ نے تعلیم سے فارغ ہو کر کئی مدارس کی بنیاد رکھی۔ اس وقت بھارت بھر میں لاکھوں مدارس ہیں ایسا ہی پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی ہے۔ ان مدارس نے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ

میں اہم کردار ادا کیا۔ میں یہ سب جان کر، جو میرے لیے نیا بھی تھا، بہت خوش بھی ہوا اور اداس بھی۔

مدن لال صاحب نے کہا کہ تیسرا ذریعہ وہ تعلیمی ادارے تھے جو دنیاوی تعلیم دینے کے لیے بنائے گئے۔ ان میں سب سے اہم علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نظام کی بنائی ہوئی حیدر آباد یونیورسٹی، پاکستان میں گجرات کا زمیندار کالج، بہالپور میں عباسی خاندان کے بنائے ہوئے تعلیمی ادارے، محمدن کالج کے نام سے قائم کئی ادارے۔ ان اداروں نے بھی مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

چوتھا ذریعہ انگریزوں کا نظام تعلیم تھا۔ میرے خیال میں اس نظام سے ہندوؤں نے مسلمانوں کی نسبت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں کے دور میں پہلی مرتبہ ایک نظام تعلیم وضع کیا گیا۔ سکولز، کالجز، یونیورسٹی، ٹیکنیکل ادارے، صحت کے ادارے، غرض ایسا بہت کچھ جو اس سے پہلے کسی بھی حکمران، ہندو ہو یا مسلمان نے نہیں کیا تھا۔

ہندوستان میں جمہوریت بھی اسی دور میں متعارف ہوئی۔ پہلی مرتبہ عام آدمی کو ووٹ دینے کا حق اور اپنے حکمران چننے کا موقع ملا۔ جنوبی ہندوستان میں دو سو سال اور شمالی ہندوستان میں سو سالہ انگریز دور حکومت میں تعلیم کو پہلے سے بہتر کرنے کی قابل قدر کوشش کی، لیکن ان سب کے باوجود بھی انگریزوں کے جانے کے وقت 1947ء میں ہندوستان کی مجموعی شرح خواندگی بیس فیصد سے بھی کم تھی۔ پاکستان میں یہ شرح بھارت سے بھی کم تھی اور بھارت میں ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کی شرح خواندگی بہت کم تھی۔ مدن لال صاحب نے بات سمیٹتے ہوئے کہا کہ ان کا خیال ہے کہ اس میں ہندوستان کے سابقہ حکمرانوں کی نسبت انگریزوں کا زیادہ کردار رہا ہے۔ اگر آپ کو انگریزوں کی آمد سے قبل کا کوئی ڈیٹا مل سکے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت شرح پانچ فیصد بھی نہیں ہوگی۔ انگریزوں کے دور میں شرح خواندگی میں اضافہ سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔

میں نے پوچھا کہ جب بھارت میں ایک ہی جیسا ماحول رہا تھا تو پھر مسلمان تعلیم میں پیچھے کیوں رہے؟ مجھے جو جواب ملا، میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ مسئلہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہے۔ اگر مذاہب کی بنیاد پر دیکھا جائے تو مسلمانوں میں شرح خواندگی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی نسبت کافی کم ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ پاکستان، جہاں پچانوے فیصد سے زائد مسلمان بستے ہیں میں یہ شرح آج بھی چالیس فیصد سے زائد نہیں ہے یہ 2000ء کی بات ہے اور 2020ء میں بھی ہم صرف ساٹھ فیصد کے قریب ہیں۔ اس میں قصور وار کون ہے، پڑھنے والے یا پڑھانے والے؟ جواب تھا دونوں، لیکن پڑھنے والے زیادہ قصور وار ہیں۔ وہ چاہتے تو وہ خود بھی اس کا اہتمام کر سکتے تھے۔

اس مختصر تاریخ سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تعلیمی معاملات میں ہندوستان کے مسلمان پیچھے کیوں ہیں۔ انھوں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا کہ ہندوؤں نے اس بات کا احساس پہلے کر لیا تھا کہ تعلیم حاصل کرنی چاہیے لہذا انھوں نے اس طرف توجہ دی۔ اب آہستہ آہستہ مسلمانوں کی نئی نسل بھی اس طرف متوجہ ہو رہی ہے۔ آنے والے چند سالوں میں مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد تعلیمی اداروں میں جانا شروع ہو جائے گی۔

ہمیں گفتگو کرتے ہوئے کافی وقت گزر گیا۔ مدن لال صاحب کو بھی کہیں جانا تھا اور شاہ صاحب بھی میرا انتظار کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود میں نے ایک سوال پوچھ لیا۔ میں نے کہا مدن لال صاحب یہ تو بتائیے کہ مسلمان معاشی طور پر کمزور کیوں ہیں؟ جواب تھا تعلیم کا نہ ہونا اور بچوں کی تعداد میں ضرورت سے زائد اضافہ۔ اس کے بعد ہم دروازے کی طرف چل پڑے۔ میں نے کھڑے کھڑے ایک اور سوال پوچھا کہ کیا اس سارے معاملے میں کسی مذہبی تعصب کا ہاتھ تو نہیں ہے؟ انھوں نے کہا کہ بہت

زیادہ تو نہیں لیکن بہت معمولی سا ہو سکتا ہے۔ ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ یہ توقیلہ اور برداری حتیٰ کہ علاقے کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بہت سی نئی باتیں جان کر ان سے اجازت چاہی۔

اپنی ناکامی کا سبب اپنے میں ڈھونڈنے کی بجائے دوسروں کا گلہ کرنا۔۔۔

یہ ترقی کا راستہ نہیں ہو سکتا۔

میرے محترم دوست جناب امجد وڑائچ صاحب نے ایک اور مدرسے کی نشاندہی کی جس کی بنیاد شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد نے مغل بادشاہ اورنگزیب کے دور حکومت میں رکھی اور اس کے لیے انھیں اورنگزیب کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ شاہ عبدالرحیم کی وفات کے بعد 1718ء میں شاہ ولی اللہ مدرسے کے سربراہ بنے۔ شاہ ولی اللہ کی وفات ہوئی تو ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع اور شاہ عبدالقادر نے بھی پڑھانا شروع کیا۔ بعد ازاں اس کی کئی شاخیں بن گئیں۔ میں نے اس کے بارے میں بھی جاننے کی کافی کوشش کی لیکن زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

ہندوستان میں مدارس کے بارے میں مجھے انٹرنیٹ پر ایک کتاب دیکھنے کو ملی۔ جس کا نام ہے:

The Religious Traditions of Asia: Religion, History,  
and Culture edited by Joseph Kitagawa

اس کتاب کے مطابق ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے دور میں ہر مسجد کے ساتھ علماء اکرام تعلیم کا نظام بھی چلاتے تھے وہ کسی مرکزی نظام کا حصہ نہیں ہوتے تھے اور ان کا نصاب زیادہ تر دینی علوم پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔ پہلا باقاعدہ مدرسہ وہی تھا جو شاہ عبدالرحیم صاحب نے قائم کیا۔ اب وہ مدرسہ کس حال میں ہے، کچھ علم نہیں۔ اس کے

مقابلے میں کلکتہ کا مدرسہ عالیہ، جو اب ایک یونیورسٹی بن چکا ہے۔ ان معلومات کے لیے میں امجد بھائی کاشکریہ ادا کرتا ہوں۔

حاصل یہ کہ مسلمانوں کو جو بھی تھوڑی بہت تعلیم ملی اس میں ہمارے اسلاف کی کوششوں کا بے حد عمل دخل ہے۔ انھوں نے بغیر کسی شاہی سرپرستی اور معمولی وسائل کے ساتھ دین کی بات آگے پہنچانے میں بے حد اہم کردار ادا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔

چندی گڑھ میں کئی اہم مقامات ہیں۔ جن میں چند ایک کا ذکر ضروری پیش خدمت ہے۔

## راک گارڈن چندی گڑھ: ایک ایسا باغ جس کی تاریخ بہت ہی انوکھی ہے

اس سے پہلے کہ میں آپ کو راک گارڈن کے بارے میں بتاؤں، میں چاہوں گا کہ اس کی تاریخ اور اس کے بنانے والے کے بارے میں کچھ عرض کروں۔

نیک چند سینی جو 1924ء میں شکر گڑھ، نارووال میں پیدا ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ بھارت نقل مکانی کر گیا اور محکمہ تعمیرات عامہ میں روڈ انسپکٹر کی حیثیت سے بھرتی ہو کر چندی گڑھ آگیا۔ چندی گڑھ کے قریب ایک جنگل تھا جہاں ہر طرح کی تعمیرات پر بھی پابندی تھی اور لوگ بھی وہاں جانے سے کتراتے تھے۔ اس دوران نیک چند نے اپنے فارغ وقت میں ارد گرد کے علاقوں سے فالتو اشیاء اور پتھر اکٹھے کر کے ان سے مجسمے، دیواریں، اور بے شمار چیزیں بنانا شروع کر دیں۔ اٹھارہ

سال سے زیادہ عرصے تک وہ یہ کام اکیلا ہی کرتا رہا اور کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہونے دی۔

نیک چند کا وہ کام غیر قانونی تھا لیکن وہ اسے اٹھارہ سال تک چھپانے میں کامیاب رہا۔ اس نے اپنی بنائی ہوئی اشیاء کو تیرہ انچڑر قبے پر پھیلایا۔ جب حکام کو پتہ چلا تو اسے اس کے ختم کرنے کا ڈر پیدا ہوا۔ لوگوں نے اس جگہ پر بنی ہوئی اشیاء کو دیکھا تو سب نے اسے بے حد سراہا اور یوں یہ ایک ایسا باغ بن گیا جو تنہا ایک شخص سے اٹھارہ سال میں بنایا اور کسی کو اسکی خبر بھی نہ ہونے دی۔ اس کے لیے اسے کسی مالی امداد کی بھی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو کوڑے بکڑ سے ردی کی اشیاء اٹھا کر لاتا تھا اور آرٹ کی بغیر رسمی تعلیم کے اس نے ایک ایسا عجوبہ بنایا جہاں تاج محل کے بعد آج سب سے زیادہ سیاح آتے ہیں۔ اس پر اسے بھارت کا سب سے بڑا سول اعزاز پدماشری بھی ملا اور اس کے نام کی ڈاک ٹکٹ بھی جاری ہوئی۔ نیک چند کی وفات ہو چکی ہے لیکن اب بھی اس باغ میں ردی کی اشیاء سے چیزیں بنائی جاتی ہیں اور اب کئی لوگ مل یہ کام کرتے ہیں۔

میں اس باغ کو تو نہ دیکھ سکا لیکن اس کی کئی وڈیوز ضرور دیکھی ہیں۔ یہ باغ اب بھارت میں تاج محل کا مقابلہ کر رہا ہے اُس کے لیے ہندوستان کا خزانہ خالی ہو گیا تھا لیکن اس کے لیے صرف کوڑا کرکٹ ہی استعمال کیا گیا۔ اب یہ باغ بھارت کے قومی ورثے کی فہرست میں شامل ہے اور اس باغ کو عالمی شہرت بھی حاصل ہے۔

کام دل لگا کر اور مسلسل کیا جائے۔۔۔ تو دنیا اسکی قدر تو کرتی ہے۔ نیک چند اور اس کا باغ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔

اس کے علاوہ چندی گڑھ میں دیگر کے کئی قابل دید مقامات بھی ہیں۔ جن کا مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے۔



پھاڑیوں کے دامن میں واقع چندی گڑھ کی سکھنا جھیل ایک مصنوعی جھیل ہے جو چندی گڑھ شہر کے منصوبے کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس جھیل کے ارد گرد کا ماحول بہت ہی پرسکون ہوتا ہے۔ اس جھیل میں کشتی رانی کی سہولت بھی میسر ہے۔ میں نے اس جھیل کی کئی وڈیوز دیکھیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جگہ آرام اور تفریح کے لیے بہترین ہے۔ اس جھیل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہاں سردیوں میں سائبیریا سے کئی اقسام کے پرندے بھی آتے ہیں۔ شکار پر مکمل پابندی ہونے کی وجہ سے ان پرندوں کی بڑی تعداد یہاں آتی ہے۔ لوگ دور دور سے انھیں دیکھنے آتے ہیں۔

چندی گڑھ میں تھنڈرزون ایک تفریحی اور واٹر پارک ہے۔ اس میں لوگ بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں پر بچوں کے لیے مختلف قسم کی گاڑیاں بھی ہیں۔ چندی گڑھ کا ٹیرس گارڈن ایک بہت ہی مشہور جگہ اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ یہ دس ایکڑ قصبے پر پھیلا ہوا ہے۔ جو باغات اور قدرتی نظاروں سے محبت کرنے والے سیاحوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ چندی گڑھ میں بوگین ویلیا گارڈن نام کا ایک باغ بھی بے حد مشہور ہے۔ یہ باغ بیس ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مختلف بوگن ویلیا کے مختلف اقسام کے پودے ہیں۔ یہاں سالانہ بوگین ویلیا میلہ بھی لگایا جاتا ہے۔ "خوشبو کا باغ" بھی چندی گڑھ کا ایک قابل ذکر مقام ہے۔ یہ باغ خوشبودار پودوں جیسے مہندی، ہار شنگر، رات کی رانی، موتیا، چمپا، ڈی ماسک گلاب اور کئی خوشبو بکھیرنے والے پودوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر جاپانی باغ اور تتلی باغ بھی قابل ذکر مقامات ہیں۔

میں مدن لال صاحب سے مل کر ہوٹل واپس آ گیا۔ اس دوران شاہ صاحب نے بھی کافی آرام کر لیا تھا اور اب وہ تازہ دم تھے۔ میں نے شاہ صاحب سے کہا کہ اب ہم شہر کی سیر کو چلتے ہیں۔ اس پر وہ خوشی سے راضی ہو گئے۔ میں نے پر مندر سے بھی کہا کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے کوئی کام ہے۔ اور ہمارے ساتھ جانے

سے معذرت کر لی۔ میں اجنبی شہر میں کسی مقامی ساتھی کے بغیر گھومنے میں ہمیشہ دقت محسوس کرتا ہوں لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں چند ہی گڑھ میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کوئی نہ تھی کہ زبان اور کلچر کی وجہ سے مجھے لاہور اور چند ہی گڑھ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ سب ایک جیسا ہی لگ رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سکھوں کی پگڑیاں زیادہ تعداد میں نظر آرہی تھیں۔

ہم اپنے ڈرائیور کے ساتھ شہر کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے۔ ایک دو بڑے پلازوں میں بھی گئے اور چیزوں کی قیمتیں جانیں اور تھوڑی بہت خریداری بھی کی۔ بہت زیادہ گھومنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ نئے تعمیر شدہ شہروں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ سب ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں اسلام آباد کی سڑکوں پر پھر رہا ہوں۔ اُسی طرح سے کھلی سڑکیں، کشادہ چوک اور بلند و بالا عمارتیں۔ ان عمارتوں کی شکل و صورت میں کسی بھی طرح کی کوئی ایسی چیز نظر نہیں آرہی تھی جو کسی طرزِ تعمیر کی نمائندگی کرتی ہو۔ ان کے طرزِ تعمیر میں نا کوئی ہندوستانی طرزِ تعمیر کی جھلک، نا ہی برٹش کا اندازِ تعمیر اور نہ وہ مغلوں کے ذوق کا شاہدہ تھیں۔ بس یہ سیدھی سیدھی کھڑکیاں اور دروازے ہی موجودہ دور کا آرکیٹیکچر ہے۔ اس لیے مجھے ان سب میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

ایک چیز جو بہت مختلف تھی وہ خواتین کا بڑی تعداد میں سڑکوں پر موٹر سائیکل چلانا تھا۔ میں آج سے بیس سال پرانی بات کر رہا ہوں۔ آج بھی لاہور، اسلام آباد اور کراچی میں ہمیں شاید ہی پورے دن میں کوئی خاتون موٹر سائیکل چلاتی نظر آئے، لیکن وہاں پر میں نے دیکھا کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد چھوٹی سی موٹر سائیکل پر سوار آ جا رہی تھی۔ اس سے وہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا سکتی ہیں، اور اب ان کی تعداد میں یقیناً کافی اضافہ ہو گیا ہوگا۔

ایک اور چیز جو دیکھنے کو ملی وہ یہاں کی کھلی سڑکیں اور چوراہے تھے۔ ہمیں کسی بھی جگہ پر سگنل نہیں ملا۔ ہم ہر چوراہے سے آرام سے گزر گئے۔ مجھے کسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب اس شہر کی پلاننگ ہوئی تھی تو اس کے بارے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اس شہر میں کبھی بھی ٹریفک جام نہیں ہوگی اور اب تک ایسا ہی ہے۔ بے شمار پلوں کی وجہ سے ہر طرف ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔

اس شہر میں سکھ آبادی کا پندرہ فیصد جبکہ ہندوؤں اسی فیصد سے بھی زائد ہیں۔ میں نے یہ بھی جانا کہ سکھوں کی دکانیں بہت تھیں اور زیادہ تر دکانوں کے مالک بھی تھے۔ آپ کو اس بات کا اندازہ دکاندار کے لباس اور دیواروں پر لگی تصاویروں سے ہو جاتا ہے کہ دکان کا مالک کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے پوری کوشش کے باوجود کسی مسلمان کی کوئی دکان ملی اور نہ ہی کوئی مسجد۔ اس کی وجہ چندی گڑھ میں مسلمانوں کی انتہائی کم آبادی ہے۔ اس وقت چندی گڑھ میں مسلمان آبادی کا چار فیصد بھی نہیں ہیں۔



Open Air Theater Chandigarh Photo Credit:

<https://img.traveltriangle.com>



Mohali Cricket Stadium Photo Credit:  
<https://img.traveltriangle.com>



Garden of Frangrnrc Photo Credit:  
<https://img.traveltriangle.com>



Gandhi Museum, alias Gandhi Bhawan Photo Credit:  
<https://img.traveltriangle.com>



Botanical Garden Photo Credit:  
<https://img.traveltriangle.com>



The Open hand monument Photo Credit:  
<https://img.traveltriangle.com>



Rock Garden Built by Neik Chand Photo Credit:  
<https://img.traveltriangle.com>

## تندوری جھلی اور بے فکرے پنجابی سکھ نوجوان

ہم کافی دیر تک گھومتے رہے اور اس دوران جب مغرب کا وقت ہو گیا تو واپس ہوٹل لوٹ آئے۔ ہوٹل والوں سے پوچھا کہ کیا کوئی ایسا ریستوران ہے جہاں روایتی کھانا ملتا ہو؟ انھوں نے کہا کہ اگر آپ تھوڑا سا پیدل چلیں تو مارکیٹ میں آپ کو بہت ساری ایسی جگہیں مل جائیں گی۔ ہم تینوں مارکیٹ کی طرف چل پڑے۔ جب اس مارکیٹ میں پہنچے تو وہاں پر دو چیزیں بڑی ہی دلچسپ تھیں۔

عام طور پر ہمارے ہاں اندرونِ لاہور یا چھوٹے قصبوں میں ایسا ہوتا ہے کہ شام کے وقت چوراہوں میں بڑی تعداد میں نوجوان کھڑے ہو کر آپس میں گپ شپ کرتے ہیں، ایسا اب نئی آبادیوں میں نہیں ہوتا اور ان جگہوں پر اگر کوئی ایسا کرے تو لوگ اس کا برا مناتے ہیں لیکن پرانے محلوں میں کہیں نہ کہیں اس کا رواج اب بھی موجود ہے۔

میں نے دیکھا کہ مارکیٹ کے ایک طرف تقریباً دس بارہ نوجوان لڑکے، جن کی عمریں بیس پچیس سال کے لگ بھگ ہوں گیں اونچی آواز میں گپ شپ کر رہے تھے۔ اس طرح کا منظر میں نے بھارت میں بھی نہیں دیکھا تھا اس لیے اسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

یہ روایت پنجاب اور خاص طور پر پنجابی لوگوں میں بہت عام ہے کہ شام کے وقت وہ چوراہوں میں کھڑے ہو کر یا کسی پارک کے کونے میں بیٹھ کر اونچی آواز میں گپ شپ اور مذاق کرتے ہیں۔ ایسا ہی مجھے یہاں دیکھنے کو بھی ملا جو میں نے اب تک بھارت میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک طرح سے پنجابی کلچر کی نمائندگی تھی۔ ان لڑکوں میں اکثر سکھ تھے جو اپنے لباس سے پہچانے جا رہے تھے۔ میں دور کھڑا ہو کر ان کی باتیں سنتا رہا۔ وہ آپس میں مذاق کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ میں دور کھڑا ان کو باتوں کو سنتا رہا وہ میرے ہی لہجے میں، جس لہجے میں پنجابی میں بات کرتا ہوں، بات کر رہے تھے تو مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ منظر اب تک مجھے یاد ہے۔

وہ سب دیکھ کر مجھے اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ میں بھی لڑکپن میں اپنے محلے میں اس طرح کی ٹولی کا حصہ تھا۔ لاہور میں آ کر میں اس طرح کے کسی بھی ٹولے کا حصہ نہ بن سکا۔ اس لیے میں نے اس سے بہت زیادہ لطف اٹھایا اور اپنا بچپن یاد کیا۔ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے جس میں یہ کام اچھے لگتے ہیں۔

میں ایک اور بات کرنا چاہوں گا کہ اس طرح کی گپ شپ نا صرف تادیر قائم رہنے والی دوستیوں کو جنم دیتی ہے بلکہ اس سے اچھی تعلیم و تربیت بھی ہوتی ہے۔ بچوں کو یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ایک گروپ میں کھڑے ہو کر کیا بات کرنی ہے اور کس طریقے سے جواب دینا ہے؟ یہی وہ دوستیاں ہوتی ہیں جو عمر بھر کا ساتھ ہوتی ہیں۔ یہ



لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی ہوتے ہیں۔ اس طرح کی چھوٹی موٹی گپ شپ بچوں کے لیے بے حد مفید ہوتی ہے۔ جو لوگ کالونیوں میں رہتے ہیں، جہاں اس بات کا رواج ختم ہو گیا ہے، وہاں پر بچے اس طرح کے ماحول سے جو کچھ سیکھنا چاہیے وہ بھی سیکھ نہیں پاتے ہیں۔ اس لیے ہم انھیں ممی ڈیڈی بچے کہتے ہیں۔ اور وہ ممی ڈیڈی بچے دنیا کی گرمی سردی کا مقابلہ کرنے میں کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ میں والدین سے کہوں گا کہ انھیں اپنے بچوں کو مختلف لوگوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ ایک کھلے ماحول میں گپ شپ کا موقع دینا چاہیے تاکہ ان کے اندر حوصلہ پیدا ہو اور وہ یہ بھی جان سکیں کہ ایک گروپ میں کھڑے ہو کر کس طریقے سے بات کرتے ہیں۔ اگر وہ زیادہ وقت موبائل پر کارٹون دیکھنے میں گزاریں گے تو وہ کچھ سیکھ نہیں پائیں گے اور کارٹون ہی بن جائیں گے۔

اللہ کرے ایسا نہ ہو!

ہم ایک قریبی ریستوران میں چلے گئے، وہاں بہت رش تھا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ کی خاص ڈش کیا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ تندوری مچھلی، جو ہم تندور میں بناتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ پاکستان میں اس طرح سے سچی تو بنائی جاتی ہے لیکن مچھلی نہیں۔ ہم نے تندوری مچھلی کھائی۔ جس کا لطف ہی کچھ الگ تھا۔

ایک اچھی بات جو وہاں پر نظر آئی وہ پبلک مقامات پر شراب پینے پر پابندی تھی۔ پر مندر نے مجھے بتایا تھا کہ ہریانہ وہ پہلی ریاست ہے جس نے سرعام شراب پینے پر پابندی عائد کی تھی اور اسکی وجہ سے اسے ڈرائی اسٹیٹ بھی کہا جاتا تھا۔ شہر بھر میں سگریٹ کی کوئی دکان نہیں ملی۔ اس کی وجہ سکھوں کی سگریٹ سے شدید نفرت ہے۔ ان کے دھرم میں سگریٹ اور حقے کی سخت ممانعت ہے۔ ممانعت تو شراب اور گوشت کی بھی ہے لیکن اس کی اتنی پابندی نہیں کی جاتی جتنی سگریٹ کی کی جاتی ہے۔



Sikh Bangra

Photo Credit: Times of India

صبح ہماری واپسی تھی اور ہم نے واپس جانے کے لیے فتح گڑھ کا راستہ لیا۔  
 پر مندر، فتح گڑھ میں گردوارہ جانا چاہ رہا تھا۔ اور اس طرح مجھے سرہند میں اپنے آباؤ اجداد  
 کے گھر دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ فتح گڑھ میں کیا دیکھا، اس کی داستان انشاء اللہ اگلے صفحات  
 میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اب ہم پنجاب میں داخل ہو رہے تھے۔ اس لیے میں  
 ضروری سمجھتا ہوں کہ پنجاب کی ایک مختصر تاریخ بھی آپ کے سامنے پیش کروں۔

چندی گڑھ کے مشرق میں ڈیرہ دون، شمال مشرق میں شملہ، جنوب میں  
 کرنال اور دہلی، جنوب مغرب میں پٹیا، مغرب کی طرف لدھیانہ اور شمال میں ہوشیار  
 پور واقع ہیں اس طرح یہ شہر چاروں طرف سے بہت اہم شہروں کے درمیان گھرا ہوا  
 ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جگہ کو پنجاب کا کیپٹل بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

## پنجاب کی تاریخ: ایک اجمالی جائزہ

اب ہم چندی گڑھ سے موہالی کی طرف جارہے تھے۔ یہ دو جزواں شہر ہیں بالکل اسی طرح جیسے اسلام آباد اور راولپنڈی۔ موہالی پنجاب کا ایک ضلع ہے جبکہ چندی گڑھ ایک وفاقی علاقہ ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنے اگلے سفر سے متعلق کچھ بتاؤں، میں چاہوں گا کہ آپ کو پنجاب کی تاریخ سے روشناس کروایا جائے۔ ایسا کرنے سے آپ کو میرے اگلے سفر کی روداد سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے کا قدیم نام سپتہ سندھو تھا۔ سندھ، سندھو، ہندو، سدھو، یہ سب ایک جیسے ہی الفاظ ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق بھی ہو۔ اس نام کی وجہ اس علاقے میں بہنے والے سات بڑے دریا تھے۔

میں نے یہ جاننے کی بہت کوشش کی کہ پنجاب کا نام کیسے پڑا اور یہ واقعہ کب ہوا۔ کیونکہ پنجاب کا اصل نام تو سپتہ سندھو، سات دریاؤں کی سرزمین تھا۔ ایک تاریخ دان کا کہنا ہے کہ اصل زور سات پر تھا، جیسے سات آسمان، سات سمندر اور سات براعظم وغیرہ۔ اسی لیے اس علاقے کو سات دریاؤں کی دھرتی کہا جانے لگا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رامائن اور مہابھارت میں اس کا نام پنجانا لکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب بھی پانچ ندیوں کی سرزمین ہے۔ یہ پانچ دریا جہلم، چناب، راوی، ستلج اور بیاس مانے جاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پنجاب دلی سے پشاور تک تھا۔ اس میں تو دریائے سندھ بھی آتا ہے اور اس کے علاوہ سرسوتی دریا بھی اسی علاقے میں بہتا تھا، جو اب خشک ہو گیا ہے۔ یہاں دریائے گھاگھرا کا نام بھی سننے میں آتا ہے۔ میں بھی اصل بات جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور آپ بھی میری مدد کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب فارسی زبان کا ایک لفظ ہے جسے اس وقت رواج ملا جب غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ یہ بات کہاں تک درست ہے، معلوم نہیں۔

میں نے ایک مشہور ویب سائٹ [quora.com](http://quora.com) پر یہ سوال لکھا تو ایک صاحب کرشنا شرمانے اس کے جواب میں لکھا کہ پرانی کتابوں میں اس کا نام سپتہ سندھو ہی تھا، یعنی سات دریاؤں کی سرزمین۔ کچھ کتابوں میں اسے پنجناد، پنج ناد اور پنجند بھی لکھا ہوا ہے جو فارسی زبان میں پنجاب بن گیا۔ پاکستان میں بھی بہاولپور کے قریب پنجند نامی ایک مقام ہے جہاں سب دریا آ کر ملتے ہیں اور ایک دریا کی صورت میں سمندر تک جاتے ہیں۔ اس سے پہلے دریائے کابل، دریائے سندھ میں انک کے مقام پر ملتا ہے بیاس اور ستلج بھارت میں ہی مل جاتے ہیں راوی اور ستلج ملتان سے پہلے ایک ہو جاتے ہیں چناب اور جہلم جھنگ کے قریب تریموں کے مقام پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ پنجند کے مقام پر یہ سب ایک دریا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے بعد اسے دریائے سندھ ہی کہا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کا آغاز بلتستان کے علاقے سے ہوتا ہے۔ اس طرح یہ دریا بتیس سو کلومیٹر کا سفر طے کر کے بحیرہ عرب کا حصہ بن جاتا ہے۔

اس لیے پنجاب کے لفظ کی شروعات کو غزنوی کے حملوں کے وقت سے جوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی کہیں یہ نام تبدیل ہو گیا ہو۔ میں نے کہیں یہ بھی پڑھا کہ کسی دور میں متھرا کے علاقے میں ایرانی بھی حکومت کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب سکندر نے ایران کی فتح کے بعد ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کی فوج میں موجود ایرانی لوگوں نے ہی اسے پنجاب کا نام دیا ہو۔

میں نے اس سلسلے میں برادر امجد نواز وڑائچ صاحب سے بات کی۔ ان کا بھی یہ خیال تھا کہ پنجاب، پنج ناد یا پنجند کی ہی بگڑی ہوئی ایک شکل ہے۔ یہ کب ہوا، حقیقت تو معلوم نہیں لیکن ایک اندازہ ہے کہ یہ دسویں صدی عیسوی کے وقت کی بات ہو سکتی ہے۔

اسی طرح کچھ اور نام بھی ہیں جن کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ مثلاً افغانستان جو درانی دور میں اپنایا گیا۔ بلوچستان کا نام انگریزوں کے دور میں ایک ایسے علاقے کو دیا گیا جہاں بلوچ قوم کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں پنجون بھی رہتے تھے، صوبہ سرحد کا نام ایک ایسے علاقے کو دیا گیا جس میں پشتون کے ساتھ ساتھ ہند کو اور سرائیکی بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد آباد تھی۔

میں نے پنجاب کی تاریخ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے؛ قبل مسیح کا دور، پہلی صدی سے دسویں صدی تک، مسلمانوں کی آمد سے پہلے، مسلمانوں کی آمد کے بعد، غزنوی سے بہادر شاہ ظفر تک، انگریزوں کا دور حکومت اور تقسیم ہند کے بعد سے اب تک۔

یاد رہے کہ یہ سفر نامہ تاریخ کی کوئی کتاب نہیں ہے اس لیے اس میں اس طرح سے حوالے نہیں دیے جاسکتے جس طرح تاریخ کی کتابوں میں دیے جاتے ہیں۔ یہاں صرف ایک اجمالی خاکہ ہی پیش کیا جا رہا ہے تاکہ آپ اس علاقے سے روشناس ہو سکیں جس میں میں سفر کرنے جا رہا ہوں۔

## پنجاب قبل مسیح کے دور میں

اکثر تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ پنجاب میں انسانی آبادکاری کے ابتدائی سراغ دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع وادی سوان سے ملتے ہیں۔ یہ مڑپہ دور سے کہیں پہلے کا واقعہ ہے۔ مڑپہ تہذیب کا زمانہ تین سے چار ہزار سال پرانا ہے۔ اس کا دوسرا نام وادی سندھ کی تہذیب بھی ہے۔ اسے مڑپہ تہذیب کہنے کی وجہ مڑپہ میں سب سے پہلے اس کے آثار کا دریافت ہونا ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں اس تہذیب کے

اثرات پائے جاتے ہیں۔ مہرگڑھ بلوچستان، مونیجوداڑو، گجرات (بھارت)، چٹائی، مہاراشٹر اور ہریانہ کے علاوہ بھی کئی علاقوں میں اس تہذیب کے آثار ملے ہیں۔

ہڑپہ تہذیب کے بعد والے زمانہ کو ویدک دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کا تعلق پنجاب اور گنگا کے میدانی علاقوں سے جوڑا جاتا ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کچھ کا تعلق شمالی پنجاب سے بھی تھا۔ یہ دور بھی قبل مسیح کا دور ہے، اس دور میں بھی کئی اہم واقعات رونما ہوئے۔ دس بادشاہوں کی لڑائی، پانڈوؤں اور گوروں کی جنگ کی بنیاد پر مہابھارت میں ایک طویل نظم لکھی گئی۔ یہ سب جنگیں پنجاب کے مختلف علاقوں میں لڑی گئیں۔



India Before British Rule in 1806 Photo Credit:

<https://abhisheksharmagaur.medium.com>

اسی دور میں مہاتما بدھ کی پیدائش بھی ہوئی۔ ہندومت کا آغاز بھی اسی دور میں ہوتا ہے۔ ان دونوں مذاہب کے اثرات پنجاب کے علاوہ افغانستان، شمالی، وسطی

اور جنوبی ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی دور کے شہر اور درسگا ہیں بھی ملتی ہیں۔ جن میں ٹیکسلا یونیورسٹی ایک اہم درسگاہ گردانی جاتی ہے۔ اشوک کے کتبے جنوبی ہندوستان سے گلگت تک پائے گئے ہیں۔

326 قبل مسیح میں سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کا وہ حملہ بھی پنجاب کے علاقے پر ہی تھا۔ وہ پنجاب سے ہی واپس چلا گیا۔ اس نے ہندوستان پر حملہ کیوں کیا؟ وہ ایک طویل داستان ہے۔ راجہ پورس کے ساتھ جنگ میں کون جیتا کون ہارا؟ وہ بھی ایک الگ کہانی ہے لیکن ایک بات واضح ہے کہ سکندر کا حملہ پنجاب تک ہی محدود رہا۔



King Ashoka Photo Credit: <https://www.patnabeats.com>



ALEXANDER THE GREAT BATTLES PORUS  
PHOTO CREDIT: <https://factsanddetails.com>

## موریہ سلطنت

قبل مسیح دور سے تین صدیاں قبل ہندوستان میں موریہ خاندان نے بھی حکومت کی۔ تاریخ میں اس بارے میں کئی طرح کی باتیں درج ہیں۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ چندرگپتا موریہ نے 321-297 قبل مسیح کے دوران شمالی ہندوستان، جس میں افغانستان کا کچھ حصہ بھی شامل تھا پر حکومت کی۔ گپت موریہ کو اس سلطنت کا بانی بھی سمجھا جاتا ہے۔ پنجاب کا علاقہ اس کی سلطنت کا ایک اہم علاقہ تھا۔ تاریخی کی کتب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس نے ہندوستان میں ایک بڑے علاقے پر حکمرانی کی وہ اپنے دور کی سب سے بڑی سلطنت کا بادشاہ تھا۔

## پنجاب: پہلی صدی عیسوی سے دسویں صدی عیسوی تک

گپتا (اسے گپتہ بھی لکھا جاتا ہے) سلطنت بھی ایک قدیم ہندوستانی سلطنت تھی جو موریہ سلطنت کے بعد قائم ہوئی اور چھٹی عیسوی تک جاری رہی۔ ہندوستان کا



ایک وسیع علاقہ اس کے ماتحت تھا۔ گپتا خاندان کی سلطنت میں پنجاب بھی شامل تھا۔ اب تک کی تحریر سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان پر جس نے بھی حکومت کی اس کے لیے پنجاب ایک اہم علاقہ تھا۔

میں نے اب تک جو بھی پڑھا ہے اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں ہو کہ دسویں صدی عیسوی تک وہ دور ہے جس میں ہندومت نے بہت ترقی کی۔ اس وقت بدھ مت بھی موجود تھا جس کی ابتدا چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوئی۔ اشوک کے دور میں ہندوستان کے علاوہ بھی کئی علاقوں سے بدھ مت کے آثار ملتے ہیں جن میں کتبوں کے علاوہ بت بھی ہیں۔ جس سے یوں لگتا ہے کہ اس دور میں بدھ مت کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی۔ پنجاب کے علاقوں میں بھی بدھ مت کے آثار ملتے ہیں۔ ٹیکسلا یونیورسٹی اور پشاور کے قریب تخت بھائی، کے علاوہ بھی کئی جگہوں پر بدھ مت کے آثار کا ہونا اس بات کا ثبوت ہیں۔

اس ایک ہزار سال میں ہندوستان میں ہندومت ہی ایک غالب مذہب تھا۔ ہندوازم کے علاوہ کوئی بھی مذہب نظر نہیں آتا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں دو اور مذاہب، بدھ مت اور جین مت بھی تھے، لیکن ان کے ماننے والوں کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں تھی۔

یہی وہ دور تھا جب ہندوستان کے طول و عرض میں بہت سی ہندو ریاستیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پشاور میں بھی ہندو راج ہی تھا، بنگال میں بھی ہندو ہی حکمران تھے، جنوبی ہند میں بھی ہندو ہی حاکم تھے لیکن یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ گپتا خاندان کے زوال کے بعد کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کی وہ طاقت نہیں رہی جو مور یہ یا گپتا خاندان کے دور میں تھی۔ اسی دور میں ہندوستان کو سونے کی چڑیا بھی کہا جاتا تھا۔

گپتا سلطنت کے زوال کے بعد شمالی ہندوستان پر متعدد آزاد ریاستوں کی حکومت تھی۔ ان میں قانون کے راجے بھی شامل تھے۔ ہر شاخاندان شمالی ہندوستان کا حاکم تھا، جس میں پنجاب بھی شامل تھا۔ اسی طرح کئی خاندان جنوبی ہندوستان پر بھی قابض تھے اور ان کی آپس میں جنگیں بھی ہوتی تھیں، لیکن زیادہ تر سب اپنے اپنے علاقوں میں امن سے ہی رہ رہے تھے۔

میں ایک اور بات بھی آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ ساتویں صدی میں جب اسلام کا آغاز ہوا اور آٹھویں صدی تک اس کے اثرات ایران اور موجودہ افغانستان تک ہی پہنچے تو اس وقت تک عیسائیت کا بھی ہندوستان میں کوئی نشان نہیں تھا۔ ایسے میں ہندوستان بھر میں صرف ہندو ہی رہتے تھے۔ شمالی ہندوستان، خاص طور پر پنجاب کے علاقے ہندوؤں کے گڑھ تھے۔ اس ایک ہزار سال کے دوران ہندوستان پر کسی بھی غیر ملکی نے بھی حملہ نہیں کیا۔ وہ لوگ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی شکل میں رہتے تھے اور انھیں کے اندر بے شمار مندر بھی بنا رکھے تھے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس وقت تک سکھ مذہب کا بھی آغاز نہیں ہوا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق، جو ممکن ہے درست نہ ہو، وہ ہزار سال کا ایسا دور تھا جب ہندوستان میں بے حد امن تھا۔ یاد رہے آٹھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے ایک چھوٹے سے علاقے سندھ پر ایک حملہ ضرور ہوا تھا لیکن مسلمان حملہ آور سندھ سے آگے ہندوستان کے کسی اور علاقے کی طرف نہ جاسکے۔ انھیں ہندوستان میں موجود ہندو ریاستوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

نویں صدی کے وسط میں ہندو شاہی خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا جس کا دائرہ کابل تک پھیلا ہوا تھا اور دوسری طرف اس کی سرحد چناب تک پھیلی ہوئی تھی۔ بعد ازاں

یہ ریاست بھی تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر کر کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی۔



Mauryan Empire Photo Credit: <https://www.clearias.com>



Gold Coin during Gupta Empire Photo Credit:  
[https://en.wikipedia.org/wiki/Chandragupta\\_II](https://en.wikipedia.org/wiki/Chandragupta_II)

### تیسرا دور: غزنوی سے بہادر شاہ ظفر تک

ہندوستان بالخصوص پنجاب کا تیسرا دور وہ ہے جب مشرق کی طرف سے مسلمان حملہ آوروں نے پنجاب پر حملہ کیا اور اسے فتح کرنے کے بعد شمالی، وسطی، جنوبی اور مشرقی ہندوستان کے علاقوں پر حکمرانی کا آغاز کر دیا جس کی ایک مختصر تاریخ پیش خدمت ہے۔

اس دور کا پہلا حملہ آور محمود غزنوی ہے جس نے پہلی مرتبہ کوہہ ہندو کش کے پہاڑوں کو عبور کیا اور 1001ء میں پشاور کی لڑائی میں بے پال کو شکست دے کر دریائے سندھ کے شمال میں ہندو شاہی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے چند سال بعد 1006ء میں محمود نے جنوبی پنجابی میں واقع ملتان پر حملہ کیا اور یہاں پر موجود اسماعیلی

آبادی کا قتل عام کرنے کے لیے واپس آیا۔ اس نے سترہ بار ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس نے ہندو شاہی کا خاتمہ کر دیا اور یوں پہلی مرتبہ پنجاب کسی مسلمان کے تحت آگیا۔

وہ خود تو مستقل طور پر ہندوستان میں نہ رہا، کیونکہ اسے وسطی ایشیاء پر بھی حملہ کرنے ہوتے تھے، اس کی بجائے اس نے پنجاب میں اپنے گورنر ضرور مقرر کیے۔ اس لیے یہ کہنا کہ غوری وہ پہلا حکمران تھا جس نے ہندوستان میں اسلامی ریاست قائم کی اس لحاظ سے تو درست ہے کہ اس نے دلی میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے پہلے غزنوی پنجاب کو فتح کرنے کے بعد اس علاقے میں جو افغانسان سے ملحق تھا، مسلمان حاکم مقرر کر چکا تھا۔ میں اسے پنجاب، خاص طور پر مغربی پنجاب، جو اس وقت ہندوستان کا ایک اہم حصہ تھا جہاں ہندو عرصہ دراز سے حاکم چلے آ رہے تھے، میں مسلمانوں کی حکومت کا آغاز سمجھتا ہوں۔ سوائے چند سال کے، جب لاہور پر سکھوں کی حکومت تھی، پچھلے ایک ہزار سال سے یہاں کے حکمران مسلمان ہی رہے۔ حتیٰ کہ انگریزوں کے دور میں جب جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں تب بھی ایک مسلمان ہی وزیر اعلیٰ تھا۔

محمود کے حملوں کے تقریباً دو سو سال بعد شہاب الدین غوری نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس نے پرتھوی راج چوہان کو شکست دینے کے بعد پنجاب کے ساتھ ساتھ دہلی اور دوسری طرف ملتان تک کے علاقوں میں اپنی ریاست کو وسعت دی۔ اس نے ہندوستان میں ایک بڑے حصے پر پہلی مسلمان ریاست کی بنیاد رکھی۔ شہاب الدین غوری اور اس کے بعد میں قائم ہونے والی ریاستوں کو سلاطین دہلی کے نام سے جانا جاتا ہے۔



Statue of Ghiyath al-Din Muhammad in Dushanbe Photo  
Credit: <https://en.wikipedia.org>



Mahmood Ghazwi Tomb in Ghazni Photo Credit:  
<https://archive.org>

خلجی خاندان دہلی سلطنت کا دوسرا خاندان تھا۔ اس کی حکومت 1290ء سے 1320ء تک قائم رہی۔ بعد ازاں تغلق خاندان پنجاب سمیت ہندوستان کے کئی علاقوں پر حکمران رہا۔ پھر ایک وقت آیا جب 1398ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس وقت دہلی پر تغلق خاندان کے سلطان ناصر الدین محمود شاہ تغلق کی حکومت تھی۔ دہلی اور جنوبی پنجاب کے علاقوں کی تباہی کے بعد تیمور واپس چلا گیا۔ اس سے تغلق خاندان کی حکومت کو شدید دھچکا لگا۔

آخری تغلق حکمران ناصر الدین محمود کی موت کے بعد کئی علاقوں کے گورنروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس دوران کئی جنگیں بھی ہوئیں۔ جن کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بابر نے پانی پت، جو کہ پنجاب کا ایک اہم علاقہ تھا، میں لودھی کو شکست دے کر 1526ء میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اپنا پایہ تخت دہلی کو بنایا جبکہ ان کی دوسری راج دھانی لاہور تھا۔ اور گلزیب کی وفات تک مغلیہ سلطنت کا عروج قائم رہا اور اس کے بعد اس میں کمزوری واقع ہونا شروع ہو گئی اور 1857ء میں مغل، 331 سال تک ہندوستان کے ایک وسیع علاقے پر حکمرانی کر کے تاریخ کا حصہ بن گئے۔

مغلیہ سلطنت کے آخری سالوں میں چھ طاقتوں نے جنم لیا؛ مراٹھا، راجپوت، جاٹ، سکھ، انگریز اور مغلیہ سلطنت کے سابقہ مقامی حکمران جنہوں نے مرکز کو کمزور ہوتے دیکھ کر خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ ان سب نے مل کر مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کیا اور مغلیہ سلطنت کی بندر بانٹ کی۔ جو بھی جس کسی کے حصہ میں آیا اس نے اس پر قبضہ کر لیا۔

مغلیہ سلطنت کے آخری سالوں میں نادر شاہ نے بھی اس کی تباہی میں اپنا حصہ ڈالا۔ مغلیہ سلطنت کے حکمران مسلمان تھے اور اس کی تباہی مسلمانوں کی تباہی سمجھی جا رہی

تھی۔ ایسے میں ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی درخواست پر احمد شاہ ابدالی نے مراٹھوں اور سکھوں کے ساتھ جنگیں لڑیں، لیکن وہ مغلیہ سلطنت کو بچانے میں ناکام رہا۔

مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں سکھوں کی طاقت میں بے حد اضافہ ہوا۔ وہ پنجاب میں ایک بڑے علاقے پر قابض ہو گئے۔ رنجیت سنگھ نے 1799ء میں لاہور پر قبضہ کر کے ایک سکھ ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے بھی کئی سکھ ریاستیں موجود تھیں لیکن رنجیت سنگھ نے ان سب کو ملا کر ایک بڑے علاقے کو اپنے ماتحت کر لیا۔ اسی کے دور میں سکھوں کا اثر و رسوخ ہندوستان کی سرحد سے باہر افغانستان تک جا پہنچا۔ پھر ایک وقت آیا جب سکھوں کو بھی زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ پنجاب کی تاریخ کا تیسرا حصہ تھا۔

## پنجاب کے چوتھے حکمران: انگریز

رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھوں کو بھی زوال آ گیا۔ پہلی مرتبہ رنجیت سنگھ کے جانشینوں نے دربار کو بچانے کے لیے انگریزوں سے معاہدہ کیا اور یوں انگریز لاہور آئے۔ انگریزوں کی آخری جنگ 1849ء میں گجرات میں سکھوں سے ہوئی جس میں سکھوں کو شکست ہو گئی اور پنجاب برٹش انڈیا کا حصہ بن گیا۔ اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی۔ وہ سفر جو انگریزوں نے ہندوستان کے جنوبی ساحل سورت سے 24 اگست 1608ء کو شروع کیا تھا اسے لاہور تک پہنچنے میں 241 سال لگے۔ اس عرصے میں وہ ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر بلواسطہ یا بلاواسطہ اپنے دوستوں، ریاستوں کے راجاؤں کے ذریعے قبضہ کر چکے تھے۔ پنجاب ان کے راستے کی آخری رکاوٹ تھا اور اسے بھی انھوں نے پار کر لیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ملکہ وکٹوریہ کے جاری کردہ فرمان کے تحت ہندوستان، برطانیہ کی براہ راست حکمرانی کا ایک اہم حصہ بن گیا۔



پنجاب میں انگریزوں کے نوے سالہ دورِ حکومت میں جہاں یہ ایک طرف معاشی طور پر ہندوستان بھر میں ایک امیر ترین زرعی علاقہ بن گیا بلکہ کئی ایسے کام بھی شروع کیے گئے جن کے دور رس نتائج نکلے، جیسے نہری نظام، صوبوں کی حد بندی، ضلعی نظام، تعلیم کا نظام، عدالتوں کا قیام، فوجداری، مالی قوانین کا نفاذ اور اس طرح کے کئی دیگر اقدامات بھی انھی کے دور میں اٹھائے گئے۔ ایسا کام بھی کیا گیا جس کی توقع کرنا کافی مشکل تھا۔ وہ پنجاب سے انگریزوں کی فوج میں بڑے پیمانے پر بھرتیاں تھیں۔

شمالی ہندوستان، خاص طور پر پنجاب ایک مدت سے جنگوں کا میدان رہا ہے اور اس لیے اس علاقے کے لوگ جنگ و جدل کے عادی تھے۔ انگریزوں نے ان کی اس عادت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی تعداد میں پنجاب کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا اور انھیں پوری طرح جنگوں میں استعمال کیا۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں کی سات لاکھ کی فوج میں سے ساڑھے تین لاکھ کا تعلق پنجاب سے تھا۔ اتنے فوجی انھیں کسی اور علاقے سے نہیں ملے اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

بھوک، جنگ کا شوق یا پھر ایسا زبردستی کیا گیا!

میں نے کئی جگہ پڑھا کہ مقامی نمبر داروں اور دیگر عہدیداروں کی وجہ سے لوگوں کو زبردستی بھرتی کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بڑے بتاتے تھے کہ جنگِ عظیم اول کے وقت میرے دادا جناب کرم الہی مانگٹ کی عمر تقریباً بیس سال تھی، اس وقت وہ اپنے خاندان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ انھیں جبری بھرتی سے بچانے کے لیے کئی دن تک بھوسے والے ایک کمرے میں بند رکھا گیا۔ جناب اکرم رانجھا صاحب نے بھی اس طرح کی جبری بھرتی سے متعلق کئی واقعات کا ذکر کیا ہے۔

میں نے اپنے ایک رشتے دار سے پوچھا، جو انگریز فوج سے ریٹائرڈ ہوئے تھے کہ وہ کیوں فوج میں بھرتی ہوئے تھے؟ ان کا جواب تھا کہ فصل باڑی اتنی اچھی نہیں تھی اور نوکری مل نہیں رہی تھی۔ اس وقت فوج کی نوکری کو ہی سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح میرے سگے ماموں اور میری والدہ کے دو کزن بھی انگریز فوج میں تھے۔ انھوں نے برما کے محاذ پر انگریزوں کی خاطر جنگ بھی لڑی۔ یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی ایک وجہ سے نہیں بلکہ کئی ساری وجوہات کے باعث آدمی سے زائد انگریز فوج پنجابی لوگوں پر مشتمل تھی۔

اب بھی صورتحال کچھ ایسی ہے، پاکستان اور بھارت کی فوج میں اکثریت اب بھی پنجاب کے لوگوں کی ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ پنجاب کے لوگ فوج میں بھرتی ہونا پسند کرتے ہیں؟

میرے نزدیک، اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ علاقے صدیوں سے جنگی حالات سے گزرتے چلے آ رہے ہیں، اسی وجہ سے ان کا مزاج بھی جنگی ہی بن گیا ہے۔

اس کے علاوہ انگریزوں نے مواصلات اور نقل و حمل کے ذرائع، ڈاک کا نظام، ریلوے، سڑکیں اور ٹیلی گراف وغیرہ کے نظام کی بنیاد بھی ڈالی اور نئے شہر آباد کیے۔ وہ اس زر خیز خطے کے تنہا مالک تھے۔ انھوں نے وسائل کا ایک کثیر حصہ اپنے پاس خود رکھا۔



In October 1831, Rupnagar (Ropar) on the banks of Sutlej witnessed a historic meeting between Maharaja Ranjeet Singh and Lord William Bentinck, the Governor General of Indian



FALL OF SIKH EMPIRE 29th MARCH 1849. Black Day of Punjab History Photo Credit: <https://aestheticstime.com>

سرجان لارنس کو 1 جنوری 1859 کو پہلا پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ وہ پنجاب کے تمام تر معاملات کا ذمہ دار تھا۔ اس وقت پنجاب کا علاقہ 29 اضلاع پر مشتمل تھا جسے پانچ ڈویژنز میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یاد رہے اس وقت پنجاب میں 43 ریاستیں بھی شامل تھیں جن کا الحاق انگریزوں کے ساتھ تھا۔

انگریزوں نے 1885ء میں پنجاب کی بنجر اراضی، جو کہ 60 لاکھ ایکڑ پر مشتمل تھی کو قابل کاشت زرعی اراضی میں تبدیل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کے لیے نہری نظام کا آغاز کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں زرعی انقلاب برپا ہوا اور صوبے میں کئی نئے شہر بھی آباد ہوئے جیسے لائل پور، سرگودھا اور منٹگمری (ساہیوال)۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی زرعی اصلاحات بھی کی گئیں۔ جن میں سے کچھ کی بے حد مخالفت بھی ہوئی۔

یہ ایک الگ داستان ہے جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ موقع ملے تو ضرور پڑھیں۔

انگریزوں نے جیسے ہی پنجاب کے تخت پر قبضہ کیا تو انھوں نے 1855ء میں پنجاب کی مردم شماری کی۔ جس کے مطابق صرف برطانیہ کے ماتحت علاقوں تھے کی آبادی پونے دو کروڑ تھی، اس میں ریاستوں میں بسنے والے لوگ شامل نہیں تھے۔ بعد ازاں 1881ء میں بھی مردم شماری کا انتظام کیا گیا۔ آبادی کا رجحان صرف چند اضلاع تک تھا اور اسے کم کرنے کے لیے نئے علاقے آباد کیے گئے۔ اس کی ایک مثال فیصل آباد ہے جہاں امرتسر، گورداس پور، جالندھر، ہشیار پور، لدھیانہ، انبالا اور سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو زمینیں الاٹ کی گئیں۔ اس طرح ایک بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی جن میں ہندوؤں اور سکھوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی، یہ بیسویں صدی کے آغاز کا واقعہ ہے۔ صرف چالیس سال بعد، تقسیم ہند کے موقع پر ہندوؤں اور سکھوں کو

پھر واپس انھی علاقوں میں جانا پڑا جہاں سے انھوں نے اپنی مرضی سے نقل مکانی کی تھی

---

اس بار انھیں جان بچا کر جانا پڑا۔ جو چالیس سال میں کمایا وہ سب کچھ گنوا کر!

1941ء کی مردم شماری کے مطابق متحدہ پنجاب میں مسلمان آبادی کا 54

فیصد، ہندو 29 فیصد، سکھوں کی تعداد آٹھ فیصد جبکہ عیسائی آبادی کا دو فیصد تھے۔ اس وقت پنجاب کی حدود، مشرق میں دہلی، شمال میں کانگڑہ، جو اب ہماچل پردیش کا حصہ ہے، مغرب میں انک اور جنوب میں ڈیرہ غازی خان تک تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں واقع تمام ریاستیں بھی پنجاب کا حصہ تھیں۔

پنجاب برطانوی ہندوستان کا ماڈل زرعی صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب یہ ہندوستان میں پیدا ہونے والی کل روٹی کی فصل کا دسواں حصہ پیدا کرتا تھا اور گندم کی پیداوار میں اس کا تہائی حصہ تھا۔ اسی بات کے پیش نظر 1906ء میں لائل پور میں پنجاب زرعی کالج اور ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا۔

یہ سب کیسے ہوا؟ وہ ایک طویل داستان ہے۔ پنجاب کو ایک صنعتی علاقہ بنانے کی بجائے زرعی صوبہ کیوں بنایا گیا؟ اس میں پیدا ہونے والی گندم کی کس کو ضرورت تھی، کون یہاں کی کپاس کا خریدار تھا، مانچسٹر کی کس مل کو یہاں کی روٹی درکار تھی؟ ایسے بہت سے سوالات ہیں جو جواب مانگتے ہیں۔ کوئی تو ہو گا جو ان کے جوابات تلاش کرے گا۔

"میں نہیں تو کوئی اور سہی۔"

دنیا میں ریل ایجاد ہو چکی تھی اور انگریزوں کو اس کا وسیع تجربہ تھا۔ انھوں نے پنجاب میں ریل کا آغاز کیا۔ 1862ء میں ریلوے کا پہلا سیکشن لاہور اور امرتسر کے

درمیان تعمیر کیا گیا، لاہور اور امرتسر چھاؤنی کو ملانے کے لیے لاہور جکشن ریلوے سٹیشن کی تعمیر کی گئی، پھر 1870ء میں اس سیکشن کو دہلی تک لے جایا گیا۔ اس سے پہلے کراچی سے کوٹری تک ریل کا آغاز ہو چکا تھا۔ یاد رہے کہ ہندوستان میں پہلی مسافر ٹرین 1853ء میں ممبئی میں شروع کی گئی تھی

1854ء میں محکمہ تعلیم پنجاب کا قیام عمل میں لایا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ تعلیمی اداروں میں سیکولر نظام تعلیم کو یقینی بنایا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ چونکہ پنجاب میں چار مذاہب، ہندومت، اسلام، سکھ مذہب اور عیسائیت ہیں لہذا انصاب سیکولر ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم نافذ کیا گیا کہ سرکاری امداد صرف ان ہی نجی طور پر چلنے والے اداروں کو دی جائے گی جو سیکولر تعلیم کا بندوبست کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام تر امداد یورپی انتظامیہ کے تحت چلنے والے اداروں کو دی جانے لگی اور یوں سرکاری سرپرستی میں ایک مذہبی شناخت رکھنے والے ملک میں سیکولر تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ اس اسکیم کے تحت کئی اداروں کی بنیادیں رکھی گئیں لیکن اس سے وہ لوگ خوش نہیں تھے جو اپنے بچوں کو دنیاوی کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دینا چاہتے تھے۔ ان میں سب مذاہب کے لوگ ہی شامل تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کو سرکاری اور نجی اداروں میں بھیجا بند کر دیا اور اس کا حل یہ نکالا کہ انھوں نے اپنے تعلیمی ادارے قائم کر لیے۔

اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے 1886ء میں آریہ سماج نے لاہور میں ایک کالج کھولا، سکھوں نے بھی خالصہ کالج کھولا اور مسلمانوں نے بھی کئی تعلیمی اداروں کی داغ بیل ڈالی۔ سرکار نے اپنی وفاداروں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے کئی ادارے قائم کیے جن میں ایک مثال ایچی سن کالج لاہور بھی ہے۔

پنجاب کی سرکاری زبان کونسی ہو؟ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ انگریزوں کے مکمل قبضے سے پیشتر پنجاب کے علاقوں میں فارسی ایک سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی

جسے انگریزوں نے 1837ء میں ختم کر دیا اور اس کی جگہ کئی مقامی زبانوں کو جگہ دی گئی۔ یاد رہے کہ سکھ سلطنت میں فارسی ہی سرکاری زبان تھی۔ پنجاب کے انگریزوں سے الحاق کے بعد زبان کے انتخاب کے سلسلے میں مغربی پنجاب میں واقع ڈویژنز کے عہدیداروں نے فارسی کی سفارش کی جب کہ مشرقی پنجاب کے عہدے داروں نے اردو کے حق میں رائے دی۔ جس کے نتیجے میں پنجاب میں دوزبانوں کی پالیسی رائج ہوئی۔ اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوا اور 1854ء میں دوزبان پالیسی ختم کر دی گئی اور اردو کو صوبے بھر میں سرکاری زبان کی حیثیت سے اپنایا گیا۔ ایسا کیوں ہو؟ اس کی کئی وجوہات تھیں۔

اس وقت بھی پنجابی اور ہندی صوبے کی اکثریت کی زبان تھی لیکن ان دونوں کو رد کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ یہ دونوں بازاری زبانیں ہیں۔ ان زبانوں میں تعلیم نہیں دی جاسکتی، بعد میں یہ بات غلط ثابت ہوئی۔ آج بھی پنجابی، پنجاب میں اور ہندی، ہریانہ میں سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج ہیں۔ آخر کار اردو کو پنجاب کی سرکاری زبان کے طور پر اپنایا گیا جس پر کافی لوگوں نے احتجاج بھی کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو نا تو پنجاب کی اکثریت کی زبان ہے اور نہ ہی اس علاقے کی کوئی قدیم زبان ہے اور تو اور کوئی مذہبی زبان بھی نہیں ہے لیکن نافذ کرنے والوں نے ان سب باتوں کو رد کر دیا اور ایک ایسی زبان کو پنجاب کی سرکاری زبان بنا دیا جس کا بولنے والا خال خال ہی ملتا تھا۔ اردو کے حق میں جو سب سے بڑی دلیل دی گئی وہ کچھ یوں تھی کہ ایسا کرنے سے انگریزوں کو اردو بولنے والے علاقوں سے ایسے لوگ آسانی سے مل جائیں گے جو پنجاب کے سرکاری کاموں میں انگریزوں کے مددگار ہوں گے یعنی سرکاری افسران۔

اس طرح پنجاب کی اشرافیہ اور سرکاری افسران میں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہو گئی اور پنجابی اور ہندی بولنے والے اپنے ہی علاقے میں سرکاری ملازمتوں سے

محروم کر دیے گئے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک اہل پنجاب نے اردو کو اپنا نہیں لیا۔ اردو اعلیٰ طبقے کی زبان کے طور پر پنجاب میں رائج ہو گئی اور ایک طرح سے اردو بولنے والے لوگ پنجاب کے حاکم بن گئے۔ تمام تر سرکاری محکموں میں اردو بولنے والے ہی اکثریت میں تھے۔ مسلم لیگ میں قیادت بھی انھی اردو بولنے والوں کی تھی۔ اس طرح تحریک پاکستان میں بھی یہی لوگ پیش پیش تھے۔

پنجاب کا بااثر طبقہ انگریزوں کے ساتھ تھا اور وہ یونینسٹ پارٹی کا حصہ تھے۔ کسانوں اور درمیانے طبقے کے لوگ (مسلمان، ہندو اور سکھ) کانگریس کے حامی تھے۔ سبھی ہندو کانگریس کی حمایت میں تھے۔ البتہ ان کے ساتھ ساتھ بہت سے سکھ اور مسلمان بھی کانگریس کے ہی حامی تھے۔ سکھوں نے اکالی تحریک میں شمولیت اختیار کر رکھی تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت نے مسلم لیگ کی حمایت بھی کر رہی تھی۔

تقسیم ہند کا ایک بڑا واقعہ تقسیم پنجاب تھا۔ اس کام کے لیے پنجاب اسمبلی کے کئی اجلاس ہوئے۔ ان کا یہ فیصلہ تھا کہ پنجاب بھی تقسیم ہونا چاہیے سو ہو گیا۔

تقسیم پنجاب کا فائدہ کسے ملا، کس کا قد اونچا ہوا، پنجاب کی سیاسی طاقت کے ٹکڑے کر کے کس کے مقاصد پورے ہوئے، سکھوں نے ہندوؤں کا ساتھ کیوں دیا؟ اس بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لکھا جاتا رہے گا۔ میرے خیال میں تقسیم ہند کے منصوبے میں تقسیم پنجاب کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو پھر بھی انتقال آبادی کی کوئی تجویز سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ کس نے ہجرت اور نقل مکانی کی فضاء پیدا کی، کون تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی کا ذمہ دار ہے، کون بیس لاکھ لوگوں کا قاتل ہے؟

کوئی تو ہے، جس کے سرخون ہے!

لوگوں کو بچ جانے کا موقع مل رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ سچ کا پتہ چلنے کے بعد ممکن ہے کئی ایسے مجسمے گراں پڑیں جنہیں لوگوں نے اب تک چوراہوں میں سجا رکھا ہے



اور ممکن ہے جب لوگوں کو اصلیت کا علم ہو تو کئی مقامات اور اداروں کے نام بھی بدلنے پڑیں۔

ایسا ہو سکتا ہے اور دنیا میں بے شمار مقامات پر ہوا بھی ہے۔

## پنجاب کی پہلی صوبائی کونسل اور اسمبلی

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء کے ہندوستان بھر ایک نیا نظام میں متعارف کروایا گیا۔ جس کے مطابق 1921ء میں پنجاب کی پہلی قانون ساز کونسل کیا قیام عمل میں آیا۔ اس کونسل میں ستر فیصد لوگ منتخب ہو کر آتے تھے بلکہ باقی تیس فیصد انگریزوں کے نامزد کردہ ہوتے تھے۔ مختلف ادوار میں انگریزوں کے علاوہ سر عبدالقادر، سر شہاب الدین ورکٹ اور سر چھوٹو رام اس کے سربراہ رہے۔ 1935ء میں نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا اس کے تحت صوبائی خود مختاری میں اضافہ کیا گیا اور براہ راست انتخابات کا طریقہ متعارف کروایا گیا اور یوں پنجاب قانون ساز کونسل کی جگہ پنجاب قانون ساز اسمبلی نے لے لی جس کے سربراہ کو اسپیکر کہا جاتا تھا۔

پہلا الیکشن 1937ء میں ہوا جس میں یونینسٹ پارٹی کو فتح حاصل ہوئی۔ اس پارٹی کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے پہلے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان تھے جبکہ تقسیم ہند کے آخری وزیر اعلیٰ سردار خضر حیات ٹوانہ تھے۔ انگریزوں نے سرکاری طور پر پنجاب کا جو نشان اپنایا اس میں پانچ دریا دکھائے گئے جن سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ ایک خوبصورت بامعنی لوگو محسوس ہوتا ہے۔

پنجاب میں انگریزوں کے دور کا ایک اہم واقعہ 1919ء میں جلیانوالہ باغ میں عام لوگوں کا قتل عام ہے۔ اس واقعے میں ہلاکتوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی زائد ہے۔ انگریزوں کے خلاف جنگی کاروائیاں کرنے میں پنجاب سب سے آگے تھا۔ اس سلسلے

کے اہم نام بھگت سنگھ، اس کے ساتھی سکھ دیو اور راج گورو ہیں۔ ان پر دہلی میں قانون ساز اسمبلی پر بم دھماکے کا الزام بھی تھا۔ اس جرم میں ان تینوں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔



Group Photo of Member of Punjab Provincial Assembly in 1937, Photo Credit: <https://en.wikipedia.org>

## تقسیم پنجاب: ایک سانحہ

تقسیم پنجاب کے بعد ایک حصہ ہندوستان کے پاس، جسے مشرقی پنجاب بھی کہا جاتا ہے اور دوسرا حصہ پاکستان کے پاس، جسے مغربی پنجاب بھی کہتے تھے آگیا۔ اب دونوں کو پنجاب ہی کہا جاتا ہے۔ اس طرح ایک ہی نام کے دو صوبے دو مختلف ملکوں میں موجود ہیں جو شاید کہیں اور نہ ہوں۔

میں اس وقت بھارتی پنجاب میں سفر کر رہا ہوں اس لیے اسی کی تفصیل سے آگاہ کرنا چاہوں گا۔ میں نے پچھلے صفحات میں متحدہ پنجاب کی ایک مختصر تاریخ آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ یہ پنجاب کی تاریخ کا پانچواں حصہ ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو پنجاب (بھارتی پنجاب) سے متعلق کچھ بتاؤں میں آپ کی ایک غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں جو پنجاب اور ہماچل پردیش کے بارے میں

ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پنجاب کو تقسیم کر کے ہماچل پردیش بنایا گیا تھا جب کہ اصل بات مختلف ہے۔

موجودہ ہماچل پردیش ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ اس پر صدیوں سے مقامی لوگ ہی حکومت کرتے آئے ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستان کی آزادی سے قبل ہماچل پردیش کو، جو پہلے سے ہی ایک الگ علاقے کے طور پر موجود تھا اور کبھی بھی پنجاب کا حصہ نہیں رہا تھا کو انتظامی طور پر پنجاب کے ساتھ ملایا تھا، بالکل اسی طرح جیسے گلگت اور کشمیر کے کچھ علاقے پنجاب کے ساتھ منسلک تھے۔ یہ سب انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد 1966ء میں پنجاب کے کچھ پہاڑی علاقوں کو ہماچل پردیش میں ضم کر دیا گیا اور بالآخر 1971ء میں اسے مکمل ریاست کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ میں نے دہلی میں ایک ریسٹوران پر لگا ہوا ایک نقشہ دیکھا جس کے مطابق پنجاب کی ایک سرحد دہلی سے پشاور تک اور دوسری طرف جموں سے سندھ کی سرحد تک تھی۔ اس کے علاوہ اس میں ہماچل پردیش اور گلگت کے علاقے بھی شامل تھے۔ میں نے جب اسے جاننے کی کوشش کی تو مجھے جو بات سمجھ آ گئی، ممکن ہے درست نہ ہو، وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

پنجاب کی مشرقی سرحد دہلی تک اور مغربی سرحد دریائے سندھ پر واقع اٹک تک ہے۔ شمال میں اس کی سرحد ہماچل پردیش اور جموں کے علاقے تک تھی جبکہ جنوب میں اس کی سرحد ڈی جی خان اور سندھ کی سرحد تک تھی۔ تاریخی طور پر پشاور کبھی بھی پنجاب کا حصہ نہیں رہا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ انگریزوں نے انتظامی نقطہ نظر سے پشاور اور اس کے ساتھ ساتھ کئی علاقوں کو پنجاب کا نام دے رکھا، لیکن جیسے ہی حالات بہتر ہوئے تو ان علاقوں کو الگ کر دیا گیا۔ میرے خیال میں پنجاب وہی ہے جو اس وقت، ہریانہ، چندی گڑھ، بھارتی پنجاب اور پاکستانی پنجاب پر مشتمل ہے۔ اسی میں پانچ

دریائے ستلج ہیں۔ دہلی کی طرف سے سب سے پہلے ستلج آتا ہے۔ اس کے بعد بیاس جو پاکستان کی سرحد کے پاس ستلج میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دریائے راوی آتا ہے جو لاہور کے قریب پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ سندھ طاس معاہدے کے تحت ان تینوں دریاؤں کا پانی بھارت استعمال کرتا ہے اور ہمیں صرف سیلاب کی صورت میں پانی ملتا ہے جو صرف تباہی مچاتا ہے۔ اس کے بعد پنجاب، جو سیالکوٹ کے قریب سے پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ اس پر بھارت نے کئی ڈیم بن رکھے ہیں۔ پنجاب کا پانچواں دریا جہلم ہے۔ ان پانچ دریاؤں کی وجہ سے ہی اس علاقے کو پنجاب کہا جاتا ہے۔ یاد رہے دریائے سندھ بھکر کے مقام سے پنجاب میں داخل ہوتا ہے اور تقریباً پانچ سو کلومیٹر پنجاب میں ہی بہتا ہے لیکن اسے پنجاب کے پانچ دریاؤں میں شامل نہیں کیا جاتا۔ کشمور کے مقام پر یہ دریا صوبہ سندھ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ دریا، بلتستان، گلگت، کوہستان، مزارہ، اٹک، کالا باغ، میانوالی، ڈی آئی خان، تونسہ شریف، راجن پور اور رحیم یار خان کے پاس سے گزر کر گڈو بیراج سے سندھ میں داخل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا سفر، سکھر، کوٹری اور آخر کار۔۔۔ بحیرہ عرب۔۔۔

میں تو اک دریا ہوں۔۔۔ سمندر میں اتر جاؤں گا۔۔۔

پنجاب میں ہندو مذہب، ہندوستان کے بہت سے دوسرے علاقوں کی طرح صدیوں سے موجود ہے۔ ہندو دھرم نا صرف یہاں کی ثقافت کا ایک اہم حصہ رہا ہے بلکہ اب بھی ہے۔ اس کی کچھ تفصیل میں پچھلے صفحات میں آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔

ہندوستان میں 2011ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق پنجاب ریجن، جس میں بھارتی پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش اور چندریگرہ شامل ہیں، کی آبادی چھ کروڑ افراد پر مشتمل تھی۔ جس میں سے تقریباً چار کروڑ لوگوں کا تعلق

ہندو دھرم سے تھا، جو کہ آبادی کا 65 فیصد تھا۔ سکھوں کی تعداد پونے دو کروڑ، جو آبادی کا 29 فیصد ہیں جبکہ مسلمان چار فیصد ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے متحدہ پنجاب میں مسلمان 54 فیصد تھے اور اس علاقے میں، جو اب بھارت کا حصہ ہے، ان کی تعداد بیس فیصد کے قریب تھی جو اب کم ہو کر صرف چار فیصد رہ گئی ہے۔ اس کمی کی وجہ تقسیم کے وقت ہجرت یا ان کا قتل کیا جانا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تقسیم پنجاب کے آبادی پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔

ایک سوال ہر دم میرے ذہن میں کھلکتا رہتا ہے کہ یہ تقسیم ہند تھی یا آزادی ہند۔۔۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تقسیم پہلے ہوئی اور آزادی بعد میں ملی۔۔۔ کیا سچ ہے؟ میرے خیال میں سب کو مل کر پہلے آزادی حاصل کرنا چاہیے تھی، بعد میں آپس میں بیٹھ کر متحد ہو کر نہ چلنے کی صورت میں تقسیم کا سوچنا چاہیے تھا۔

وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اپنے غیر ملکی حاکموں سے کہا کہ آزادی دینے سے پہلے تقسیم ہند کریں؟ اس کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ کیا کوئی خوف تھا؟ کیا ایسا انگریزوں کے حق میں تھا؟ کیا کوئی گروہ ان کے ایما پر ایسا کر رہا تھا؟

میرے خیال میں آزادی ہند، اہل ہند کا ایک مشترکہ مقصد تھا، جس کے لیے ایک طویل عرصہ سے جدوجہد جاری تھی، اس کا حصول مقدم ہونا چاہیے تھا، تقسیم کا عمل آزادی کے بعد ہوتا تو اچھا ہوتا، ایسا دنیا میں بے شمار جگہوں پر ہوا ہے۔ ایک مثال چیکو سلواکیہ کی ہے۔ آزادی کی جنگ مشترکہ لڑی بعد میں چیک اور سلواک دو الگ الگ ملک بن گئے۔ ہمارے ہاں الٹ کیوں ہوا؟

کبھی تو معلوم ہوگا!

تقسیم ہند کے بعد بھارتی پنجاب میں واقع ریاستیں بھارت میں ضم ہو گئیں۔ ابتدائی بیس سال تو بھارتی پنجاب کی مزید تقسیم کا کوئی مطالبہ نہیں ہوا۔ البتہ اس دوران سکھوں نے سکھ صوبہ بناؤ تحریک کا آغاز ضرور کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان، ہندوؤں کے لیے بھارت تو سکھوں کے لیے بھی ایک ملک ہونا چاہیے۔ اس بات کو کچھ لوگوں نے یوں بھی لیا کہ درحقیقت بھارت بھر میں زبان کی بنیاد پر الگ ریاست کا مطالبہ کرنے والی تحریکوں کے نتیجے میں پنجاب میں ہندی اور پنجابی زبان کی بنیاد پر الگ ریاست کا مطالبہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ بھارتی پنجاب کی تقسیم کی بنیاد مذہب ہے ناکہ زبان۔ وجہ کچھ بھی ہوا انجام یہ ہوا کہ 1966ء میں پنجاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا؛ ہریانہ، پنجاب اور چندی گڑھ جو براہ راست وفاق کے تحت تھا۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پنجاب کے کچھ حصے، بشمول سولن اور نالگرھ، ہماچل پردیش میں ضم کر دیے گئے۔ یوں پنجاب ایک دفعہ پھر تقسیم ہوا پہلے اس سے صوبہ سرحد بنا موجوہ کے پی کے، پھر مشرقی اور مغربی پنجاب اور آخر میں مزید تقسیم ہریانہ کی علیحدگی کی شکل میں ہوئی۔

اب ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہونے جارہے تھے جہاں سکھوں کی اکثریت تھی۔ اس صوبے کے علاوہ کسی بھی صوبے میں سکھوں کی قابل ذکر تعداد موجود نہیں ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس صوبے کی سرکاری زبان پنجابی ہے، جو بھارت میں کسی بھی صوبے کی پہلی تو کیا دوسری سرکاری زبان بھی نہیں ہے۔ سکھوں کا سب سے مقدس مقام گولڈن ٹمپل بھی اسی صوبے میں واقع ہے۔

سکھ مذہب کے بانی گرو نانک جی 1469ء میں ننگانہ صاحب میں پیدا ہوئے۔ آپ کی وفات 1539ء میں ہوئی۔ آپ کے والد ایک ہندو تھے۔ آپ نے ایک نئے دھرم کی بنیاد رکھی۔ آپ کی تعلیمات کئی طریقوں سے ہندو دھرم سے مختلف ہیں۔

اس کے باوجود ہندو، سکھ دھرم کا بے حد احترام کرتے ہیں اور انھیں اپنے مذہب کا ہی ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ میں نے سندھ کے ہر مندر میں گورونانک صاحب کی تصاویر دیکھی ہیں۔ سکھوں کی کتاب گورو گرنتھ صاحب میں مسلمان صوفیا کا کلام بھی ملتا ہے۔

بھارتی پنجاب کا کل رقبہ پچاس ہزار مربع کلومیٹر، پاکستانی پنجاب کا رقبہ دواکھ مربع کلومیٹر ہے کے قریب ہے۔ بھارتی پنجاب کی سرحد مغرب میں پاکستان، شمال میں جموں و کشمیر کا مرکزی علاقہ، شمال مشرق میں ہماچل پردیش اور جنوب میں ہریانہ اور راجستھان سے ملتی ہے۔ اس کا بیشتر حصہ زرخیز زرعی زمینوں پر مشتمل ہے۔ اس کے شمال میں کئی پہاڑی سلسلے ہیں جب کہ جنوب میں یہ ریگستانی علاقوں سے جا ملتا ہے۔ 2011ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی پونے تین کروڑ ہے۔

بھارتی پنجاب کا جی ڈی پی 81 ارب امریکی ڈالر ہے۔ بھارتی پنجاب کو بھارت کی روٹی کی ٹوکری بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقت بھارتی پنجاب، بھارت کی کل گندم کا بیس فیصد اور کپاس کی پیداوار کا دس فیصد پیدا کرتا ہے۔

یہ بھی اہم ہے کہ 1981ء میں پنجاب جی ڈی پی کے لحاظ سے پہلے نمبر پر تھا جبکہ 2001ء میں اس کا چوتھا نمبر تھا۔ بعد ازاں اس کی ترقی کی رفتار میں باقی ریاستوں کی نسبت کم اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ بھارتی پنجاب کا صرف زراعت پر انحصار ہے جبکہ دیگر ریاستوں نے صنعتی میدان میں کافی ترقی کی۔ بھارتی پنجاب کے زرعی رقبے کا اسی فیصد سکھ جاٹوں کے پاس ہے جبکہ وہ آبادی کا صرف بیس فیصد ہیں۔

میں نے پنجاب کی صدیوں قدیم تاریخ آپ کی خدمت میں پیش کی ہے جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ خطہ کیسا تھا، اس کے ساتھ کیا کیا ہوا اور اب یہ کس حالت میں ہے۔ اور یہ میری ذمہ داری بھی تھی کہ میں پنجاب کا تعارف قدرے تفصیل سے

کرواتا۔ اب ہم چلتے ہیں پنجاب کے پہلے شہر موہالی کی طرف جہاں ایک مشہور کرکٹ اسٹیڈیم بھی موجود ہے۔۔۔ جسے پاکستان کے لوگ اچھے طریقے سے جانتے ہیں کیونکہ یہاں پر کئی تاریخی کرکٹ میچ ہوئے ہیں۔



The 10 Sikh Gurus Photo Credit <https://medium.com>

## موہالی، جس کا سرکاری نام صاحبزادہ اجیت سنگھ نگر ہے

ہم صبح آٹھ بجے کے قریب چند ی گڑھ سے نکلے اور ہماری منزل ضلع فتح گڑھ تھی، جہاں ایک شہر سرہند بھی واقع ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے لیکن اس کی اصل اہمیت، اس کا میری ذات سے گہرا تعلق ہے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں سے میرے آباؤ اجداد نے آج سے 53 سال پہلے ایک انتہائی ناگفتہ بہ صورت حال میں ہجرت کی تھی۔ انھوں نے اپنے اس گھر بار کو چھوڑا جہاں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے۔ وہ سب لوگ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر اور لٹ لٹا کر پاکستان ہجرت پر مجبور ہوئے تھے۔ اس دوران ایک کثیر تعداد کو شہید کر دیا گیا اور بہت ساری عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ یہ وہی شہر تھا جس کے بارے میں میرے والد صاحب اپنے مال و دولت سے زیادہ اس بات کا غم کرتے تھے کہ وہ اپنے دیس میں اپنے آباؤ اجداد کی قبریں چھوڑ آئے ہیں، جو ناجانے کس حال میں ہوں



گی۔ میں اب اس شہر میں جا رہا تھا۔ جذبات کا کیا عالم تھا، الفاظ میں اظہار کرنا بہت مشکل ہے۔

اس سے قبل کہ میں آپ کو اپنے اگلے حالات و واقعات سے آگاہ کروں میں چاہوں گا کہ وہ شہر، جس میں سے ہم گزر رہے تھے، جس کا نام صاحبزادہ اجیت سنگھ نگر ہے کے بارے میں کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں۔ یاد رہے ہم یہ سفر 2000ء میں کر رہے تھے اور اس وقت تک موہالی ضلع نہیں بنا تھا۔ اسے 2006ء میں ضلع بنایا گیا اور اب یہ پنجاب کا آٹھواں ضلع ہے۔ اب جب میں نے اس سے متعلق پڑھا تو بہت سی دلچسپ معلومات حاصل ہوئیں جنہیں میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ضلع موہالی کا سرکاری نام صاحبزادہ اجیت سنگھ نگر ہے۔ عام طور پر اسے موہالی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ صاحبزادہ اجیت سنگھ، گرو گوبند سنگھ کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔ وہ چمکور کی دوسری جنگ کے دوران اپنے بھائی صاحبزادہ جوہار سنگھ کے ہمراہ جنگ کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔ ان کے دوسرے دو بھائیوں، زووارہ سنگھ اور صاحبزادہ فتح سنگھ (جن کی عمریں بالترتیب نو اور سات سال تھیں) کو عالمگیر کے گورنر وزیر خان کے حکم پر ایک دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔ اس مقام پر اب گوردوارہ فتح گڑھ صاحب ہے۔ یہ جگہ سرہند کے قریب ہی واقع ہے۔ اسی وجہ سے اب اس شہر اور ضلع کا نام فتح گڑھ رکھا گیا ہے۔ مجھے بھی اس دیوار کو دیکھنے کا موقع ملا، جس کی تفصیل اگلے صفحات میں کی جائے گی۔

بابا اجیت سنگھ کا ایک مختصر تعارف آپ کو یہ جاننے میں مدد دے گا کہ ایک اہم ترین شہر کا نام ان کے نام پر کیوں رکھا گیا۔ آپ کی پیدائش 1687ء میں ہوئی۔ آپ کے والد گورو گوبند سنگھ، سکھوں کے دسویں گورو تھے جن کے دور میں خالصہ دل کی بنیاد رکھی گئی اور سکھ دھرم کی حفاظت کے لیے جنگیں لڑی گئیں۔ ہمارے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں

تقسیم ہند سے پہلے کا ایک محلہ موجود ہے جس کا نام گوبند پورہ ہے۔ یہ نام ظاہر کرتا ہے کہ تقسیم سے قبل سکھوں کی ایک بڑی تعداد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رہتی تھی اور انھوں نے اپنے گورو کے نام سے ایک محلہ بھی آباد کر رکھا تھا۔ اس وقت مغلیہ سلطنت کا تاج عالمگیر کے سر پر سجا ہوا تھا۔ جس سے سکھوں کو سخت نفرت تھی۔ انھیں 12 سال کی عمر میں ہی ایک معرکے کی سربراہی سونپی گئی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

ایک برہمن کی بیوی، جسے ڈیرہ بسی کے سردار چودھری جبار خان نے زبردستی چھین لیا تھا کی رہائی کے لیے صاحبزادہ اجیت سنگھ اور بھائی اوی سنگھ نے ایک زبردست جنگ کی۔ اس جنگ میں جبار خان مارا گیا اور اس طرح برہمن کی بیوی کو رہائی ملی۔

بابا اجیت سنگھ، چکور کی دوسری جنگ جو 1704ء میں لڑی گئی، مغل فوج کے ہاتھوں مارا گیا۔ سکھوں کی تاریخ کے مطابق بابا اجیت سنگھ نے صرف چند سو سکھوں کے ساتھ مغل فوج کا مقابلہ کیا اور بہادری کے بڑے کارنامے سرانجام دیے۔ ان کے ایسے ہی کارناموں کی وجہ سے اس شہر کا نام صاحبزادہ اجیت سنگھ نگر رکھا گیا۔ ہر سال دسمبر - جنوری میں اجیت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی یاد میں، شہیدی جو میلہ کے نام سے ایک میلے کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ یہ میلہ سکھوں کے نزدیک ایک اہم تہوار کی حیثیت رکھتا ہے۔

موہالی شہر میں بابا بندہ سنگھ بہادر وار میموریل کا افتتاح 2011ء میں ہوا۔ بندہ سنگھ بہادر سکھوں کے ایک اہم ترین فرد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ بندہ سنگھ بہادر 1670ء میں پیدا ہوئے۔ وہ گرو گوبند سنگھ کے ایک خاص شاگرد تھے۔ انھوں نے مغل سلطنت کے خلاف مسلح جدوجہد کی قیادت کی اور کئی اہم معرکے بھی سر کیے۔ میرے نزدیک ان کا سب سے اہم کارنامہ زمینداری نظام کا خاتمہ تھا جس کے نتیجے میں عام کسانوں کو بے حد فائدہ پہنچا۔ ایک جنگ میں مغلوں نے انھیں قید کر لیا اور کہا جاتا

ہے کہ انھیں شدید تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا اور اس طرح ان کی موت واقع ہوئی۔ بابا بندہ سنگھ بہادر سکھوں کے نزدیک بہادری کی ایک علامت سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لیے پنجاب کے کئی علاقوں میں جگہ جگہ ان کے مجسمے دکھائی دیتے ہیں۔

گردوارہ شری امب صاحب بھی موہالی کی ایک پہچان ہے، پنجابی میں آم کو امب کہتے ہیں۔ اس گردوارے کے بارے میں سکھوں کا یہ کہنا ہے کہ ساتویں گرو، شری گروہ ررائے صاحب نے یہاں کا دورہ کیا تھا اور سردیوں کے موسم میں آم کھانے کی فرمائش کی تھی۔ جس پر مقامی لوگوں نے کہا کہ اس موسم میں آم تو نہیں ہوتا۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ جاؤ جا کے دیکھو۔ اس پر لوگ گئے اور انھوں نے سردیوں میں درختوں پر آم دیکھے، جس پر سب حیران ہوئے۔ اسی وجہ سے اس جگہ پر ایک گردوارہ بنایا گیا جس کا نام گردوارہ امب صاحب رکھا گیا۔ یہ ایک طویل قصہ ہے جو انتہائی دلچسپ ہے اور اس میں عقیدت کی انتہا بھی نظر آتی ہے۔

موہالی کا اسٹیڈیم پاکستان میں کافی مشہور ہے۔ یہاں پر پاکستان اور بھارت کے درمیان کئی اہم میچ ہوئے جو مارو یا مر جاؤ کی کیفیت پر مبنی تھے۔ یہ اسٹیڈیم کئی لحاظ سے ایک جدید اسٹیڈیم ہے۔ اس میں تیس ہزار کے قریب شائقین کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہ اسٹیڈیم بھارت کا 19 واں ٹیسٹ کرکٹ میدان ہے۔ اس کا افتتاح 1993ء کو ہیر وکپ کے دوران ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے مابین ایک روزہ بین الاقوامی میچ سے ہوا۔ یہاں پر ورلڈ کپ کے بھی کئی میچ کھیلے گئے ہیں۔ سب سے اہم میچ جو مجھے ابھی تک یاد ہے وہ ورلڈ کپ کا بھارت اور پاکستان کے مابین کھیلا جانے والا سیمی فائنل تھا۔ اس میچ کو دیکھنے کے لیے بھارت کے وزیراعظم من موہن سنگھ اور پاکستان کے یوسف رضا گیلانی نے بھی شرکت کی، وہ میچ پاکستان ہار گیا تھا۔ جس پر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان نے

یہ میچ جان بوجھ کر ہارا ہے تاکہ بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات کو معمول پر لایا جاسکے۔ ہمیں بھی اس اسٹیڈیم کو دور سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس علاقے میں ایک ایسا ڈیم بھی موجود ہے جس کی بنیاد انگریزوں کے دور میں رکھی گئی لیکن اس کی تکمیل تقسیم ہند کے بعد ہوئی۔ اس کا نام ہماچل پردیش کے ایک بھکرانامی گاؤں، جو کہ اس ڈیم میں ڈوب چکا ہے، کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ڈیم کی لمبائی پانچ سو میٹر اور چوڑائی نو میٹر ہے۔ اس کی جھیل کا نام "گوبند ساگر" ہے۔ پانی کی مقدار کے لحاظ سے یہ بھارت کا تیسرا سب سے بڑا پانی ذخیرہ کرنے والا ڈیم ہے۔ یہ ڈیم دریائے ستلج پر بنایا گیا ہے۔ اس کی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت تیرا سو میگا واٹ سے بھی زائد ہے۔ اونچائی کے اعتبار سے اس کا شمار دنیا کے بلند ترین ڈیموں میں ہوتا ہے۔

موہالی میں فتح برج بھی بنایا گیا ہے اس کی اونچائی سو میٹر ہے (مینار پاکستان کی اونچائی ستر میٹر اور قطب مینار کی اونچائی 73 میٹر ہے)۔ یہ ایس اے ایس نگر ضلع پنجاب کے چھپر چیری کے تاریخی گاؤں میں واقع ہے۔ اسے 2011ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ میں یہ سفر 2000ء میں کر رہا تھا۔ اس لیے ہم اسے دیکھ نہ سکے۔ یہ برج اس مقام پر واقع ہے جہاں بندہ سنگھ بہادر نے مغل فوج کے کمانڈر وزیر خان کے خلاف فیصلہ کن جنگ جیتی تھی۔

یہ جنگ 1710ء میں مغل اور سکھ افواج کے درمیان سرہند سے بیس کلومیٹر دور ایک چھپر چیری نامی گاؤں کے پاس لڑی گئی۔ یاد رہے اس وقت عالمگیر حیات تھا۔ ایک طرف بندہ سنگھ بہادر تھا اور دوسری طرف وزیر خان تھا۔ اس جنگ میں سکھوں کو فتح ہوئی اور وزیر خان مارا گیا۔ اس طرح سکھوں نے پنجاب میں اپنی پہلی ریاست کی بنیاد رکھی۔ بندہ سنگھ بہادر نے لوہ گڑھ (ہریانہ) میں اپنا دار الحکومت بنایا۔ بعد ازاں

مغلوں نے اس جنگ میں ہونے والی شکست کا بدلہ لیا اور بندہ سنگھ کو گرفتار کر کے اسے موت کی سزا بھی دی۔

وزیر خان کے نام سے ایک مسجد لاہور میں بھی واقع ہے۔ اس کا تعلق چنیوٹ سے تھا۔ بعد ازاں وہ مغلیہ سلطنت کی طرف سے پنجاب کا گورنر بنا۔ اس نے سکھوں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں۔ سکھوں کے نزدیک اس کا نام بہت زیادہ قابلِ نفرت ہے جسکی وجہ گورو گوہند صاحب کے بچوں کا دیوار میں زندہ چنونا تھا۔ اس کا وہ فعل ہر لحاظ سے قابلِ مذمت تھا۔ اس بات کی ناہی ہمارا دین اجازت دیتا ہے اور ناہی جنگی اصول۔ بہر حال یہ ایک واقعہ تھا جسے جھٹلانا ناممکن ہے۔

ایسے ہی واقعات نے ہندوستانی معاشرے میں وہ دوریاں پیدا کیں جنہوں نے صدیوں سے قائم معاشرے کو ایسا تقسیم کیا جسے دوبارہ اصل حالت میں واپس لانے کے لیے ناجانے کتنی صدیاں درکار ہوں گی۔

میرے بڑے مجھے بتاتے تھے کہ بٹوارے کے وقت جب سکھ مسلمانوں کو قتل کرتے تھے تو وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ ہم تمہارے عالمگیر اور وزیر خان کے سکھوں پر کیے گئے مظالم کا بدلہ لے رہے ہیں۔

وزیر خان اور عالمگیر کے اقدامات ایک ایسے بادشاہ کے طور پر تھے جو اپنی سلطنت کو بچانا چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مسلمان بھی تھے لیکن بطور مسلمان ان سے ایسے کاموں کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

## موہالی سے اپنے دیس تک: ایک سفر جس کا تصور بھی حسین تھا

ہم جیسے ہی چند ہی گڑھ سے نکلے تو میں نے ارد گرد دیکھا کہ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ علاقہ پنجاب کے ان علاقوں میں شامل ہے جو زراعت کے لیے سب سے موزوں مانے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ہاں، لاہور، گجرات سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کی زمین ہے، اسی طرح کی زمین تھی۔ میری یادداشت کے مطابق زراعت کے نقطہ نظر سے اس سے زیادہ خوبصورت علاقہ میں نے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔

ہم موہالی سے ابھی کچھ دور ہی گئے تھے کہ ہمیں ایک جگہ رکنپڑا۔ میں نے اس علاقے کی تاریخ پڑھتے ہوئے یہ جانا کہ جب پنجاب میں گولڈن ٹیمپل کے واقعہ کے بعد ہندو سکھ فسادات شروع ہوئے تو 1987ء میں لرو میں بھی ایک بہت ہی اہم واقعہ رونما ہوا۔ جس میں 38 ہندوؤں کو خالصتان کے حامی سکھوں نے اس وقت ہلاک کر دیا جب وہ ایک بس میں سفر کر رہے تھے۔ ان پر سکھوں کے اُس گروہ نے حملہ کیا جو چاہتے تھے کہ ہندوؤں کو پنجاب سے نکال دیا جائے اور خالصتان نامی ایک خود مختار ملک بنایا جائے۔ یہ واقعہ بہت دیر تک لوگوں کی گفتگو کا موضوع رہا۔

بے گناہ لوگوں کا قتل کسی بھی تحریک کو اس کی منزل سے دور کر دیتا ہے!

میں نے اس بارے میں ایک صاحب سے جاننے کی کوشش کی تو ان کا کہنا تھا کہ کوئی بھی سکھ اس واقعے پر خوش نہیں یہ صرف چند لوگوں کا کام تھا جو خالصتان کے حامی تھے۔ خالصتان کا حامی ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن بے گناہ لوگوں کا قتل درحقیقت ایک بہت بڑا پاپ ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا۔

میں نے اپنے سفر نامے کے حصہ اول میں ایک ہندو بیراجی سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، جنہوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ گولڈن ٹیمپل کے واقعے کے بعد ہندوؤں کا پنجاب میں رہنا کافی مشکل ہو گیا تھا اور اسی دوران انھیں بھی نقل مکانی کر کے دہلی آنا پڑا۔ آپ کو یاد ہو گا اندرا گاندھی کے قتل کے بعد دہلی میں سکھوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ اس دوران بھی بہت سے سکھوں کو دہلی سے پنجاب کی طرف نقل مکانی کرنا پڑی۔

ہندوستانی معاشرے میں مذہب کے اثر و رسوخ کا اندازہ ایسے ہی کئی واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اب ہم 2021ء میں موجود ہیں، چند ماہ قبل دہلی میں ہندو مسلم فسادات کی بنیاد بھی "ہندو تو" یعنی بھارت صرف ہندوؤں کے لیے ہے کا نعرہ ہی تھا۔ جس کا ذمہ دار مودی کو گردانا جاتا ہے۔

میرا یقین ہے کہ کوئی مذہب بھی کسی بے گناہ کے قتل کی اجازت نہیں دیتا۔ قتل تو دور کی بات ہے وہ تو کسی کو کوئی نقصان پہنچانے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

یہ مذہب نہیں بلکہ کچھ لوگوں کے اپنے خیالات ہوتے ہیں جو مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایسا ہی للرو، موہالی میں بھی ہوا تھا۔ ہم براستہ موریندا یہ سفر کر رہے تھے۔ ہمارے راستے میں کئی اہم قصبے آئے جن کا مختصر ذکر پیش خدمت ہے۔

## موریندا: جو ماتا گوجری کی وجہ سے ایک عالمگیر شہرت رکھتا ہے

گورو گوبند سنگھ کے دو بچوں کو دیوار میں زندہ چنوانے کا ذکر میں نے پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔ اس واقعے کا ایک اہم کردار ماتا گجری صاحبہ ہیں۔ ماتا گجری جسے ماتا گوجری بھی کہا جاتا ہے، سکھ مذہب کے نویں گورو گرو تیغ بہادر کی بیوی اور سکھ

مذہب کے دسویں گرو گوبند سنگھ کی والدہ تھیں۔ ان کے پوتوں کو جب دیوار میں چنوانے کا حکم دیا گیا تھا تو اس وقت وہ بچے ماتا گجری کے پاس ہی تھے۔

مورند پنجاب کے ضلع روپ نگر میں واقع ہے۔ یہاں پر وہ کوتوالی بھی موجود ہے جہاں ماتا گجری اور اس کے دونوں پوتوں کو فنج گڑھ صاحب لے جانے سے قبل قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ ماتا گجری کی بھی موت بھی اسی جگہ پر واقع ہوئی۔ اسی وجہ سے یہ شہر سکھوں کو نزدیک ایک اہم شہر گردانا جاتا ہے۔ اس شہر میں اس واقعے کی یاد میں گردوارہ شری کوتوالی صاحب بھی بنایا گیا ہے سکھوں کے نزدیک یہ واقعہ عالمگیر اور وزیر خاں کی وجہ سے پیش آیا۔



Mata Gujri with her grandsons Photo Credit:

<https://www.deviantart.com>

## بسی پٹھانا اور تلانیا میرے بزرگ جس کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے

اس علاقے کی تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے یہ بھی علم ہوا کہ فنج گڑھ سے کچھ پہلے دوسری سڑک پر گردوارہ فنج گڑھ سے تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں بسی پٹھانا ہے۔ اس کے پاس ہی تلانیاں نامی ایک گاؤں بھی ہے۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ میرے آباؤ اجداد بتاتے تھے کہ بسی اور تلانیاں میں ان کا کافی آنا جانا تھا۔ آج بھی ٹوبہ ٹیک



سنگھ میں بسی اور تلانیاں سے ہجرت کر کے جانے والے لوگوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ میں آج اس گاؤں کو دور سے دیکھ رہا تھا جہاں میرے آباؤ اجداد آیا جایا کرتے تھے۔ میں وہ سب کچھ تصور ہی تصور میں دیکھ رہا تھا۔ ان کے جانور، ان کی فصلیں، سب کچھ میری نظروں کے آگے سے گزر رہا تھا۔۔

ایک مرتبہ تو میں اداس ہو گیا لیکن پھر مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہوئی کہ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد ہوں جسے اپنے آباؤ اجداد کے علاقے دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ مجھے ایک اور بات یاد آئی وہ یہ کہ تقسیم ہند کے وقت اس علاقے میں میرے بزرگ کسی کھلی جگہ پر اپنے جانور لے کر آئے تھے۔

جب میں نے اس بستی سے متعلق جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس گاؤں کی بنیاد 1540ء میں رکھی گئی۔ نام سے یہ ظاہر ہے کہ یہ پٹھانوں کا ایک گاؤں تھا۔ سب پٹھان مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ گاؤں بھی مسلمانوں کا ہی تھا اور اب تک اس کا پرانا نام ہی چل رہا ہے۔ حالانکہ اب یہاں پر شاید ہی کوئی مسلمان رہتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ شروع میں اسے بستی پٹھانا کہا جاتا ہوگا لیکن آہستہ آہستہ یہ بسی پٹھانا ہو گیا اور پھر صرف بسی ہی رہ گیا۔ اس گاؤں میں سکھوں کے گورو گوہند سنگھ بھی تشریف لائے تھے۔ ان کی یاد میں یہاں ایک تاریخی گردوارہ بھی موجود ہے۔ اس شہر کے بارے میں کئی قصے مشہور ہیں۔ کسی جوگی کا بھی ایک قصہ ہے جو عبادت میں اس قدر مصروف تھا کہ اس کی ایک ٹانگ جل گئی لیکن اسے پتہ ہی نہ چلا۔ اس کی یاد میں یہاں پر ایک مندر بھی بنایا گیا ہے۔

مجھے ایک ایسی بات کا بھی علم ہوا جس کا تصور بھی بہت مشکل ہے۔ کہتے ہیں کہ 1925ء میں یہاں کے معروف صنعت کار پی ٹی آر جیداس نے ہندوستان میں بننے والی پہلی سلائی مشین تیار کی تھی۔ ہندوستان کے صنعتی علاقوں سے کہیں دور ایک نئی

مشین کا اس علاقے میں تیار ہونا بہت عجیب بات ہے۔ اب بھی اس علاقے میں سلائی مشینیں بنانے کی بہت سی فیکٹریاں موجود ہیں۔

## شیخ احمد سرہندی عرف مجدد الف ثانی

ہمارے راستے میں دو اہم مقامات آرہے تھے، ایک جہاں پر شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی دفن ہیں اور دوسرا اس کے پاس ہی گردوارہ فتح گڑھ، جس کا ذکر میں نے پچھلے صفحات میں کیا ہے۔ ہم دونوں جگہوں پر گئے۔ ہم نے پہلے مجدد الف ثانی کے مزار پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو شیخ احمد سرہندی عرف مجدد الف ثانی کے مزار سے متعلق بتاؤں میں چاہوں گا کہ ان کی زندگی اور خدمات میں متعلق چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

شیخ احمد سرہندی عرف مجدد الف ثانی کی پیدائش 1564ء میں سرہند میں ہوئی، آپ 1624ء میں وفات پا گئے۔ آپ ایک عظیم اسلامی اسکالر، حنفی فقہ کے پیروکار اور نقش بندیہ سلسلے کے ایک صوفی تھے۔ آپ کے عظیم کارناموں میں اکبر کے دین الہی کی مخالفت اور دین کی صحیح تشریح کرنا شامل ہے۔ اس وجہ سے آپ کو مجدد کہا جاتا ہے۔ آپ نے بچپن میں ہی قرآن بھی حفظ بھی کر لیا تھا۔ بعد ازاں آپ تعلیم کی غرض سے سیالکوٹ بھی گئے۔ اس کے بعد بھی آپ نے کئی بزرگوں سے اسلام کی تعلیم حاصل کی۔

شیخ احمد سرہندی کی تعلیم کا بنیادی نقطہ صوفی طریق کار اور شریعت کی پابندی کو ساتھ لیکر چلنا تھا۔ آپ کا ایک مشہور قول ہے کہ "جو کچھ بھی نبی کے دکھائے گئے راستے سے باہر ہے وہ حرام ہے۔" شیخ احمد سرہندی کا کہنا تھا کہ شریعت کا تصور ایک مکمل اور جامع اصطلاح ہے جس میں ظاہری عبادات، عقیدے اور صوفی طریقہ کار سب

شامل ہیں۔ وہ شیعہ مسلک کے کافی بڑے ناقد تھے اور شاید اسی وجہ سے ہی 1619ء میں مغل بادشاہ جہانگیر کے حکم سے، جوان کی اس سوچ کا سخت مخالف تھا، آپ کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا گیا تھا، جس سے کئی سال بعد آپ کی رہائی ہوئی۔

شیخ احمد سرہندی صاحب سے متعلق سکھ دھرم میں ایک مختلف رائے پائی جاتی ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر نے سکھوں کے پانچویں گرو ارجن کو پھانسی دی تھی۔ اس کا الزام بھی شیخ احمد سرہندی صاحب کے سر ہے۔ جہانگیر سکھوں کے سخت خلاف تھا اور انھیں اسلام کا سخت دشمن سمجھتا تھا۔ سکھوں کا کہنا ہے کہ اس کی اس سوچ کے پیچھے شیخ احمد سرہندی صاحب کا ہاتھ تھا۔ یہ بات کہاں تک درست ہے معلوم نہیں لیکن ایک بات تو سبھی جانتے ہیں کہ اسی وجہ سے شیخ احمد سرہندی صاحب کو مجدد کہا جاتا ہے۔ شیخ احمد سرہندی صاحب مغل حکمرانوں بالخصوص اکبر کے دین کی نئی شرح کے بہت خلاف تھے۔ جہانگیر نے بھی اسی بات کو اپنانے کی کوشش کی، جس کی انھوں نے سخت مخالفت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شیعہ مسلک کی بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے بھی خلاف تھے۔

ان باتوں نے انھیں ایک طرف تو مجدد بنایا لیکن دوسری طرف کچھ لوگ ان کے شدید دشمن بن گئے اور اس کا نتیجہ گوالیار کا قلعہ تھا!

مارچ 2021ء میں میاں مقصود احمد صاحب نائب قیام جماعت اسلامی پاکستان کی کوشش سے چند نامی گرامی مشائخ، الخدمت فاؤنڈیشن کے دفتر میں تشریف لائے۔ ان میں ایک صاحب بیرو غلام مجدد سرہندی فاروقی بھی تھے۔ ان کا تعلق ٹیاری سندھ سے تھا۔ میں بھی اس محفل میں موجود تھا۔ میرا تعلق بھی چونکہ سرہند سے تھا اور شیخ احمد سرہندی کی وجہ سے ہی ہمارا خاندان بھی مسلمان ہوا تھا اس لیے میری دلچسپی دوسرے لوگوں سے بڑھ کر تھی۔

اس موقع پر میں نے اپنے خاندان کی تاریخ پر لکھی ہوئی کتاب ”سرہند سے ٹوبہ ٹیک سنگھ تک“ بھی انھیں پیش کی۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے۔ اس موقع پر ہم نے آپس میں اس موضوع پر تھوڑی بہت بات چیت بھی کی۔ اپریل کے شروع میں مجھے ٹیاری سندھ جانے کا موقع ملا۔ میں نے ان سے رابطہ کیا۔ ان کا بڑا پن کہ انھوں مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ اس طرح جب میں شیخ احمد سرہندی کے خیالات اکبر، جہانگیر، عالمگیر، سکھ، ہندوؤں سے متعلق تاریخ پڑھ رہا تھا تو مجھے سکھوں کے خیالات بھی جاننے کا موقع ملا۔ سکھوں کے مطابق مغلوں نے سکھوں پر جو بھی ظلم کیا، مغلوں کی اس سوچ کو پروان چڑھانے میں شیخ احمد سرہندی کا نام سب سے پہلے ہے۔

میں نے یہ بات پیر صاحب سے پوچھی۔ وہ مجدد صاحب کے خاندانہ میں سے ہیں اور سندھ کے علاوہ دنیا بھر میں اس جماعت کے سربراہ بھی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ مجھے بتایا اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

انھوں نے کہا کہ جہاں تک مجدد صاحب کے ہندوؤں کے بارے میں خیالات کا تعلق ہے تو وہ بڑے واضح ہیں۔ انھوں نے اکبر کے دور میں ہندو عورتوں سے شادی، جو کہ ناصر بادشاہ کرتے تھے بلکہ بااثر مسلمان بھی یہی کام کرتے تھے، کی سخت مخالفت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اکبر کے دین الہی کی بھی مخالفت کی۔ مجدد صاحب اس بات کے حامی تھے کہ ہندوؤں کے ساتھ ایک خاص حد تک سماجی روابط رکھے جائیں، لیکن اپنے دینی معاملات کو دین کی صحیح روح کے ساتھ ہی لے کر چلنا چاہیے۔

سکھوں کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ سکھ مذہب کے بانی بابا گرو نانک صاحب ہندوؤں کی بجائے مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں۔ اس کی ایک مثال میاں میر صاحب کا گولڈن ٹیمپل کی سنگ بنیاد رکھنا بھی ہے۔ اس کے علاوہ سکھ کسی بھی طرح کی مورتی کی پوجا نہیں کرتے ہیں اور یہ بات بھی انھیں مسلمانوں کے قریب کرتی ہیں لیکن بہت

ساری باتیں ہندوؤں سے بھی ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے آج بھی ہندو بابا گورو نانک کو اپنا ایک راہ نمائنتے ہیں اور اپنے مندروں میں ان کی تصاویر بھی لگاتے ہیں۔

پیر صاحب نے مزید کہا کہ سکھوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی جس کی بناء پر وہ مجدد صاحب کے خاندان کے خلاف ہو گئے۔ یہ معاملہ اس حد تک بڑھا کہ 1858ء میں مجدد صاحب کے خاندان کو سرہند سے ہجرت کر کے کابل اور پشاور جانا پڑا اور بعد میں کچھ لوگ سندھ میں جا بسے۔

اس دوران مجدد صاحب کے دربار کے پاس واقع ان کی مسجد کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ حتیٰ کہ مسجد کو بطور اصطبل بھی استعمال کیا گیا۔ پیر صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ سب کچھ اس غلط فہمی کی بنیاد پر تھا کہ سکھوں پر ہونے والے مظالم خاص طور پر بچوں کے قتل کا واقعہ مجدد صاحب کی تعلیمات کی وجہ سے ہوا ہے۔ سرہند کی اس مسجد کی تعمیر کے لیے سندھ میں آپ کے خاندان کے لوگوں نے چندہ بھی اکٹھا کیا۔ اس طرح سندھ کے لوگوں نے سرہند کی اس مسجد کی تعمیر میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ اب صورتحال بالکل مختلف ہے اس وقت بڑی تعداد میں سکھ مجدد صاحب کے عرس پر آتے ہیں اور زائرین کی خدمت بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے گردواروں میں ان کے کھانے اور رہائش کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔

پیر صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان جنگ کو ہوا دینے میں ہندوؤں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ ہندو ہی تھے جو مغل حکمرانوں کو سکھوں کے خلاف اکساتے تھے تاکہ ان دونوں کے درمیان دوری قائم رہے۔ پھر اسی کا نتیجہ تھا کہ تقسیم پنجاب کے وقت مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان سکھوں نے ہی پہنچایا۔ ہندوؤں نے بھی پہنچایا ہو گا لیکن سکھوں سے کم تھا۔

کیا بات درست ہے، کیا نہیں۔۔۔ یہ جاننا ضروری بھی ہے۔۔۔ لیکن مشکل بھی۔

ہم تینوں شیخ احمد سرہندی کے مزار، جسے عام طور پر روضہ شریف کہا جاتا ہے کہ صدر دروازے سے گزر کر کافی آگے ایک دو منزلہ عمارت کے پاس پہنچ گئے۔ ایک صاحب نے ہمیں یہ بتایا کہ ان کی قبر مبارک نیچے ہے لیکن نیچے سے راستہ بند ہے۔ آپ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جائیں۔ وہاں آپ کو قبر کا تعویذ ملے گا۔ ہم اوپر چلے گئے ہم نے ان کے لیے فاتحہ خوانی کی۔ بعد ازاں واپسی پر میں نے دیکھا کہ وہاں پر کتابوں کی کئی دکانیں بھی تھیں اور رہنے کے لیے بڑے بڑے ہال بھی بنے ہوئے تھے۔

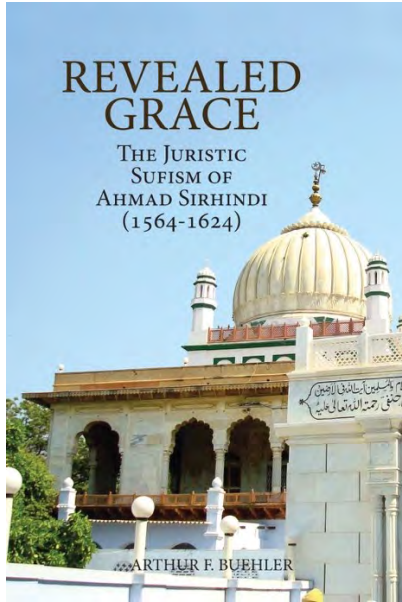
میں نے اس بات کی کافی کھوج کی لگائی کہ ہمارا خاندان کب مسلمان ہوا؟ لیکن مجھے صحیح معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ صرف اتنا جاننے کو ملا کہ میرے دادا کے دادا محمد بخش مانگٹ کا نام تو مسلمانوں جیسا تھا۔ ان سے پہلے کے لوگ کب مسلمان ہوئے؟ کسی کو علم نہیں۔

یہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہوا (اس کا ذکر میں اگلے صفحات میں کروں گا) کہ جس محلے میں ہم رہتے تھے وہاں ایک چار سو سال پرانی بہت بڑی مسجد اب بھی موجود ہے لیکن ویران ہے۔ اب اس علاقے میں کوئی بھی مسلمان نہیں رہتا۔

ایک صاحب جو کتابوں کی دکان پر تشریف فرما تھے میں ان کے پاس چلا گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ وہاں پر مجھے ایک کتاب ملی جس میں لکھا ہوا تھا اسماعیل بندگی صاحب کی عمر تقریباً 600 سال تھی۔ بندگی صاحب کا مزار بھی اسی علاقے میں موجود ہے۔ وہ بات مجھے بہت ہی عجیب لگی۔

شیخ احمد سرہندی صاحب کا سالانہ عرس ہر سال منایا جاتا ہے۔ جس میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان بھارت کے علاوہ پاکستان، افغانستان، انڈونیشیا، بنگلہ دیش اور دیگر مسلم ممالک سے شرکت کرتے ہیں۔ پاکستان سے بھی ہر سال ایک وفد اس عرس میں شرکت کے لیے جاتا ہے۔ جس میں بڑی تعداد میرے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں سرہند سے ہجرت کر کے آنے والوں کی ایک کثیر تعداد رہتی ہے۔

روضہ شریف ایک بڑے احاطے میں واقع ہے۔ اس احاطے میں مجدد صاحب کے علاوہ خواجہ محمد صادق اور خواجہ محمد معصوم کے روضے بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کابل کے حکمران خاندان کے کچھ افراد کی قبریں بھی وہاں موجود ہیں۔ یہاں ایک عظیم الشان مسجد بھی ہے۔ اب اس مزار کی دیکھ بھال بھارتی حکومت کی ذمہ داری ہے۔



Book about Sheikh Ahmed Sirhnadi

## گردوارہ فتح گڑھ صاحب: ایک تاریخی واقعہ کی یادگار عمارت

فتح گڑھ صاحب پنجاب کا ایک قصبہ اور سکھ مذہب کی ایک مقدس زیارت ہے۔ یہ قصبہ سرہند سے تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ پٹیالہ شہر سے اس کا فاصلہ 40 کلومیٹر ہے اور چندی گڑھ سے یہ مغرب میں 42 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔

میں نے پچھلے صفحات میں وزیر خان کے حکم پر گورو گوبند سنگھ کے بچوں کو دیوار میں چنوانے کے واقعے کا ذکر کیا ہے، فتح گڑھ صاحب کا نام ان کے چھوٹے بیٹے فتح سنگھ کے نام پر رکھا گیا جس کی عمر چھ سال تھی اور اس کے بھائی زور اور سنگھ کی عمر نو برس تھی۔ اب یہ سکھ مذہب کی ایک اہم زیارت ہے۔ سکھوں نے 9 دسمبر 1705ء کو اس واقعہ کے بعد اس جگہ کو فتح گڑھ کا نام دے کر 1843ء میں یہاں ایک بڑا گردوارہ بنایا گیا۔ اس شہر میں سکھوں کے اور بھی کئی بڑے گردوارے ہیں۔

ہم اس کے صدر دروازے کے پاس پہنچ کر اپنے ہاتھ منہ، پاؤں دھو کر سر پر کپڑا رکھ کر گردوارے میں داخل ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت (یعنی آج سے 20 سال قبل) صحن میں دھوپ سے بچاؤ کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ ابھی حال ہی میں میں نے کچھ ویڈیوز دیکھیں جس میں دھوپ سے بچنے کے لیے ایک شیڈ دکھائی دیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کا مہینہ بھی ہم ایک طرف سے گزر کر آگے گئے جہاں مجھے دو سکھ بھی ملے۔ وہ اسی لہجے میں بات چیت کر رہے تھے جو میرے بزرگوں کا تھا۔ مجھے ایک مدت بعد مجھے وہ لہجہ سننے کو ملا تھا۔ اب ہمارا لہجہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، فیصل آباد اور پھر لاہور میں رہ کر کافی بدل گیا ہے۔ یہ لہجہ پنجاب کے دوسرے پنجابی لہجوں سے کافی مختلف ہے۔



ہم ہال کے اندر چلے گئے۔ حسب توقع بہت صفائی ستھرائی تھی۔ اس وقت بہت کم لوگ تھے۔ ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے ایک ہال میں چلے گئے۔ ایک صاحب نے ہماری راہ نمائی فرمائی اور وہ دیوار بھی دکھائی جہاں بچوں کو زندہ دفن کیا گیا تھا۔ اس وقت دیوار میں وہ جگہ ایک بڑی کھڑکی کی مانند تھی، جہاں ایک بڑا چوکور سوراخ تھا۔

اب جو میں نے کچھ وڈیوز دیکھیں ان میں مجھے وہ کھڑکی نظر نہیں آئی بلکہ کچھ اور چیزیں رکھی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ پرمیندر سنگھ کے لیے یہ بہت ہی سنہری موقع تھا۔ اس نے بہت ادب سے سب چیزوں کو دیکھا اور بہت خوش ہوا کہ اس دورے میں اسے سکھوں نے ایک مقدس گردوارے جانے کا بھی موقع ملا۔ میں بھی تاریخی مقامات کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔

میرا ماننا ہے کہ عمارتیں غلط بیانی نہیں کرتیں۔ کتاب میں غلط لکھا ہو سکتا ہے۔۔۔ لیکن عمارت جو بات بیان کرتی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ اینٹوں کی زبان میرے نزدیک کتابوں کی زبان سے زیادہ معتبر ہوتی ہے۔

اب اس شہر میں گرو گرنتھ صاحب یونیورسٹی اور بابا بندہ سنگھ بہادر انجینئرنگ کالج جیسے تعلیمی ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں۔ کسی بھی سیاسی یا مذہبی راہ نمائی یاد میں کسی تعلیمی ادارے کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ ان کے ماننے والوں نے اپنے لیڈر یا گورو کو تعلیم سے جوڑا ہے۔



Gurdawara Fateh Garh Sahib Photo Credit:  
<http://www.discoversikhism.com>

## استاد شاگرد کا مقبرہ

روضہ شریف کے مغرب میں ایک کلومیٹر کے فاصلے پر دو مقبرے موجود ہیں یہ عام طور پر استاد صیاد خان اور ان کے شاگرد کے مقبروں کے نام سے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان عمارتوں کو ان کی زندگی کے دوران، سولہویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ دونوں کے درمیان تقریباً دو سو میٹر کا فاصلہ ہے۔ یہ دونوں مزار فن تعمیر کے ایک شاہکار کے طور پر مانے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ قدیم اور تاریخی یادگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وہاں ارد گرد کئی مشہور اور تاریخی عمارتیں موجود تھیں جن میں سے چند ایک کا ذکر پیش خدمت ہے۔

## عام خاص باغ

سرہند میں ایک اہم تاریخی مقام عام خاص باغ بھی ہے۔ اس باغ سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ باغ مغل بادشاہوں کے لیے ایک سرائے کا کام کرتا تھا۔ بادشاہوں کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی اسے استعمال کرتے تھے۔ اس باغ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ ایک طرح سے مغل بادشاہوں کا گیسٹ ہاؤس تھا جو دہلی اور لاہور کے درمیان سفر کرتے ہوئے استعمال کرتے تھے۔ اس شاہی سرائے کی تعمیر کا آغاز کبر کے دور میں ہوا۔ یاد رہے کہ زمانہ قدیم سے قائم جی ٹی روڈ سرہند سے ہی ہو کر گزرتی تھی، اس لیے اسے ایک فوجی روٹ کی حیثیت حاصل تھی۔

اس باغ میں ایک عجیب و غریب سردخانہ بھی بنایا گیا تھا، جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں پر فواروں کا انوکھا نظام بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک وسیع رقبہ پر باغ بھی موجود تھا۔ اب اس کا انتظام حکومت پنجاب کے پاس ہے۔

ہم اس باغ کے اندر تو نہ جا سکے لیکن اسے دور سے ضرور دیکھا۔ میری یادداشت کے مطابق میرے بزرگ جن مقامات کا کثرت سے ذکر کیا کرتے تھے، ان میں یہ جگہ بھی شامل تھی۔

## میر میراں کا مقبرہ

عام خاص باغ سے پانچ کلومیٹر شمال میں میر میراں نامی ایک مقبرہ بھی موجود ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ مقبرہ اس علاقے میں پتھر سے بنائی گئی واحد اہم عمارت ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ میر میراں ایک صوفی تھے جو اس علاقے میں

رہتے تھے۔ ان کی شادی بھلول لودھی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ بھلول لودھی ایک بڑی سیاسی شخصیت تھے۔ اس مقبرے کے پاس ایک تالاب بھی ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بھلول کی بیٹی نے اپنے شوہر کی موت کے بعد تعمیر کروایا تھا۔ سلطان بھلول کو سرہند میں ہی تاج پہنایا گیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی ریاست کا والی بھی ہوگا۔ میر میراں کی وفات کے بعد موجودہ مقبرہ بھلول لودھی نے تعمیر کیا جسے میر میراں کا مزار کہا جاتا ہے۔

## حویلی دیوان ٹوڈر مل، المعروف جہاز حویلی

دیوان ٹوڈر مل سرہند کے مغل نواب، وزیر خان کے دربار میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔ اس کا تعلق ایک ہندو گھرانے، اگر وال سے تھا۔ ان سے متعلق ایک تاریخی واقعہ بہت مشہور ہے جس کی مثال ملنا تقریباً ناممکن ہے۔

تاریخی واقعات کے مطابق جب وزیر خان نے گورو گوبند سنگھ کے بچوں کو دیوار میں چنوا کر مار دیا تو اس دوران ان کی دادی بھی مر گئی۔ ان کی لاشوں کی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے وزیر خان نے کوئی بھی جگہ دینے سے انکار کر دیا تو ٹوڈر مل نے زمین خرید کر آخری رسومات ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کے لیے اس نے بہت بڑی قیمت پر زمین کا ایک چھوٹا ٹکڑا خریدا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آخری رسومات ادا کرنے کے لیے اس سے مہنگی زمین آج تک نہیں خریدی گئی۔

کہتے ہیں کہ وزیر خان نے کہا کہ سونے کے سکوں کو کھڑی حالت میں جوڑا جائے اور اس طرح جتنی زمین پر وہ سکے پھیل جائیں گے اتنی زمین آخری رسومات ادا کرنے کے لیے دے دی جائے گی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ ٹوڈر مل نے یہ قیمت ادا کی اور ایک جگہ خریدی تاکہ بچوں اور ان کی دادی کی آخری رسومات ادا کی جائیں۔ ٹوڈر مل کے اس کام کی

وجہ سے وقتی طور پر تو وزیر خان نے زمین دے دی لیکن بعد میں سزا کے طور پر ٹوڈر مل خاندان کی تمام تر جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اسے ہر چیز سے محروم کر دیا۔ اس وقت سے اس کی حویلی، جسے جہاز حویلی بھی کہتے ہیں، بھی موجود ہے۔

آج اس جگہ پر گردوارہ جیوتی موجود ہے۔ دونوں گردواروں کو ملانے والی سڑک کو دیوان ٹوڈر مل روڈ کہا جاتا ہے۔ ہم اسے بھی دور سے ہی دیکھ سکے۔ آج بھی سکھ ٹوڈر مل کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ ان کی یاد میں دیوان ٹوڈر مل میموریل ہال بھی بنایا گیا ہے۔

یہ ایسے تاریخی واقعات ہیں جنہیں تسلیم کرنا تو مشکل ہے ہی لیکن جھٹلانا بھی ناممکن ہے۔

## برگد (بوہڑ) کے قدیم درخت

فتح گڑھ صاحب کے پاس ہی چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قدیم برگد کا درخت ہے۔ کچھ لوگوں کے بقول یہ درخت دنیا کے بڑے درختوں میں سے ایک ہے۔ یہ چار ایکڑ پر پھیلا ہوا صدیوں پرانا درخت ہے جو اب بھی پھیل رہا ہے۔ اس کے پھیلاؤ کو کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ عام لوگ اسے ایک مقدس درخت مانتے ہیں۔

ہم کافی دیر تک وہاں پر رکے رہے اور پھر واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اب ہمارا سفر اس محلے کی طرف تھا جسے منصوری ٹبہ کہتے ہیں۔ میرے والد صاحب کی پیدائش اس محلے میں واقع ایک گھر میں ہوئی۔ جسے میرے والد نے شدید بیماری کی حالت میں خدا حافظ کہہ کر روضہ شریف میں پناہ لی اور پھر ایک ریل میں سوار ہو کر ایک انجان ملک اور ان دیکھی دنیا کی طرف اپنی جان بچانے کے لیے سفر شروع کر دیا۔ یہ میرا بھارت کے دورے کا وہ دن تھا جس کی آس لیے میرے بزرگ روتے ہوئے دنیا سے رخصت

ہو گئے لیکن اس سے پہلے آپ کے لیے سرہند اور ریاست پٹیالہ کی تاریخ کا جاننا بے حد ضروری ہے۔

## سرہند: ایک تابناک ماضی لیے ہوئے

سرہند، فوج گڑھ صاحب کا پرانا نام ہے۔ یہ دہلی سے لاہور جانے والی سڑک، جی ٹی روڈ پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ 250 کلومیٹر جبکہ لاہور سے دو سو کلومیٹر کے قریب ہے۔ اب یہ پنجاب کے ضلع فوج گڑھ صاحب کا ضلعی صدر مقام ہے۔

اس کے نام کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس علاقے میں ساہرند اس نامی کا کوئی قبیلہ رہتا تھا جس کا ذکر ساتویں صدی کے دوران ہندوستان کا دورہ کرنے والے چینی سیاح ہی وین سانگ نے بھی کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وسطی ایشیاء سے آنے والے لوگ اسے ہند کا سرا بولتے تھے۔ اسی وجہ سے اس کا نام سرہند ہو گیا۔

ہندو شاہی کے دور حکومت میں یہ شہر ان کی مشرقی سرحد پر واقع ایک اہم چوکی تھا۔ غزنوی کے حملوں کی وجہ سے ہندو شاہی کا دار الحکومت سرہند منتقل کر دیا گیا۔ غزنوی کے بعد یہ شہر چوہانوں کے قبضے میں آ گیا۔ غوری کے حملوں کے وقت دہلی کے آخری راجپوت حکمران پر تھوی راج چوہان کے دور حکومت میں بھی دفاعی نقطہ نظر سے یہ شہر ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ سلاطین دہلی بھی اس شہر کی اہمیت سے واقف تھے۔ فیروز شاہ نے اس علاقے کو سیراب کرنے کے لیے ستلج سے ایک نہر بھی کھدوائی، جس کا ذکر میں پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔ کسی دور میں بہلول خان لودھی، جو ملک سلطان شاہ لودھی کا گورنر تھا، وہ اس علاقے میں سلطان کا لقب استعمال کرتا تھا۔

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں تین سو سے زائد مساجد، باغات، مقبرے، کارواں سرائے اور کنویں تھے۔ یہ شہر کتنی بار اجڑا، کسی کو علم نہیں۔ میرے بزرگ بتاتے تھے کہ اس شہر میں جس کسی نے بھی کوئی عمارت بنانا ہوتی تو وہ شہر سے باہر ویرانے میں چلا جاتا جہاں تھوڑی سی کھدائی کے بعد اسے بے شمار اینٹیں مل جاتیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شہر کے ارد گرد بے شمار کھنڈرات پائے جاتے تھے۔

مغلیہ سلطنت کے دور میں سرہند، دہلی اور لاہور کے درمیان ایک مضبوط قلعہ بند شہر تھا۔ تجارتی نقطہ نظر سے بھی یہ شہر کافی اہمیت رکھتا تھا۔ پورے ہندوستان میں اس شہر کی عمارتوں کا کوئی ثانی نہ تھا۔

شہنشاہ جہانگیر نے بھی سرہند کے کئی دورے کیے اور شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ اس وقت سرہند سرکار کا دائرہ اند پور تک پھیلا ہوا تھا جو سترہویں صدی کے آخری سالوں میں گرو گوبند سنگھ کا گڑھ تھا۔ سرہند مغلیہ سلطنت کی ایک اہم فوجی چھاؤنی بھی تھا۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 1555ء میں ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے بیٹے کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ بھی سرہند میں ہی لڑی۔ جس میں اسے فتح حاصل ہوئی اور مغلیہ سلطنت کا دور ایک بار پھر سے شروع ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے دوران اس کی خوشحالی کی وجہ سے اسے ایک اہم مقام حاصل تھا۔ مغلوں کو اس علاقے سے سب سے زیادہ آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ شہنشاہ شاہجہاں نے ہی عام خاص باغ کی تعمیر کا بھی آغاز کیا تھا۔

گرو گوند سنگھ کی موت اور اس کے بچوں کو دی جانے والی سزائے سکھوں میں انتقام کی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔ ان لوگوں انتقام لینے کے لیے بندہ سنگھ بہادر کی سربراہی میں جمع ہو کر سرہند پر زبردست حملہ کیا۔ 1710ء کی لڑائی میں وزیر خان مارا گیا اور سکھوں نے سرہند قبضہ کر لیا اور بھائی باج سنگھ کو گورنر مقرر کیا۔ تاہم کچھ عرصے بعد مغل افواج نے اس شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ دریائے راوی اور جمنا کے درمیانی تمام علاقے بابا بندہ سنگھ بہادر کی ریاست میں شامل تھے۔ وہ اپنے وقت کی ایک بڑی ریاست تھی۔ میرے علم کے مطابق سکھوں کی اس سے بڑی ریاست نا اس سے پہلے تھی اور نا ہی بعد میں کبھی ہوئی۔ ویسے تو سکھ ریاستیں موجود تھیں لیکن وہ بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔

### احمد شاہ ابدالی اور سکھ

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 1748ء میں ابدالی نے بھی سرہند پر قبضہ کیا لیکن وہ ایک عارضی قبضہ تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ سکھوں اور مراٹھوں نے مل کر سرہند میں موجود ابدالی کے نامزد کردہ گورنر، شہزادہ تیمور ولد احمد شاہ کو پنجاب سے باہر نکال دیا۔ انھی لوگوں کا پیچھا کرتے ہوئے مراٹھے پشاور تک گئے تھے۔

جب 1761ء میں احمد شاہ نے پانی پت میں مراٹھوں کو شکست دی تو اس سے سکھوں کو شدید دھچکا لگا لیکن جلد ہی 1762ء میں سکھوں نے سرہند پر حملہ کر دیا۔ فوج دار، زین خان نے ایک بڑی رقم دے کر اپنی جان چھڑوائی لیکن دو سال بعد ہی 1764ء میں سردار جہا سنگھ آہلوالیہ نے سرہند پر ایک اور حملہ کر دیا۔ اس بار زین خان مارا گیا اور سرہند پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ شہر کو اجاڑ کر امرت سر میں واقع مقدس مقامات کی مرمت اور تعمیر کی گئی۔



یہ شہر کئی سال تک سکھوں، مغلوں اور ابدالیوں کے درمیان فٹ بال بنارہا۔ جو بھی آیا اس نے اس کی تباہی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سکھوں کو اس شہر سے بے انتہا نفرت تھی جس کی وجہ بچوں کے بیہمانہ قتل کا واقعہ تھا۔ اس لیے سکھوں نے فتح حاصل کرنے کے بعد شہر میں واقع تاریخی یادگاروں کو بارود سے اڑا دینے کا حکم دیا کیونکہ سکھ اس جگہ کی اینٹیں بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ تباہ شدہ ڈھانچوں سے اینٹیں لیکر دریائے ستلج میں پھینکتے اور اسے ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ ایک یورپین سیاح، جو 19 ویں صدی میں یہاں سے گزرا، نے لکھا ہے کہ اس نے اس سے زیادہ کھنڈرات ہندوستان بھر کے کسی دوسرے شہر میں نہیں دیکھے۔

ایسا تو اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس میں کوئی گن ہوتا ہے۔ خالی درخت کو تو کوئی پتھر بھی نہیں مارتا۔۔۔ پتھر بھی اسے ہی سہنے پڑتے ہیں جس پر کوئی پھل ہوتا ہے۔ یہی میرے بزرگوں کے دیں، مجدد کی بستی۔۔۔ سرہند شریف کے ساتھ ہوا۔۔۔ جو کہ بہت برا تھا۔

ایک مدت تک یہ شہر خالصہ دل کے مختلف سرداروں کے قبضے میں رہا لیکن اس شہر میں سکھ بچوں پر ہونے والے ظلم کی وجہ سے سکھ اس شہر کو منحوس ہی سمجھتے تھے لہذا کوئی بھی سکھ سردار اس کا والی بننے کو تیار نہ تھا۔ آخر کار اسے ایک سردار کے حوالے کر دیا گیا جو بھائی بگھاٹو کی اولاد میں سے تھا۔

اسی دور میں کئی سکھ ریاستیں بھی قائم ہوئیں جن میں ایک ریاست پٹیالہ بھی تھی، جس کا بانی سردار اعلیٰ سنگھ تھا۔ وہ ریاست تقسیم ہند تک برقرار رہی۔

میں آپ کی خدمت میں محمد بخش مانگٹ، جو میرے دادا کے دادا تھے، کے خاندان کے بارے میں چند معلومات پیش کرنا چاہوں گا۔

## منصوری ٹبہ: میرے والد کی جائے پیدائش

میرے بزرگوں کے مطابق ہمارا آبائی گھر سدھنا قضاۃ کی مسجد کے پاس منصوری ٹبہ نامی کے محلہ میں تھا۔ ہم نے ایک صاحب سے اس کا پتہ معلوم کیا اور اس محلے کی طرف چل پڑے۔ وہ محلہ روضہ صاحب کے جنوب مغرب میں دو سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہمارے گھروں کے پاس ہی چار سو سالہ پرانی مسجد، جس کا نام سدھنا قضاۃ کی مسجد ہے، بھی موجود ہے۔ ہم سدھنا قضاۃ کی مسجد کے پاس سے گزرے تو ہم نے بائیں جانب ایک بڑا سا درخت دیکھا۔ اس درخت کا ذکر میں میرے بزرگ اکثر کرتے تھے۔ ہم اس کے پاس سے گزرے تو سامنے ایک گلی تھی۔ اس گلی میں ہمارا گھر تھا۔ کونسا تھا؟ وہ معلوم کرنا باقی تھا۔

میرے والد صاحب، جن کی وفات 1998ء میں ہو گئی تھی اور ہم یہ سفر 2000ء میں کر رہے تھے، نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے ایک ہندو دوست بھی ان کے گھر کے قریب ہی رہتے تھے۔ مجھے ان کا نام یاد تھا۔ ان کے نام کا آخری حصہ سیٹھ تھا۔

ہم اپنی گلی میں پہنچ گئے۔ اتنی دیر میں ایک صاحب، جن کی عمر پچاس سال ہو گئی، سے ہم نے پوچھا کہ اس محلے میں مسلمانوں کے گھر کون سے تھے؟ جس پر انھوں نے کہا کہ جہاں آپ کھڑے ہیں یہ گھر مسلمانوں کے ہی تھے۔ مین گلی کے اندر ایک چھوٹی سی گلی اور بھی موجود تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ علی بخش کا گھر کونسا تھا؟ اس پر انھوں نے کہا کہ کیا آپ علیہ موبی کا پوچھ رہے ہیں۔ علیہ میرے دادا کے والد علی بخش کا عربی نام تھا اور ہمارا خاندان موبی کے نام سے مشہور تھا۔ دیہات میں اب بھی خاندان کسی ایک منفرد نام سے پہنچانے جاتے ہیں جیسے نمبرداروں کا گھر، کونے والے، تالاب والے وغیرہ۔ میں نے جواب میں کہا ہاں میں انھی کا پوچھ رہا ہوں۔ جس پر انھوں نے

بتایا کہ چھوٹی گلی کی نٹری پر واقع کونے والا گھر اور اس کے سامنے والا گھر علیہ موجی کا ہی تھا اور اس گلی کے سرے پر واقع گھر بھی ایک مسلمان کا ہی تھا۔ یہ گلی آگے سے بند تھی۔ اس میں یہ تین ہی مکانات تھے۔ آمنے سامنے والے ہمارے جبکہ آخر میں ہمارے ایک رشتہ دار کا گھر تھا۔

گھر تو گھر ہوتا۔۔۔ میں کچھ لمحے اس گھر کو کھڑا دیکھتا رہا۔ مجھے بتایا گیا کہ اب اس گھر میں ایک ہندو خاندان آباد ہے جو پاکستان سے نقل مکانی کر کے آیا تھا۔ کچھ عرصے قبل ہی اس کی چھت اور دروازوں کی مرمت کی گئی تھی۔ باقی درو دیوار ویسے ہی تھے۔

میں نے اپنے والد صاحب کے دوست کا پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ بھی دنیا چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا یار بھی دنیا چھوڑ چکا تھا۔ اس لیے نا ہی ان کو اپنے والد کا سلام پہنچا سکا اور نا ہی ان کا حال چال پوچھ سکا۔

یہ سب جان کر میں تصور ہی تصور میں 53 سال پیچھے چلا گیا۔ جب وہ، جن کا یہ گھر تھا، یہ گھر۔۔۔ چھوڑ کر کہیں دور ریل کی پٹری کنارے ایک جھگی میں جا بسے تھے، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے فیصل آباد جانے والی ریل کی پٹری کے بیرونی سگنل کے قریب۔

کیسے چھوڑا، کیوں چھوڑنا پڑا، اس شہر میں آج بھی لوگ ہمارے خاندان کو اسی نام سے جانتے ہیں، اس شہر میں مسلمان تو آج بھی بستے ہیں، میرا خاندان کیوں نہ اپنے صدیوں پرانے محلے میں رہ سکا، وہ کئی مربع زمین کے مالک تھے، مالی آسودگی تھی، ان وقتوں میں وہ ہر سال زمین یا مکان خریدتے تھے، آٹھ جوان بھائی تھے، شہر بھر میں ایک باعزت خاندان تھا؟

اس کے کئی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ خوشحال تھے اور ان کی دولت پر کچھ لوگوں کی نظر تھی اور وہ ان کی خوشحالی کو لوٹنا چاہتے تھے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ انھیں یہاں سے نکالا جائے اور انھیں نکال دیا گیا۔

میں نے بارہا اپنے بڑوں سے پوچھا ہے کہ ہجرت کی وجہ کیا تھی؟ کیا پاکستان کا مطلب کیا اَللّٰہُ اَللّٰہُ تھا؟ یا وہ واقعی کسی مسلمان ملک میں جا کر ایک اسلامی ریاست کا حصہ بننا چاہتے تھے؟ ان کا یہ جواب ہوتا تھا کہ ہم ان پڑھ دیہاتی لوگ تھے۔ ہمیں ان باتوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ ہاں صرف یہ معلوم تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ تعلیم کسی کے پاس بھی نہیں تھی۔

میں یہ پوچھتا تھا کہ پھر کیا وجہ تھی کہ آپ نے اپنا گھر بار چھوڑا، آپ کی بہن اور بہنوئی کو قتل کیا گیا، میرے والد صاحب کی پہلی بیوی کے ساتھ ساتھ آپ کی دیگر عورتوں کو بھی اغواء کیا گیا، عزیز واقارب قتل ہوئے، گھروں پر ہلے بولے گئے؟ ان کا جواب ہوتا تھا کہ سکھوں کے جتھے ہم پر ہلہ بول دیتے اور قتل و غارت شروع کر دیتے تھے۔ وہ سب کچھ بھول جاتے تھے کہ ہم ان کے ساتھ اسی شہر میں صدیوں سے رہ رہے ہیں، ہمارا دھرم مختلف تھا لیکن ہماری ذاتیں تو ایک جیسی تھیں، جیسے جاٹ اور راجپوت وغیرہ۔ تب وہ ہمیں صرف مُسلے، وہ نفرت کی وجہ سے ہمیں مسلمان نہیں بلکہ مُسلے کہتے تھے سمجھتے تھے۔ یہی ہمارا جرم تھا۔

میں اکثر ان سے یہ بھی پوچھتا تھا کہ وہ کون لوگ تھے جو ہلہ بولتے تھے؟ کیا وہ آپ کے شہر کے لوگ تھے؟ جواب تھا کہ نہیں۔ ہمارے اہل محلہ نے تو ہمیں پناہ دی تھی۔ میرے والد صاحب سخت بیمار تھے۔ ان دنوں ہماری ایک ہمسائی ہندو عورت انھیں اپنے گھر لے گئی جبکہ میرے نانا اپنے خاندان کے ساتھ ایک سال سے زائد عرصہ ایک سکھ نمبردار کی پناہ میں رہے۔ اس دوران انھیں کوئی بھی کسی طرح کا نقصان نہ پہنچا سکا۔

یہ چند اوباش قسم کے لوگ تھے۔ جن میں کچھ مذہبی جنونی بھی تھے، وہ مغلیہ دور میں سکھوں پر ہونے والے مظالم کا بدلہ لینا چاہتے تھے، کچھ چوراچکے بھی تھے، جو مال و دولت لوٹنا چاہتے تھے۔ میرے خیال میں کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔

میرا یہ بھی یقین ہے کہ جو اس میں شامل نہیں تھے۔۔۔ انھوں نے بھی ان کی اگر مدد نہیں کی تو روکا بھی نہیں، جب کہ وہ روک سکتے تھے۔ ان کا نہ روکنا بھی اس سارے واقعہ میں ان کی شمولیت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ بھی مسلمان آبادی کا انخلاء چاہتے تھے۔ اس لیے جتھے ان کا مقصد حاصل کرنے میں مدد کر رہے تھے۔ ایسا ہی پاکستان میں بھی ہوا اور ایسا ہی بھارت میں بھی۔

یہ میری ذاتی رائے ہے، آپ کو اس سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اس کے ثبوت میں میرے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ فسادات کے دوران فسادیوں کو اس کام سے روکا جاسکتا تھا، روکا نہیں گیا، امن قائم ہونے کے بعد عارضی کمیٹیوں سے لوگوں کو بلا کر ان کے گھروں میں واپس لایا جاسکتا تھا، لایا نہیں گیا، تحفظ فراہم نہیں کیا گیا، جہاں تحفظ فراہم کیا گیا وہاں سے کم لوگوں نے ہجرت کی ہے۔ جنہوں نے قتل و غارت کی، لوٹ مار کی ان پر مقدمات چلائے جاسکتے تھے۔ بیس لاکھ سے زیادہ افراد کے قتل کی ایک بھی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی، نا ہی بھارت میں اور نا ہی پاکستان میں۔ میرے پاس بس یہی دلیل ہے۔ اس قتل و غارت کا مقصد یہاں اور وہاں اقلیتوں کے صفائے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ جو لوگ اس وقت اقتدار کے خواہاں تھے ان کی یہی منشاء تھی۔۔۔ کہ

”نہ ہوگا بانس نہ بجے کی بانسری“

پھر بانس کو جڑ ہی سے اکھاڑ دیا گیا۔۔۔

سرہند، جو کبھی ایک مسلمان شہر تھا اب اس میں چند ہی مسلمان ہی رہ رہے ہیں وہ بھی وہاں روضہ صاحب کے اندر، لائل پور جہاں ساٹھ فیصد سے زائد ہندو اور سکھ آباد تھے وہاں تو اب ایک فیصد بھی موجود نہیں۔ جو اقلیتوں کی صفائی چاہتے تھے وہ کامیاب ٹھہرے۔۔۔

تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات میں کسی نے بھی، وہ ہندو ہو، سکھ ہو یا مسلمان، کسی بھی عیسائی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔۔۔ ان کو بھارت اور پاکستان میں کوئی بھی نقصان نہ پہنچا سکا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میرے نزدیک تو ایک ہی وجہ تھی کہ وہ انگریزوں کی سرپرستی میں تھے۔۔۔ انگریزوں کا خوف۔۔۔ آخر دونوں کا دھرم ایک تھا۔

ان کے نزدیک بیس لاکھ افراد کا قتل، کروڑوں لوگوں کی نقل مکانی، مالی نقصان، جس کا کوئی اندازہ نہیں، دو ہمسائیوں کے درمیان نفرت کی ایک مستقل دیوار، کئی جنگیں اور معاشرتی تقسیم کچھ بھی نہیں معنی نہیں رکھتا۔ اوپر سے یہ سب جن کے ساتھ بیٹا، انھیں یہ کہہ کر چپ کروایا جاتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کی آزادی آپ کی انھی قربانیوں کا ہی نتیجہ ہے۔۔۔

ہم بھی چپ رہے

"کیونکہ ریاست کی یہی خواہش تھی"

حالانکہ جب بیس لاکھ انسانوں کا قتل ہوا اور تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی ہوئی تو اس وقت ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔

قربانی آزادی سے پہلے دی جاتی ہے۔۔۔ بعد میں تو ہٹوارہ ہوتا ہے۔۔۔ جو بھی ہوا۔۔۔

ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا!

اور ناہی مستقبل میں ایسا ممکن ہے!

سیانے کہتے ہیں کہ راجے تو بدلتے رہتے ہیں راج (رعایا) نہیں۔۔۔

لیکن اب کی بار راجہ نہیں بدلہ بلکہ راجاؤں نے راج بدل لیا۔۔۔

کچھ کو نکال دیا اور کچھ کو اپنے پاس بلا لیا!

یہ کس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کیا گیا۔۔۔ آج بھی لوگوں کو معلوم ہے۔۔۔ لیکن ابھی تک خاموشی نہیں ٹوٹی۔۔۔ کب ٹوٹے گی۔۔۔ وہ وقت دور نہیں۔

--

میں نے انھی سوچوں کے ساتھ اپنے والد کی جائے پیدائش کو دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔۔۔ پلک جھپکے بغیر۔۔۔ تاکہ اس گھر، جو چند لمحوں کے لیے ایک مکان سے گھر میں تبدیل ہو گیا تھا، کا عکس تا دیر میرے ذہن میں نقش رہے۔ اب بیس سال بعد گلی کی نکلڑ والا گھر، ہلکے پیلے رنگ کا، ہلکے سبز رنگ کے دروازے، سامنے والا گھر بغیر پلستر کے اور میرے ساتھ باتیں کرنے والا ایک درمیانے قد کا ٹھکڑا دھیرے عمر شخص، اس کی باتیں، میرے دادا کے والد کو ان کے عرفی نام سے جاننے والا شخص۔۔۔

مجھے وہ سب یاد ہے ذرا ذرا۔۔۔

مومن خان مومن نے جو کہا ہے وہ یہاں پر بھی کہا جاسکتا ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر، وہ کرم کہ تھا میرے حال پر  
 مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو  
 کبھی بیٹھے جو سب میں روبرو، تو اشاروں ہی میں گفتگو  
 وہ بیان شوق کا بر ملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو  
 ہوئے اتفاق سے گر بہم، تو وفا جتانے کو دم بہ دم  
 گلہ ملا مت اقرباء، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو  
 کوئی ایسی بات ہوئی اگر کہ تمہارے جی کو بری لگی  
 تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو  
 کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی  
 کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو  
 جسے آپ گنت تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے با وفا  
 میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہمیں ایک گاؤں بھی جانا تھا اس لیے ہم زیادہ دیر رکے بغیر اس گلی سے آگئے  
 -- جہاں میرے والد ایک مرتبہ دلہا بھی بنے تھے -- نکاح بھی ہوا -- رخصتی نہ ہو  
 سکی -- اور ان کی منکوحہ کو ایک سکھ نے زبردستی اپنی بیوی بنا لیا --

اس موقع پر پنجاب کی اک دھمی امریتا پریتم کے الفاظ یاد آئے --

اج آنکھاں وارث شاہ نوں کتھوں قبریں وچوں بول  
 تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول



اک روئی سی دھی پنجاب دی تُوں لکھ مارے وین  
 اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کسن  
 اُٹھ درد منداں دیاں دریاں اُٹھ تک اپنا پنجاب  
 اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب  
 کسے نے پنجاں پانیاں وچ دتی زہر رلا  
 تے انہاں پانیاں نے دھرت نوں دتا پانی لا  
 ایس زرخیز زمین تے لوں لوں بھٹیاں زہر  
 گٹھ گٹھ چڑھیاں لالیاں بھٹ بھٹ چڑھیا قہر  
 ویہو ولسی وافر وں وں وگی جھگ  
 اوہنے ہر اک وائس دی انجھلی دتی ناگ بنا

ناگاں کیلے لوک مونیہ بس فیر ڈنگ ہی ڈنگ  
 پل اوپل ای پنجاب دے نیلے پے گے انگ  
 وے گلے اوں ٹے گیت فیر، تر کھلے اوں ٹٹی تند  
 ترنجنوں ٹٹیاں سہیلیاں چر کھڑے کوکر بند  
 سنے تیج دے بیڑیاں لڈن دیتیاں روڑھ  
 سنے ڈالیاں پیگ اج پیلاں دتی توڑ

جتنے وجدی سی بھوک پیار دی وہ نہ بھلی گئی گواچ  
راخجے دے سب ویراں بھل گئے اودھی جاچ  
دھرتی تے لہو و سیا قبر ایں پیاں چوون  
پریت دیاں شاہ زادیاں ایں وچ مزاراں روون  
وے ایں سبھے قید و بن گئے، حُسن عشق دے چور  
ایں کتھوں لیائے لہے کے وارث شاہ اک ہور  
ایں آکھاں وارث شاہ نوں کتھوں قبر ایں وچوں بول  
تے ایں کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول

یہ سب سوچ کہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ  
تم کیا جانو سردیوں کے تنہا چاند کا دکھ

چند قدم چلنے کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر مڑ کر دیکھا۔۔۔ کہ کہیں گلی کا کوئی  
کوٹا یا نہ رہ جائے جسے میں دیکھنا پاؤں۔۔۔ پھر گلی کا موڑ آگیا۔۔۔ اور سب کچھ چھپ  
گیا۔

## سدھنا قصائی مسجد کی تعمیر نو

ابھی حال ہی میں چند ایسے واقعات ہوئے ہیں جن کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

کچھ لوگوں نے مل کر فیس بک پر ایک پیج انڈیا پاکستان ہیری ٹیج کے نام سے بنایا ہے۔ اس پر بھارت اور پاکستان سے لوگ ہجرت کے واقعات لکھتے رہتے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی مفید پیج ہے۔ میں نے اس پر لکھا کہ کوئی ہے جس کا تعلق سرہند سے ہو۔ ایک صاحب جن کا نام سنی سوری ہے وہ سرہند کے رہنے والے ہیں لیکن اس وقت وہ کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں سے میرا رابطہ ہو گیا۔ نے میں سوری صاحب سے اپنے آبائی گھر اور سدھنا قصائی کی مسجد کی تصاویر منگوائی۔ جو انھوں نے اپنے ایک دوست کے ذریعے بھجوا دیں۔ جن سے مجھے موجودہ صورت حال سے آگاہی ہوئی۔

یہ سب دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں مسجد کی مرمت کروانے کی کوشش کروں، جو ویران پڑی ہے، اور اگر یہ اسی طرح پڑی رہی تو ایک دن یہ کھنڈر بن جائے گی۔

میں نے اس کام کے لیے کئی لوگوں سے رابطہ کیا۔ جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں یہ بتایا ہے کہ میرے آباؤ اجداد شیخ احمد سرہندی کے خاندان کے ذریعے ہی مسلمان ہوئے تھے۔ اسی سلسلے میں میں نے پیر غلام مجدد سرہندی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا کہ کوئی ایسا شخص ہو جو اس سلسلے میں میری رہنمائی کر سکے۔

انھوں نے شیخ احمد سرہندی کے مزار کے انچارج سید شعیب صاحب سے رابطہ کرنے کے لئے کہا۔ میں نے سید صاحب سے رابطہ کیا انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ مسجد گورنمنٹ کے ایک محکمے کے پاس ہے۔ میں ان سے بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔

انہوں نے محکمہ کے ذمہ داران سے بات کی، انہوں نے کہا کہ یہ مسجد سرکاری تحویل میں ہے، اس لیے اس کی مرمت ہم خود کریں گے۔ اس طرح سے انہوں نے مسجد کی مرمت کا کام شروع کر دیا۔ سید صاحب نے اس کی مجھے تصاویر بھی بھجوائیں۔

البتہ افسران نے یہ کہا کیا مسجد میں کوئی سامان دینا چاہیں تو وہ ہم لے سکتے ہیں۔ اب مسجد کی مرمت کا کام جاری ہے۔ مرمت مکمل ہو گی تو پھر اس میں کوئی سامان دینے کی باری آئے گی۔

اس طرح سے میری نیت کی وجہ سے ستر سال سے زائد عرصہ سے بند مسجد کی مرمت کا کام شروع ہوا۔ سید صاحب نے مجھے اس کی تصویر بھی بھجوائیں۔ ایک صاحب جو اس مقام کے انچارج ہیں اور مسلمان ہیں، سید صاحب نے ان سے بات بھی کی۔ انہوں نے کہا کہ ابھی کچھ دیر سے کام بند ہے لیکن جلد ہی دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ وہ صاحب کبھی کبھی اس مسجد میں نماز بھی پڑھ لیتے ہیں اس طرح سے ستر سال سے زائد عرصہ کے بعد اس سدھنا قضائی کی مسجد میں نماز کی ادائیگی شروع ہوئی۔

میں نے سید صاحب سے یہ بھی کہا کیا آپ ہمارے گھر کا بھی حال پوچھ کر بتائیں۔

وہ ہمارے محلے میں گئے جو لوگ ہمارے گھر میں رہتے رہے ہیں ان سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے ان سے بات کی۔ ابھی بھی میرا ان سے رابطہ ہے۔ وہ اس وقت تک لائل پور یعنی موجودہ فیصل آباد سے نقل مکانی کر کے سرہند جا پہنچے تھے۔ وہاں اس خاندان کو لائل پور یا کہا جاتا ہے۔ جب کہ ہم سرہند سے آکر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد ہوئے، جس کی وجہ سے ہمیں سرہندی کہا جاتا ہے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ وہ لوگ جو ہمارے گھر میں رہ رہے ہیں وہ ضلع لائل پور سے گئے تھے اور ہم سرہند سے آکر ضلع لائلپور کی ایک تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد ہوئے۔

یہ سب ہجرت اور نقل مکانی کی وجہ سے ہوا، اس کی بنیاد تقسیم ہند اور تقسیم پنجاب بنی۔

## علی بخش مانگٹ: میرے دادا کے ولاد ایک صاحب فراست اور باکردار شخص

میں اس موقع پر اپنے خاندان کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

میرے دادا کے دادا کا نام محمد بخش مانگٹ تھا ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام علی بخش مانگٹ، جن کی ہم اولاد ہیں، تھا۔ ان کے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ میرے دادا کرم الہی اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ آبائی زمین چند ایکڑ تھی۔ پڑداد علی بخش ایک سمجھدار آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کی اچھی تربیت کی۔ زمین شہر کے قریب تھی اس لیے وہ سبزیاں کاشت کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے آمدن کافی بہتر تھی۔ اس دور میں، جب مسلمان ہندو ساہوکار کے مقروض تھے، انھوں نے مکان اور زمین بھی خریدی۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ نیل کی کاشت بھی کرتے تھے۔ میں نے اپنی آبائی زمین کا کچھ حصہ دیکھا جو کہ اب ایک شہری کالونی میں تبدیل ہو چکا ہے۔



Our House in Sirhand now no one lives here

تقسیم ہند سے پہلے میرے دادا اور ان کے پانچ بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ دو کی شادی پاکستان آ کر ہوئی۔ دادا کی بہن اور بہنوئی کو ان کے گھر میں شہید کر دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے بچے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ میرے دادا اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں سمیت پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ سب لوگ سرہند شہر میں رہتے تھے جہاں سے روضہ شریف بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شہر میں رہنے والوں کا نقصان دیہات کی نسبت کافی کم ہوا۔ میرے بزرگوں نے حسین پورہ میں حافظ حلیم صاحب سے بھی ایک زمین خریدی جو ریاست پٹیاہ میں ایک ٹھکیدار تھے اور مہاراجہ کے بھی انتہائی قریب سمجھے جاتے تھے۔

مجھے میرے چچا جمال الدین نے بتایا کہ جب ہم نے زمین خریدی سرہند میں کے پاس ہی ایک گاؤں میں ایک بڑا زمیندار، جس کا نام سوڈھی تھا، رہتا تھا۔ اس نے ہمارے بزرگوں سے کہا کہ آپ عدالت میں پیسے لے کر نہ آئیں۔ میں پیسے لے آؤنگا اور آپ کی جگہ پر ادا ہوگی کروں گا اور پھر وہ پیسے میں بعد میں آپ کے گھر سے لے لوں گا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ مجھے خوف ہے کہ جب

آپ اپنے گھر سے پیسے لے کر چلیں تو کوئی ڈاکو آپ سے چھین نہ لے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ اسی نے ادائیگی کی۔

جب میں نے یہ واقعہ سنا تو مجھے احساس ہوا کہ دونوں کو کس درجے کا اعتماد تھا۔ کتنا خیال تھا کہ ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچے۔

پھر کیا ہوا۔ سب کچھ بدل گیا۔ ایسا کہنا مناسب نہیں۔ کچھ لوگ بدلے اور انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ چوراچکے اور لفنگے تھے۔ جنہوں نے لوٹ مار کی، عورتوں کو اغواء کیا، یہاں بھی اور وہاں بھی۔

ایک کہانی اور بھی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور جذبات سے بھرپور بھی۔

ایک دن میرے دادا حضور کو پتہ چلا کہ ان کے دو بھانجوں کو، جو بہت چھوٹی عمر کے تھے جن کے ماں باپ کو شہید کر دیا گیا تھا، سکھوں نے پکڑ لیا ہے اور ان لوگوں نے میرے دادا کو پیغام پہنچایا کہ وہ جو دو خوبصورت بیل اگر انھیں دے دیے جائیں تو ان کے بھانجوں کو واپس کر دیں گے۔۔۔ ورنہ ان کی موت۔۔۔ بھانجوں سے زیادہ کیا چیز عزیز تھی۔

تو پھر وہی ہوا بیلوں کے بدلے۔۔۔ بھانجے۔۔۔ سودا مہنگا تو نہیں تھا لیکن۔۔۔ ایسا جنہوں نے کیا انھوں نے صدیوں سے اکٹھے رہنے کو داغ لگا دیا۔

بچوں کی جان بخش دی گئی اور وہ پاکستان آئے اور اب بھی گجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں حیات ہیں۔ بیل تو یقیناً مر گئے ہوں گے۔۔۔ جو مان تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔۔۔

میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جنہوں نے مظالم ڈھائے وہ نہ تو مسلمان تھے، نہ ہندو اور نہ ہی سکھ۔۔۔ وہ ظالم تھے۔ ایسے لوگوں کا کوئی دھرم نہیں ہوتا لیکن ایسا کرتے وقت وہ دھرم کا نام ضرور استعمال کرتے ہیں۔

## سدھناقصائی کی مسجد

جس محلے میں ہمارے گھر تھے وہیں پر سدھناقصائی کی مسجد بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مسجد بالکل ویران تھی۔ کھنڈرات بتا رہے تھے کہ ”عمارت تو خوب ہوگی۔“ ایک انیکڑ قبے پر پھیلی ہوئی وہ مسجد، بڑے عالی شان گنبد، وسیع و عریض صحن اور ساتھ میں ایک تالاب، بتا رہے تھے کہ وہ ایک عظیم مسجد تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اتنی بڑی مسجد اسی علاقے میں بنائی جاتی ہے جہاں اسلام کے ماننے والوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہو۔ اس کی ویرانی بھی یہی بتا رہی تھی کہ اب اس علاقے میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے ورنہ مسجد کی یہ حالت نہ ہوتی۔ میں نے حال ہی میں فیسبک پر بنے ایک گروپ India Pakistan heritage club کی مدد سے سوئی سوری صاحب سے رابطہ کیا۔ تو انھوں نے ہمارے محلے اور سدھناقصائی کی مسجد کی ایک وڈیو بھیجی۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسجد اب بھی ویران ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ سے آباد کرے اور یہ کام میرے ہاتھوں ہو۔ میں نے اس کام کے لیے کوشش شروع کر دی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اس میں کامیاب کرے۔ آمین!

میں نے اس بات کا کھوج لگانے کی بے حد کوشش کی کہ یہ جان سکوں کہ سدھناقصائی کون تھا اور اس کے نام پر آج سے چار سو سال پہلے یہ مسجد کیوں بنائی گئی اور سے کس نے بنوایا؟ مجھے جو پتہ چلا وہ بہت مختلف تھا۔ میرا خیال تھا کہ چار سو سال قبل جب اس علاقے پر مغل حاکم تھے تو سدھناقصائی یقینی طور پر ان کے دربار سے منسلک ہی



کوئی شخص ہوگا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے بھی یہ جاننے کی کوشش کی لیکن کچھ خاص معلومات نہ مل سکیں۔ جو بات مجھے پتہ چلی اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے لیے بھی وہ حیران کن ہوگا۔

سدھنا 1180ء میں سہون سندھ میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد پٹیشے کے لحاظ سے قصاب تھے۔ اس لیے انھیں بھی سدھنا قصابی کہا جانے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی دکان کے قریب سایہ دار درخت اور پینے کے پانی کی سہولت موجود تھی۔ اس وجہ سے گاہکوں کے علاوہ مسافر، صوفی، جوگی، غرض ہر طرح کے لوگ اس سے مستفید ہوتے تھے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے شروع ہی سے ایسے کاموں میں دلچسپی تھی۔ اس دوران ہندوؤں سے اس کی ایک بحث بھی چھڑ گئی۔ ہندوؤں کے نزدیک گوشت کا کام ایک پاپ تھا۔ اس لیے وہ سدھنا قصابی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

وہ ہندوؤں کو یہ کہتا تھا کہ پتھر خدا نہیں ہیں کیونکہ یہ بے جان ہیں اور کسی جاندار کو کوئی راہ نمائی فراہم نہیں کر سکتے۔ روحانی تسکین کی خاطر اس نے سہون کو چھوڑا کر خدا کی محبت کی تبلیغ کرنے والے ایک جوگی کا روپ اختیار کر لیا اور چلتا چلتا سر ہند آ گیا۔

جب سدھنا قصابی جوان تھا اور مضبوط جسم کے ساتھ اچھی صورت کا بھی مالک تھا تو ایک دفعہ شمالی ہندوستان میں سفر کے دوران ایک برہمن عورت نے اس کے ساتھ تعلقات استوار کرنا چاہے، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ عورت نے اپنی شکست دیکھ کر سدھنا قصابی پر الزام لگایا۔ عدالت قائم کی گئی۔ جج نے سدھنا قصابی کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور ان کے ہاتھ کاٹ دیے گئے۔ کہتے ہیں کہ کچھ عرصے بعد ان کے جسم سے دوبارہ ہاتھ نکل آئے۔ جس پر لوگ انھیں ایک ولی کا درجہ دینے لگے۔ اب وہ ایک سنت یا صوفی

کے طور پر مشہور ہو گئے لیکن وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے سرہند آنے کا فیصلہ کیا۔

مجھے یہ بھی جاننے کا موقع ملا کہ سدھنا قصابی نے ست گورو وید اس جی مہاراج کے مذہب میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس فرقے کا تعلق سکھ مذہب سے ہی جوڑا جاتا ہے۔ مجھے اسکی تفصیل تو نہ مل سکی لیکن ایک بات کا ضرور پتہ چلا کہ سدھنا قصابی کی کبھی ہوئی کئی باتیں سکھوں کی مذہبی کتابوں کے علاوہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ میں مذہبی معاملات میں بات کرتے ہوئے خاصی احتیاط کرتا ہوں لیکن پھر بھی اگر کوئی خلاف واقعہ بات ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں اور اپنی بات کی تصحیح کرنے کے لیے تیار بھی ہوتا ہوں۔

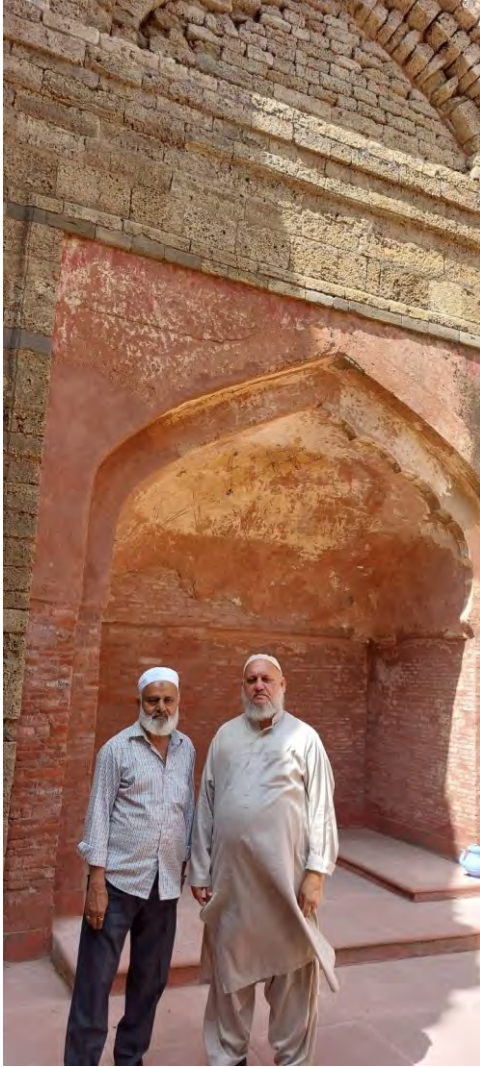


Sadhna Qasai Mosque Sirhand, my grandparents used to pray here. Photo Credit: <https://m.facebook.com>

یہ بات تو مجھے معلوم ہو گئی کہ سدھناقصائی کون تھا لیکن اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مسجد کس نے بنائی اور اس کا نام سدھناقصائی مسجد کیوں رکھا گیا؟ یہ سوال ابھی تک تشنہ ہے۔ آپ کو بھی اگر کوئی بات معلوم ہو تو ضرور آگاہ کریں۔ ایک صاحب جن کا نام سبجاش پر بہار ہے، نے ایک کتاب میں یہ لکھا کہ اس مسجد کی تعمیر کی کڑیاں دہلی میں نظام الدین سے ملتی ہیں۔ جس سے لگتا ہے کہ یہ مسجد سلاطین دہلی کے آخری دور میں خلجی یا تغلق خاندان سے تعلق رکھنے والے کسی بادشاہ کے زمانے میں بنائی گئی۔ مغلیہ دور میں اس شہر میں صرف باغ اور سرائے ہی ملتے ہیں۔



Sadhu Sadhna Sketch Photo Credit:  
<https://www.sikhiwiki.org>



Sayed Shoiab Sb (Right) and the man  
incharge for repair

## دالو ماجرہ: میرے والد کا ننھیال اور سرسرا

منصوری ٹبہ سے نکل کر ہماری اگلی منزل انبالہ کی طرف جانے والی سڑک (جی ٹی روڈ) فتح گڑھ صاحب سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع دالو ماجرہ گاؤں تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو سڑک سے چند سو میٹر پیچھے واقع تھا۔ اس گاؤں کے ساتھ بھی میرے خاندان کی ایک کہانی جڑی ہوئی ہے۔ اس گاؤں میں میرے والد کی پھوپھی اور ان کے خاوند کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگوں کو شہید کیا تھا۔ اب وہ خاندان گجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں آباد ہے۔

اس گاؤں میں پیش آنے والے ایک اور واقعہ کا تذکرہ کرنا مشکل ہے لیکن تاریخ بیان کرنا بھی ضروری ہے تاکہ آنے والی نسلیں جان سکیں کہ کیا ہوا، کس نے کیا اور کیوں ہوا؟

تقسیم ہند سے دو سال قبل میرے والد محترم اور ان کے چچا زاد بھائی چوہدری محرم علی کی شادی چوہدری برکت علی کی دو بیٹیوں، رحموں بی بی اور ثریا بی بی کے ساتھ ہوئی۔ رحموں بی بی کی عمر تقریباً 18 سال تھی۔ میرے والد صاحب کی عمر بیس سال کے قریب تھی جب کہ ثریا بی بی کی عمر دس کے قریب اور چوہدری محرم علی کی عمر تقریباً بارہ سال ہو گئی۔ علاقائی رواج کے مطابق پہلے نکاح کیا جاتا تھا اور پھر دو تین سال بعد رخصتی ہوتی تھی۔ یہی اس دفعہ بھی ہوا۔ ہمارا سارا خاندان بارات لے کر اسی گاؤں میں آیا تھا جہاں اب میں جا رہا تھا۔ حسب روایت نکاح ہو گئے اور رخصتی کا وقت دو تین سال بعد طے ہوا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

تقسیم پنجاب کے بعد جب فسادات شروع ہوئے تو سب سے پہلے میرے والد کی پھوپھی صاحبہ اور ان کے میاں صاحب کو گھر کی دہلیز پر شہید کر دیا گیا جبکہ ان کے سات بچوں نے بھاگ کر کسی سکھ کے گھر پناہ لی۔

مارنے والے اور پناہ دینے والے دونوں سکھ ہی تھے لیکن دونوں کے کام بے حد مختلف تھے!

اس کے علاوہ بھی خاندان کے کئی لوگوں کو شہید کیا گیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ میری دادی کے بھائی کو بھی شہید کیا گیا ان کی بیوی اپنی بچیوں کے ساتھ جان بچا کر بھاگی۔۔۔ لیکن پیچھا کرنے والے طاقتور تھے۔۔۔

اس بیچاری خاتون کے پاس اغوا ہونے سے بچنے کے لیے صرف ایک ہی راستہ بچا۔۔۔ وہ تھا جوہر کی رسم۔۔۔ جو ہندوستان میں صدیوں سے رائج تھی۔۔۔

شکست کی صورت میں خواتین کی اجتماعی خود کشی۔۔۔

ایک دفعہ پھر یہ رسم دہرائی گئی۔

میری دادی کی بھابی نے دیگر عورتوں سمیت اپنی چھوٹی بچی کو گود میں لے کر کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ دوسری بچی، جو ذرا بڑی تھی، ہاتھ چھڑا کا بھاگ گئی۔ اسے بھی کسی رحم دل سکھ خاتون نے پناہ دی۔ بعد میں اس بچی کو میری دادی نے ہی پالا اور اپنے بیٹے، میرے چچا فضل کریم صاحب کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔۔۔

وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔۔۔ ان کو تو کوئی دفنا بھی نہ سکا

میرے والد کے سسرال بھی شہید کیے جا چکے تھے اور ان کی ساس اپنی دو بچیوں کے ساتھ کوئی پناہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اتنے میں ایک سکھ نے میرے والد کی منکوحہ رحوں بی بی کو پکڑ لیا اور اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ والد صاحب کی ساس جو کوشش کر سکتی تھی انھوں نے کی لیکن ان کی بیٹی کو واپس نہ کیا گیا بلکہ اسے کسی اور کو بیچ دیا گیا اور وہ کسی نامعلوم گاؤں میں چلی گئی۔ جس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

رحمٰوں بی بی میری سوتیلی والدہ تھیں،

آج زندہ ہے یا نہیں اس کا کسی کو علم نہیں!

یاد رہے جو عورتیں اغواء کیے جانے کے کئی سال بعد کچھ لوگوں کی کوشش سے پاکستان آئیں۔۔۔ ان میں سے اکثر کی گود میں سکھوں اور ہندوؤں کے بچے تھے، ان میں سے ایک کا تعلق میرے خاندان سے بھی ہے۔۔۔

یہ بھی تقسیم پنجاب کا ایک تاریک پہلو ہے۔۔۔ ایسا صرف مسلمان عورتوں کے ساتھ ہی نہیں ہوا۔۔۔ سکھ اور ہندو عورتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔۔۔ چند ایک کو تو میں بھی جانتا ہوں۔

میں اس گاؤں میں یہی دیکھنے گیا تھا کہ کیا یہ وہی گاؤں تھا جہاں یہ لوگ صدیوں سے اکٹھے رہ رہے تھے اور پھر وہ وقت آیا جب کچھ سکھ مسلمانوں کی جان کے دشمن ہو گئے اور کچھ سکھ مظلوموں کو پناہ دینے کا کام کرتے رہے۔

اس ہجرت کا زخم کتنا گہرا ہے، تین نسلوں کے بعد بھی اس کی ٹیس برداشت نہیں ہوتی۔ یہ تحریر آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک قیمتی سرمایہ ہے تاکہ انھیں بھی اس بات کا احساس ہو سکے کہ یہ ماضی میں ایسا بھی ہوا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ تو شاید وہ اس کا جواب بھی تلاش کر لیں۔

لیکن اگر پتہ ہی نہیں ہو گا تو کیسا سوال کیسا جواب۔۔۔

## میری ماں کا گاؤں: میری زندگی کا یادگار سفر

ہماری منزل قریب ہی واقع ایک گاؤں تھا جس کا نام نلینہ خور د ہے لیکن اسے سوڈھی کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں کیونکہ جب میں بھارت گیا تھا تو میں نے اپنی والدہ

محترمہ سے ان کے گاؤں کے بارے میں پوچھا تھا لیکن جب ہم نے وہاں ایک صاحب سے اس گاؤں کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا اس کا نام سوڈھی ماجرا ہے۔ جب ہم نے اسے مزید بتایا تو اس نے ہماری راہ نمائی کی اور یوں میں اس گاؤں تک پہنچ گیا جہاں میری والدہ پیدا ہوئیں تھیں۔۔۔

جہاں ایک نیک دل سکھ نمبردار نے انھیں ایک سال سے زائد عرصہ تک اپنی پناہ میں رکھا تھا۔۔۔

ایک سکھ نے ایک دوسرے سکھ کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل کر انھیں ایک ڈھال فراہم کی۔۔۔  
جس کا ہم پر بڑا احسان ہے۔۔۔

میں آج اسی محسن کو دیکھنے آیا تھا۔۔۔ اور اس کا شکریہ بھی ادا کرنے۔۔۔ وہ تو اگلی دنیا سدھار گیا تھا۔۔۔ اس کا پوتا ضرور ملا۔۔۔ جسے دیکھ کر مجھے یوں لگا۔ کہ یہ وہی ہے جس کے بڑوں نے ہم پر اس وقت احسان کیا جب احسان کرنے کی سزا موت ہوتی تھی۔۔۔

تقسیم پنجاب کا یہ بھی رخ ہے۔۔۔ ایسا دونوں طرف ہی ہوا۔۔۔ ان باتوں کی بناء پر میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ جنھوں نے قتل و غارت کی۔۔۔ دونوں طرف۔۔۔ ان کا کوئی دھرم نہیں تھا۔۔۔ انسانیت ان کے پاس سے چھو کر بھی نہ گزری تھی۔۔۔ وہ ظالم بھیڑیے تھے۔۔۔ انسانوں کے روپ میں۔۔۔ انھوں نے مذہب کا، وطنیت کا، غیر مذہبوں کے قتل کا لبادہ ضرور اوڑھ رکھا تھا۔۔۔ البتہ جو انھیں روک سکتے تھے وہ بھی شریک جرم ہی ہیں۔۔۔



کیا مہاراجہ بیٹالہ کی فوج ایسے ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتی تھی؟ یقیناً پکڑ سکتی تھی۔۔۔ لیکن۔ انھوں نے یہ ظلم و ستم ہونے دیا۔۔۔ یہ ان کی کمزوری تھی یا خواہش، کون جانے سچ کیا ہے؟ میں یہ کہوں گا کہ راجا کمزور نہ تھا، بلکہ یہ اس کی خواہش تھی۔۔۔ یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے، ممکن ہے کئی لوگوں کو اس سے اختلاف ہو۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ جب سب سے پہلے راولپنڈی کر قریب ایک گاؤں میں سکھوں کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹا گیا، اس وقت جو خاموش رہے وہ کمزور نہیں تھے، بلکہ ایسا ان کی خواہش پر ہو رہا تھا، وہ خود کرتے تو پکڑے جاتے، کسی سے کروایا، کام بھی ہو گیا اور داغ بھی نہ لگا۔ امیر منائی نے کیا خوب کہا ہے،

قریب ہے یار و روز محشر، چھپے گشتوں کا قتل کیونکر؟  
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہمارے گھر کے پاس عابد زیدی صاحب کا گھر تھا۔ وہ ایک پڑھالکھا گھرانہ تھا۔ وہ بھی ہماری طرح ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد تھے۔ تقسیم کے وقت ان کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ میں نے تقسیم ہند کے حالات جاننے کے لیے ان سے بات کی تو انھوں نے جو بتایا وہ بھی قابلِ غور ہے۔ ان کا آبائی علاقہ مراد آباد، یوپی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے خود ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مال گودام پر گنڈوالہ قبرستان سے پہلے ایک کنواں دیکھا جس میں درجنوں لوگوں کی لاشیں تھیں۔ جنھیں بیہمانہ طریقہ سے قتل کیا گیا تھا۔ ایک اور دلچسپ بات بھی انھوں نے بتائی جس کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے۔

وہ ایک مرتبہ مراد آباد (اپنے آبائی شہر) گئے۔ جہاں پر ایک صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی جن کا نام ڈاکٹر پر تھوی تھا۔ انھوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے نقل مکانی کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نام لے کر بتایا کہ فلاں فلاں شخص نے، جو ٹوبہ ہی کا رہنے والا تھا

(میں ان کا نام نہیں لکھ رہا) ان کے ساتھ بے حد ظلم کیا تھا۔ ان کے خاندان کے کئی افراد کو قتل کیا، گھر بار لوٹا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسے خاندان کا ذکر بھی کیا جس نے ان کی مدد کی اور اپنی جان کی بازی لگا کر انھیں محفوظ مقامات پر پہنچایا۔ اس خاندان کے ایک صاحب کا نام احسان برکی تھا۔ ڈاکٹر پر تھوی کو سب یاد تھا۔۔۔ ظالم کا نام بھی اور محسن کا نام بھی جو احسان برکی کے بزرگ تھے۔۔۔ دونوں طرف دونوں ہی طرح کے کردار تھے۔

ہم راستہ پوچھتے پوچھتے نلینہ خورد پہنچ گئے۔ میری والدہ نے مجھے دلوگوں کا بتایا تھا، ایک نمبر دار کا اور دوسرا ایک خاندان جو گاؤں کا چرواہا تھا، جسے بھرائی کہتے تھے۔

ہم نے گاؤں جا کر نمبر دار کے گھر کا پتہ کیا تو علم ہوا کہ وہ اگلے جہاں سدھار گئے ہیں۔ البتہ ان کے پوتے ابھی آنے ہی والے ہیں۔ ہم نے ان سے بھرائی خاندان کے گھر کا پوچھا۔ جو انھوں نے بتا دیا۔ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ بھرائی خاندان کا گھر ساتھ والی گلی میں ہی تھا۔

ان کے گھر جا کر ہم نے اپنا تعارف کروایا۔ ہمیں دیکھ کر کئی لوگ ہمارے پاس آ گئے۔ بھرائی خاندان کا بزرگ تو فوت ہو چکا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے اور ان میں سے بھی بڑا فوت ہو گیا تھا۔ باقی دو اب گاؤں میں چوکیدار کا کام کرتے تھے۔ وہ دونوں اپنی تنخواہ لینے سر ہند گئے ہوئے تھے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ گاؤں کے چوکیدار کی تنخواہ سرکار ادا کرتی ہے۔

گھر کی خواتین نے ہمارے لیے چار پائیاں بچھادیں۔ کچھ ہی دیر میں میٹل کے گلاسوں میں ہمارے لیے چائے آ گئی۔ میرے بچپن میں بھی ہمارے گھروں میں میٹل

کے گلاسوں میں گرم چائے پی جاتی تھی۔ اب کی بار ایسا ماں کے گاؤں میں ہو رہا تھا جبکہ ہم اپنے گھروں میں بیتل کی بجائے چینی کے برتنوں کو رواج دے چکے ہیں۔

ایک بوڑھی خاتون جس کی عمر تقسیم ہند کے وقت دس سال ہو گئی اسے میرے ننھیال کے بہت سے لوگوں کے نام یاد تھے۔ وہ سب کا نام لے لے کر ان کا حال پوچھ رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے پلو سے محبت کی نمی کو بھی پونچھ رہی تھی۔۔۔ وہ میری ماں کی سہیلی تھی، ان کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا، اسے سب یاد تھا، لیکن آنسو تھے کہ زبان پر حاوی تھے، بات کرنا مشکل ہو رہا تھا، میں نے بھی سننے کی بجائے آنسوؤں کی جھڑی دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔

مجھے بھی کچھ ایسا ہی کرنا پڑ رہا تھا!

اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا سکھ لاٹھی کے سہارے چلا آ رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے چل رہا تھا، وہ بھی آکر بیٹھ گیا۔۔۔ مجھ سے کہنے لگا۔۔۔ منشی خان کا کیا حال ہے۔۔۔ میں ایک دم ہکا بکا رہ گیا۔۔۔ پھر جب مجھے سمجھ آئی تو میں نے جانا کہ وہ صاحب میرے بڑے ماموں منشی خان کا پوچھ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہیں۔

اس پر اس نے بھی اپنی آنکھیں صاف کیں اور کہنے لگا میرا نام مستری سیاں سنگھ ہے۔۔۔ منشی میرا آڑی تھا (ہماری پنجابی میں آڑی لنگوٹیا یار کو کہتے ہیں)۔

مستری سیاں اس سے زیادہ کوئی بات نہ کر سکا۔۔۔ اور چپکے سے اٹھ کر چلا گیا، اس نے مڑھ کر بھی نہیں دیکھا، مجھے تو بس یہی سنائی دیا، اوئے منشی، کتھے چلا گیاں اے کیوں چلا گیاں اے؟

۔۔۔ میں نے پاکستان آ کر اپنے ماموں سے اس بات کا تذکرہ کیا۔۔۔ ماموں نے بھی اس کا حال پوچھا۔۔۔ اور پھر اپنے صافے کا پلوڈھونڈنے لگ گئے۔۔۔ میرا رومال میری جیب میں ہی تھا جسے نکالنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔

ابھی ہم چائے ہی پی رہے تھے کہ نمبردار کا بیٹا آگیا۔ یاد رہے نمبردار اور میرے ننھیال آپس میں رشتے دار بھی تھے۔ شاید چند پشت پہلے ہی میرا ننھیال مسلمان ہوا ہوگا، حقیقت تو معلوم نہیں لیکن لگتا کچھ ایسے ہی ہے۔

نمبردار کے بیٹے کا نام شیر سنگھ تھا اور وہ چھ فٹ قد کا ایک گبرو جوان تھا۔ ایک بات نہایت ہی دلچسپ تھی۔۔۔ وہ کچھ یوں تھی کہ میرے بیٹے آصف کی آنکھوں کا رنگ سبزی مائل ہے۔ اور شیر سنگھ کی آنکھوں کا رنگ بھی آصف سے ملتا جلتا تھا۔ جو اس بات کی نشانی تھی کہ میرے ننھیال اور شیر سنگھ کا خاندان ایک ہی لڑی (نسل) سے ہے۔

میں نے کئی الفاظ جوڑ جاڑ کر شیر سنگھ کا شکریہ ادا کیا۔۔۔ کہ اس کے دادا نے میرے نانا کو پناہ دی تھی۔۔۔ اس نے ہمیں کھانے کے لیے کہا جس پر ہم نے معذرت کی۔۔۔ کچھ تصاویر لیں۔۔۔ اور بس

رنگ تو مل گئے لیکن جب عقائد مختلف ہوئے تو پھر سب رشتے بھی ختم ہو گئے۔۔۔ اس گاؤں میں وہ سب میرے ننھیال کے ساتھ ہی کیوں ہوا۔۔۔ بھرائی خاندان بھی تو مسلمان تھا۔۔۔ اس کے ساتھ ایسا کیوں نہ ہوا۔۔۔

یہ ایک ایسا سوال تھا جو میں کسی ایسے مسلمان گھرانے سے کرنا چاہتا تھا جس نے موقع ہونے کے باوجود پاکستان ہجرت نہ کی ہو۔ بھرائی خاندان کی ایک بوڑھی عورت نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ اس نے نا صرف میری میزبانی کی بلکہ بہت کچھ بتایا بھی۔ اس کی گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

اتنا جی نے بتایا کہ ہم غریب لوگ تھے اور اب بھی غریب ہی ہیں۔ ہماری کوئی زمین وغیرہ بھی نہیں۔ جب اجاڑے پڑے (ہمارے) نزرگ اسے ہجرت نہیں بلکہ اجاڑے کہتے تھے) تو ہمیں بھی ڈر محسوس ہوا۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے لوگ میرے سر کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ آپ کو گاؤں چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے بڑوں نے کئی خدشات کا اظہار کیا۔۔۔ جس پر نمبردار نے کہا کہ دیکھو۔۔۔ آپ کی یہاں بھی کوئی زمین اور جائیداد نہیں ہے۔ حتیٰ کہ یہ گھر بھی آپ کے نہیں ہیں۔ آپ پاکستان جا کر کیا کریں گے؟ آپ صدیوں سے اس گاؤں میں رہ رہے۔ ہم سب دکھ سکھ کے سانجھی ہیں، آپ ہمارے گاؤں کے چرواہے ہیں اور ساتھ ہی گاؤں کے چوکیدار بھی۔۔۔ آپ کو پاکستان جا کر بھی اسی طرح کی کوئی محنت مزدوری کرنا ہو گی۔۔۔ آپ نہ جائیں۔۔۔ اس طرح ہم نے اسی گاؤں میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارا فیصلہ درست تھا۔

میں نے ایک اور سوال پوچھا جو سکھوں کے رویے سے متعلق تھا۔ جس پر انھوں نے کہا کہ ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ حالانکہ اس گاؤں میں صرف ہم ہی مسلمان ہیں۔ ہماری چھوٹی سی مسجد بھی ہے اور ہمارے بچے بھی سرکاری سکول میں پڑھتے ہیں۔ ہمارے پاس سرکاری نوکری بھی ہے۔۔۔ یہ میرا گاؤں ہے، میں اس گاؤں کی ایک بڑی بوڑھی عورت ہوں، سب ہی مجھے اماں کہہ کر بلاتے ہیں۔ ہماری جوان بیٹیاں ہیں لیکن پھر بھی ہمیں کوئی خوف نہیں ہے۔

میں نے ایک سوال پوچھا کہ کیا آپ کو کبھی یہ خیال آیا کہ کاش آپ بھی پاکستان چلے جاتے۔۔۔ اس پر وہ خاموش ہو گئیں اور ساتھ کھڑی ہوئی اس کی بہو کے چہرے پر مجھے ایک یاس کا منظر دیکھنے کو ملا۔ جسے میں اب تک بھلا نہ پایا۔۔۔ وہ خوش تو ہیں، محفوظ بھی ہیں۔۔۔ لیکن ان کا شمار اب بھی اقلیت میں ہوتا تھا۔۔۔ اجاڑوں

سے پہلے وہ گاؤں میں برابری کی حیثیت رکھتے تھے۔۔۔ جو شاید اب نہیں ہے۔۔۔ ان کی  
اداسی کا ہی سبب ہو سکتا ہے۔



In My mother village with the Sardar Sher Singh, grandson of sardar of of the Village, who was relative of my mother, Sardar Sian Singh is sitting there along with Bharai Muslim Family

ابھی ہم ان کے پاس ہی بیٹھے تھے کہ قریب ہی سکول سے بچوں کو چھٹی ہوئی۔  
میں نے دیکھا کہ بچوں کے سرکاری سکولوں کی وردی کی بجائے پرائیویٹ سکولوں جیسی  
وردی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا کوئی پرائیویٹ سکول ہے؟ انھوں نے بتایا کہ  
نہیں یہ ایک سرکاری پرائمری سکول ہے۔ میں نے پوچھا کہ وردی سرکاری سکولوں سے  
کیسے مختلف ہے؟ جواب دلچسپ اور فکر انگیز تھا۔

بھرائی خاندان کی بہو، جو ہم سے بات کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہی تھی جو  
اسے اس کی ساس کی وجہ سے نہیں مل پارہا تھا، نے کہا کہ ہمارے گاؤں میں ایک استاد  
آئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرکاری سکولوں میں پڑھنے والے بچے احساس کمتری کا  
شکار ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پرائیویٹ سکولوں میں امیر لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔  
استاد صاحب نے بچوں کا یہ احساس دور کرنے کے لیے سرکار سے ان کی وردی پرائیویٹ

سکولوں جیسی منظور کروالی ہے۔ اس سے کچھ فائدہ بھی ہوا؟ میرا سوال تھا۔۔۔ جواب ہاں میں تھا۔

اب دوپہر بھی ہو رہی تھی۔۔۔ ہمیں دہلی بھی پہنچنا تھا۔ اگلے دن ہماری واپسی بھی تھی۔۔۔

ماں کے گاؤں کو جی بھر کے دیکھا۔۔۔ ان گلیوں کو دیکھا جہاں انھوں نے اور ان کے ماں باپ نے سکھ بن کر اور سکھوں جیسے نام رکھ کر ایک سکھ سردار کی پناہ میں کئی دن گزارے تھے۔

میں نے اپنی ماں سے کئی بار پوچھا کہ آپ کا نام کیا رکھا گیا تھا؟ انھوں نے نہیں بتایا۔

شاید وہ اپنا نام بتا کر اس دکھ کو تازہ نہیں کرنا چاہتی تھیں!

## نھال ایک سکھ سردار کی پناہ میں

جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ میری والدہ نے مجھے اپنا سکھوں والا نام بتانے سے انکار کیا تھا۔

میری والدہ کے چچا زاد بھائی رحم دین، اجاڑوں کے وقت جن کی عمر دس سال کے قریب تھی، میں نے ان سے ہجرت کے سفر کی داستان سنانے کی فرمائش کی۔ جو کچھ انھوں نے بتایا وہ کچھ یوں ہے۔

میرے ماموں دین محمد اپنے بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ وہ چار بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور طاقتور تھے۔ اسی وجہ سے جنگ عظیم دوم کے لیے جب انگریزوں نے زبردستی لوگوں کو فوج



میں بھرتی کرنا شروع کیا تو ان کی جوانی اور توانا جسم انگریزوں کو پسند آیا انہوں نے انہیں اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ ان کی شادی بھی ہو چکی تھی اور وہ ایک بیٹی کے والد بھی تھے۔

جب ہنگامے عروج پر تھے، وہ ان دنوں چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے والد اور والدہ یعنی میرے نانا اور نانی سے کہا وہ اپنی بہن سے ملنے جانا چاہ رہے ہیں، جو قریب ہی ایک گاؤں میں رہتی تھیں۔

میرے نانا اور نانی نے انہیں منع کیا کہ ہنگامے ہو رہے ہیں، قتل و غارت بھی عام ہے، کوئی نقصان ہو سکتا ہے، آپ نہ جائیں۔ اس موقع پر انہوں نے ایک فقرہ کہا کہ جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا لیکن ماموں رحم دین کو یہ مکمل طور پر یاد تھا۔

دین محمد نے کہا کہ دس میل تک تو مجھے گھوڑی بھی نہیں پکڑ سکتی یہ سکھ مجھے کیا پکڑیں گے۔

ان دنوں لوگ سفر کرتے ہوئے ہاتھ میں ایک ڈانگ جس کے ایک سرے پر بر جھی لگی ہوتی تھی رکھتے تھے۔ ایسا دشمن کے ساتھ ساتھ جانوروں سے بچاؤ کے لیے بھی ضروری ہوتا تھا۔

وہ گاؤں سے نکلے اور کچھ دور ہی گئے تھے کہ کچھ فساد یوں کو ان کا پتہ چل گیا اور انہوں نے انہیں جا پکڑا۔ میرے ماموں ان سے بچنے کے لئے گنے کے ایک کھیت میں چھپ گئے۔ مارنے والے تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ آخر کار انہوں نے پکڑ لیا اور انتہائی بے دردی کے ساتھ بر جھیوں کے وار کر کے قتل کر دیا۔

ماموں رحم دین کے بقول ان کے جسم پر 18 بر جھیوں کے زخم تھے۔ اس کے بعد ان کی لاش کو گاؤں لایا گیا۔ اب خاندان پر دہری مصیبت آگئی ایک جوان شہید ہو گیا، بوڑھے ماں باپ چھوٹے بچے خواتین سب خوف میں مبتلا ہو گئے۔

ایسے میں گاؤں کا سکھ سردار نمبر دار سامنے آیا اور اس نے اپنے خاندان اور گاؤں کے دیگر لوگوں کی مدد سے میرے ننھال کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور کہا کہ کوئی ہماری لاشوں سے گزر کر ہی آپ تک پہنچے گا۔ البتہ۔ انھوں نے اتنا ضرور کہا کہ کچھ دنوں کے لیے آپ سکھ بننے کا اعلان کر دیں۔

اپنے نام سکھوں والے رکھ لیں تاکہ اگر کوئی ہمیں پوچھے تو کہہ سکیں گے یہ لوگ سے سکھ دھرم میں آگئے ہیں، اس طرح ہمیں آپ کی حفاظت کرنے میں سہولت ہوگی۔

ماموں رحم دین کے بقول یہ عرصہ ایک سال سے زائد کا تھا۔ ماموں رحم دین نے بتایا کہ میں نے بھی سر پر بالوں کو اکٹھا کر کے باندھ لیا تھا۔ باقی لوگ بھی ایسا ہی کچھ کر رہے تھے۔ اس دوران تین مرتبہ ہوا فساد ی لوگوں نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ سردار اور اس کے خاندان نے ہماری حفاظت کی خاطر ان کے ساتھ لڑائی کی اور ہمیں کسی بھی طرح کے نقصان سے بچایا۔

ایک سال کے بعد کافی امن ہو گیا تھا۔ میرے نانا نے ان سے کہا کہ اب ہم جانا چاہ رہے ہیں۔

جس پر انھوں نے کہا کہ آپ نہ جائیں، آپ صدیوں سے اس گاؤں میں رہ رہے ہیں، ہماری آپس میں رشتہ داری بھی ہے، آپ کی زمین بھی ہے، ہم آپ کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لیتے ہیں۔ اس پر میرے نانا کا کہنا تھا کہ ہمارے بہت سے رشتہ دار جا چکے ہیں اس لئے ہم بھی جانا چاہتے ہیں۔

پھر ایک دن سردار کئی بیل گاڑیوں میں خاندان کو بٹھا کر، گاؤں کے جوانوں پر مشتمل ایک جتے کو ساتھ لیکر پچاس کلومیٹر دور انبالہ مہاجر کیمپ چھوڑنے چلا گیا۔

کیا منظر ہو گا جب صدیوں ساتھ رہنے والے سدا کے لیے نچھڑ رہے تھے۔  
جانے والے کیوں جا رہے تھے۔ سوائے خوف کے کوئی اور وجہ نہ تھی، جو ہر طرف، مشرق  
اور مغرب دونوں طرف، پھیلا دیا گیا تھا، یہی خوف لوگوں کو ہجرت اور نقل مکانی پر  
مجبور کر گیا۔

میرے نخال کے گھر کے ساتھ دو سکھ بھائی رہتے تھے ایک کا جیمیل تھا  
اور دوسرے کا نام بدھو تھا۔

دونوں کی اولاد نہیں تھی لیکن زمین کافی تھی، انھوں نے بھی میرے نانا سے  
کہا کہ آپ نہ جائیں، آپ ہمارے رشتہ دار ہیں، ہماری زمین بھی آپ کو مل جائے گی۔  
لیکن میرے نانا نے یہ بات نہ مانی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ اپنے ایک  
بچے کو ہمارے پاس چھوڑ جائیں، وہ ہماری اس زمین کا وارث ہو گا۔ اس پر بھی یہ لوگ  
راضی نہ ہوئے۔

میرے نخال کا ایک سکھ ملازم بھی تھا، سب لوگوں نے سونا وغیرہ اس کے  
حوالے کیا اور کہا کہ اگر ہم واپس آگئے آپ سے لے لیں گے نہ آئے تو یہ آپ کا۔  
جہاں صدیوں کا رہن سہن، تمدن، مان، عزت و آبرو چلی جائے، وہاں سونے  
کی کیا وقعت ہو گی!

انبالا میں کی ایک عرصہ رہنے کے بعد یہ خاندان ایک ریل گاڑی میں بیٹھ کر  
لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں پھر ایک حادثہ ہوا۔ میری والدہ کے چچا ریل گاڑی میں  
بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی چیز سے ٹکرا کر ان کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔

اس طرح خاندان کو دوبارہ وہاں پر رکنا پڑا۔ ہسپتال بھی موجود تھے علاج بھی ہوا، وہ لیکن فوت ہو گئے۔ میرے نانا کے لیے دوسری مصیبت ہو گئی، جوان بیٹا شہید ہوا، ایک بھائی فوت ہو گیا، خاندان، خواتین بچے سب کی ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ باہمت لوگ تھے، وہ روتے پیٹتے لاہور میں آ گئے۔

جب لاہور آئے تو پتہ چلا کہ ان کی بہن بھیرہ کے قریب ایک دور دراز گاؤں میں ہے۔ وہ اپنے بچوں کو لے کر ان کے پاس دھوپ سڑی گاؤں آ گئے۔ اس دوران انھیں پتہ چلا کہ ایک قریبی گاؤں جس کا نام گر منگھ سنگھ والا تھا میں مہاجروں کو آباد کیا جا رہا ہے۔ اس طرح میرا ننھال موجودہ گاؤں میں آ گیا۔ اسے بسے والا بھی کہتے تھے کیونکہ یہاں پر ایک ٹیوب ویل لگا ہوا تھا۔ اب اس کا نام الہ آباد ہے اور یہ ملکوال سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس طرح انھوں نے خالی ہاتھ پاکستان آ کر نئے سرے سے زندگی آغاز کیا۔

زمین الاٹ ہونے میں کافی وقت لگا۔ اس دوران یہ لوگ جنگل سے درخت کاٹ کر پندرہ کلومیٹر دور ملکوال جا کر بھیجتے تھے۔ اس طرح روٹی روزی کا بندوبست کیا گیا۔ میری نانی مقامی ذمہ داروں کے گھروں میں کام کرنے جاتی تھی اور شام کو بچوں کے لیے روٹی لے آتی تھی۔

یہ کہنے کو تو بہت آسان سی بات ہے کہ ایک خوشحال خاندان جو چند ماہ قبل تک ایک نہایت ہی آسودہ زندگی گزار رہا ہوں، زمین داری بھی ہو، معاشرے میں عزت بھی ہو، معاشرتی مقام بھی ہو اور پھر چند ماہ بعد اپنے سر پر ایک من لکڑیاں اٹھا کر 15 کلومیٹر کا سفر کریں تب جا کر شام کو روٹی ملے۔

گھر کی سربراہ خاتون جس کے گھر ملازم تھے وہ خود ملازم بن جائے، ایسا ہی ہوا، جو سب ناقابلِ بیان ہے۔

جس گاؤں میں آکر میرا ننھال آباد ہوا، وہ ایک گرمگھ سنگھ کی ملکیت تھا، وہ اٹھائیس مربع زمین کا اکیلا مالک تھا۔ ایک بڑا گھر تھا، بے شمار لوگ اس کے ملازم یا مزارع تھے، وہ بھی خالی ہاتھ اس گاؤں سے چلا گیا۔ اس کے گھر میں ماموں رحم دین اپنی بیوہ ماں اور دو بہنوں کے رہنے لگا۔

ماموں رحم دین نے مجھے بتایا کہ اس گھر میں ایک صندوق میں بہت ساری کتابیں تھیں، انھیں بھی کتابوں سے دلچسپی تھی اس لیے وہ اس صندوق میں کتابیں نکال کر پڑھتے رہتے تھے۔ وہ صندوق اب بھی ان کے پاس ہے۔

میں نے ماموں رحم دین نے پوچھا کہ آپ لوگ کب مسلمان ہوئے؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ بزرگ یہ بتاتے ہیں کہ کوئی سات پشت قبل ان کے خاندان کا ایک لڑکا راجستان سے آئے لوگوں، جو کے مسلمان تھے کے ساتھ چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو وہ مسلمان تھا اس طرح ہمارا خاندان مسلمان ہو گیا۔

مکان وہیں رہے مکین بدل گئے!

میری ننھال کے گھروں میں مغربی پنجاب جانے والے سے سکھ اور ہندو آباد

ہیں!

اور گرمگھ سنگھ والا میں مشرقی پنجاب سے آنے والے مسلمان آباد ہیں!

جنہوں نے یہ گھر بنائے ان کے ان میں رہنا نصیب نہ ہوا!

اور وہ کسی دوسرے کے بنائے ہوئے گھر میں رہنے پر مجبور ہوئے!

ایسا کیوں ہوا؟

کیسے ہوا؟

کوئی تو اس کا جواب دے!

اجازوں کے پانچ سال بعد میری والدہ عمری بی بی کی شادی پٹیا لہ ہی کے ایک جاٹ چودھری محمد یوسف مانگٹ سے ہوئی۔ جو نام کی طرح حسین، گبرو، دلیر، خیر خواہ، محنتی اور دیانت دار بھی تھا۔۔۔ شادی کے بعد ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام طمان رکھا گیا جو دو سال کی عمر میں ہی اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو گیا۔۔۔ اور پھر 1958ء میں ان کا دوسرا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام محمد مشتاق احمد رکھا گیا۔۔۔ اس کے بعد ان کو اللہ نے ایک بیٹی اور تین بیٹے اور بھی عطا کیے۔ بیٹی پندرہ سال کی عمر میں فوت ہو گئی۔ والد صاحب 1998ء میں اور والدہ 2008ء میں جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔۔۔ والدین کے پہلے بیٹے کی یاد میں میرے بیٹے آصف نے اپنے پہلے بیٹے کا نام بھی طمان یوسف مانگٹ رکھا۔۔۔

ہم دہلی واپس پہنچے۔۔۔ پر میندر مانگٹ اور رنبیر مانگٹ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ساجد صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے شام دہلی کی مین مارکیٹ میں گزاری اور دوسرے دن واپس لاہور کی راہ لی۔

پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ہمارا سفر خیر و عافیت سے ہوا۔ اس سفر میں پونے، ممبئی، ہریانہ اور پنجاب کے علاوہ اپنے والدین کے گھر بھی دیکھے۔ اس کے بعد اب تک دوبارہ جانے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن خواہش ضرور موجود ہے۔۔۔

کب دونوں طرف کے اہل اقتدار۔۔۔ صلح کی طرف مائل ہوں گے۔۔۔ پھر ہی یہ ممکن ہوگا۔



Mamo Raham Din



Wooden Box left by Gurmangh Singh Family



تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال نے کئی خاندانوں کو اُنکے آبائی علاقوں سے ہجرت پر مجبور کر دیا اور اُنھی بد قسمت لوگوں میں ایک میرا خاندان بھی شامل تھا جو موجودہ بھارت کی ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند سے ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ سکونت پذیر ہوئے۔ میری پیدائش 15 مارچ 1958ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوئی۔ میں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور فیصل آباد میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے Textile کے شعبے کا انتخاب کیا اور 1981ء میں نیشنل کالج سے Textile Engineering کی ڈگری مکمل کی۔ اپنی مہارت کو مزید تقویت دینے کیلئے میں نے مختلف ملازمتوں سے تجربہ حاصل کیا اور 1992ء کے بعد سے اپنے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔ مسلسل سیکھنے کے اصول پر کارفرما رہتے ہوئے میں نے اپنے انتہائی مصروف اوقات میں سے وقت نکال کر 2001ء میں University of Management Technology سے MBA میں گولڈ میڈل بھی حاصل کر لیا۔

علم کا اشتیاق بڑھتا تو 2008ء میں The University of Manchester سے MPhil اور 2012ء میں Czech Republic کی معروف یونیورسٹی سے Textile میں PhD بھی کر لی۔ کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ میں کئی فلاحی اداروں (غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ، الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان اور تعاون فاؤنڈیشن) سے بھی منسلک رہا اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔

اس کتاب کا مواد کئی مستند تاریخی حوالوں سے حاصل کیا گیا ہے اور حتمی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ اُنھی حالات و واقعات کو بیان کیا جائے جن پر اجماع کثیر ہو لیکن پھر بھی اگر کسی تاریخ یا واقعے میں کوئی تضاد پایا جائے تو ہر حال میں اسکی اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔

ISBN 978-996-9522-54-1



اس کتاب سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کی جائے گی۔ انشاء اللہ

9789969522541 >